MAIS312CCT

عہد عثمانی اور چھوٹی خاندانی حکومتیں

(The Ottomans and the Petty Dynasties)

ایم۔اے۔(اسلامک اسٹڈیز)

(تیسرا سمسٹر)

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد-32، تلنگانہ-بھارت

© Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad

Course: The Ottomans and the Petty Dynasties
ISBN: 978-93-95203-x-x
First Edition: June, 2024

Publisher	:	Registrar, Maulana Azad National Urdu University
Publication	:	2024
Copies	:	800
Price	:	228/-(The price of the book is included in admission fees of distance mode students)
Copy Editing	:	Dr. Mohammad Haziq, DDE, MANUU, Hyderabad
Cover Designing	:	Dr. Mohd Akmal Khan, DDE, MANUU, Hyderabad
Printer	:	Print Time & Business Enterprises, Hyderabad

Masters in Islamic Studies
The Ottomans and the Petty Dynasties
3rd Semester

On behalf of the Registrar, Published by:
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad-500032 (TS), India
*Director:*dir.dde@manuu.edu.in*Publication:*ddepublication@manuu.edu.in
Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

© *All right reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing form the publisher (registrar@manuu.edu.in)*

Editors

ایڈیٹرس

Prof. Syed Alim Ashraf
Head Dept. of Arabic, MANUU, Hyderabad

پروفیسر سید علیم اشرف
صدر شعبہ عربی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Language Editors

لینگوتج ایڈیٹرس

Dr. Mohammad Haziq
Assistant Professor (Contractual)/ Guest Faculty, Islamic Studies, DDE, MANUU

Dr. Mohd. Akmal Khan
Assistant Professor (Contractual)/ Guest Faculty, Urdu, DDE, MANUU

ڈاکٹر محمد حاذق
اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی، اسلامک اسٹڈیز، ڈی ڈی ای، مانو

ڈاکٹر محمد اکمل خان
اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی، اردو، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو

Editorial Board	مجلس ادارت
Prof. Abdul Ali *Former Head, Dept. of Islamic Studies, AMU, Aligarh*	پروفیسر عبدالعلی سابق صدر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
Prof. S. M. Azizuddin Husain *Former Head, Dept. of History & Culture JMI, New Delhi*	پروفیسر ایس۔ ایم۔ عزیزالدین حسین سابق صدر، شعبہ تاریخ و ثقافت، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
Prof. Mohammad Ishaque *Prof. of Islamic Studies, JMI, New Delhi*	پروفیسر محمد اسحاق پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
Prof. Mohd. Fahim Akhter *Dept. of Islamic Studies, MANUU*	پروفیسر محمد فہیم اختر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
Prof. Ghazanfar Ali Khan *Prof., of Islamic Studies, Kashmir Campus, MANUU*	پروفیسر غضنفر علی خان پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، کشمیر کیمپس، مانو
Dr. Abdul Majeed Qadeer Khwaja *Asst. Prof., Islamic Studies, DDE, MANUU*	ڈاکٹر عبدالمجید قدیر خواجہ اسسٹنٹ پروفیسر، اسلامک اسٹڈیز، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو
Dr. Mohammad Haziq *Assistant Professor (Contractual)/ Guest Faculty, Islamic Studies, DDE, MANUU*	ڈاکٹر محمد حاذق اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی، اسلامک اسٹڈیز، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو
Dr. Syyeda Amina *Assistant Professor (Contractual)/ Guest Faculty, Islamic Studies, DDE, MANUU*	ڈاکٹر سیدہ آمنہ اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی، اسلامک اسٹڈیز، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو

کورس کو آرڈی نیٹر

پروفیسر سید علیم اشرف

صدر شعبہ عربی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مصنفین	اکائی نمبر
ڈاکٹر محمد ارشد، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی	1،4،5،8
ڈاکٹر محمد حاذق، اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	2،3
ڈاکٹر عاطف عمران، گسیٹ فیکلٹی، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	6
ڈاکٹر محمد عمر، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی	7
ڈاکٹر محمد انظر ندوی۔	9،13
ڈاکٹر صلاح الدین، حیدرآباد	10
ڈاکٹر محمد خالد، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی	11
ڈاکٹر نجم السحر، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی	12
ڈاکٹر مشتاق تجاروی، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی	14،15،16

نوٹ: زیر نظر کتاب علمی مواد (Study Material) مختلف مصنفین نے لکھا ہے اور اس سے کو آرڈی نیٹر و ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

پروف ریڈرس:

اول : ڈاکٹر محمد حاذق

دوم : ڈاکٹر سیدہ آمنہ

فہرست

پیغام	وائس چانسلر	7
پیغام	ڈائرکٹر	8
کورس کا تعارف	کورس کو آرڈی نیٹر	9

بلاک 1 : عثمانی دور-1

اکائی 1	عثمانی حکومت کا قیام و استحکام	11
اکائی 2	عثمانی حکومت کے اہم حکمراں (حصہ اول)	30
اکائی 3	عثمانی حکومت کے اہم حکمراں (حصہ دوم)	43
اکائی 4	عثمانی حکومت کا نظم و نسق	56

بلاک 2 : عثمانی دور-2

اکائی 5	عثمانی دور میں سماجی و معاشی حالات	78
اکائی 6	عثمانی دور میں علوم کی ترقی	96
اکائی 7	عثمانی دور میں فن تعمیر	112
اکائی 8	عثمانی حکومت کا زوال	130

بلاک 3 : سلجوقی حکومت، غزنوی حکومت

اکائی 9	سلجوقی حکومت کا قیام و استحکام	151
اکائی 10	سلجوقی دور میں علمی خدمات	164
اکائی 11	غزنوی حکومت کا قیام و استحکام	180

اکائی12	غزنوی دور میں فتوحات اور علمی خدمات	192

بلاک 4 : غوری حکومت، صفوی حکومت

اکائی13	غوری حکومت کا اجمالی خاکہ	204
اکائی14	صفوی حکومت کا قیام واستحکام	215
اکائی15	صفوی حکومت میں تمدنی اور مذہبی حالات	231
اکائی16	صفوی حکومت میں فنون لطیفہ اور فن تعمیر	247
	نمونہ امتحانی پرچہ	260

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی 1998 میں وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت قائم کی گئی۔ اس کے چار نکاتی مینڈیٹس یہ ہیں۔ (1) اردو زبان کی ترویج و ترقی (2) اردو میڈیم میں پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کی فراہمی (3) روایتی اور فاصلاتی تدریس سے تعلیم کی فراہمی اور (4) تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ۔ یہ وہ بنیادی نکات ہیں جو اِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرد اور ممتاز بناتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری اور علاقائی زبانوں میں تعلیم کی فراہمی پر کافی زور دیا گیا ہے۔

اُردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کا واحد مقصد و منشا اُردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ ایک طویل عرصے سے اُردو کا دامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی رہا ہے۔ کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ اس بات کی تصدیق کر دیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند ''ادبی'' اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔ یہی کیفیت اکثر رسائل و اخبارات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اُردو قاری اور اُردو سماج دورِ حاضر کے اہم ترین علمی موضوعات سے نابلد ہیں۔ چاہے یہ خود ان کی صحت و بقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے، یا مشینی آلات ہوں یا ان کے گرد و پیش ماحول کے مسائل ہوں، عوامی سطح پر اِن شعبہ جات سے متعلق اردو میں مواد کی عدم دستیابی نے عصری علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کر دی ہے۔ یہی وہ چیلنجز ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔ نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ اِسکولی سطح پر اُردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیر بحث آتے ہیں۔ چوں کہ اُردو یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے اور اس میں عصری علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اِس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

مجھے اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ یونیورسٹی کے ذمہ داران بشمول اساتذہ کرام کی انتھک محنت اور ماہرین علم کے بھرپور تعاون کی بنا پر کتب کی اشاعت کا سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع ہو چکا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ ہماری یونیورسٹی اپنی تاسیس کی 25 ویں سالگرہ منا رہی ہے، مجھے اس بات کا انکشاف کرتے ہوئے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ یونیورسٹی کا نظامتِ فاصلاتی تعلیم از سرِ نو اپنی کارکردگی کے نئے سنگِ میل کی طرف رواں دواں ہے اور نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی جانب سے کتابوں کی اشاعت اور ترویج میں بھی تیزی پیدا ہوئی ہے۔ نیز ملک کے کونے کونے میں موجود تشنگانِ علم فاصلاتی تعلیم کے مختلف پروگراموں سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ گرچہ گزشتہ دو برسوں کے دوران کووڈ کی تباہ کن صورتِ حال کے باعث انتظامی امور اور ترسیل و ابلاغ کے مراحل بھی کافی دشوار کن رہے تاہم یونیورسٹی نے اپنی حتی المقدور کوششوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے پروگراموں کو کامیابی کے ساتھ روبہ عمل کیا ہے۔ میں یونیورسٹی سے وابستہ تمام طلبا کو یونیورسٹی سے جڑنے کے لیے صمیم قلب کے ساتھ مبارک باد پیش کرتے ہوئے اس یقین کا اظہار کرتا ہوں کہ ان کی علمی تشنگی کو پورا کرنے کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا تعلیمی مشن ہر لحہ ان کے لیے راستے ہموار کرے گا۔

پروفیسر سید عین الحسن

وائس چانسلر

پیغام

موجودہ دور میں فاصلاتی طریقۂ تعلیم کو پوری دنیا میں ایک انتہائی کارگر اور مفید طریقۂ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جاچکا ہے اور اس طریقۂ تعلیم سے بڑی تعداد میں لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اردو آبادی کی تعلیمی ضروریات کے پیش نظر فاصلاتی طرز تعلیم کو متعارف کرایا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا آغاز 1998 میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم سے ہوا اور 2004 میں باقاعدہ روایتی طرز تعلیم (Regular Courses) کا آغاز ہوا اور بعد ازاں متعدد روایتی تدریس کے شعبہ جات قائم کیے گئے۔

ملک میں تعلیمی نظام کو بہتر انداز سے جاری رکھنے میں یو جی سی کا مرکزی کردار رہا ہے۔ فاصلاتی تعلیم (ODL) کے تحت جاری مختلف پروگرام UGC-DEB سے منظور شدہ ہیں۔ UGC-DEB اس بات پر زور دیتا رہا ہے کہ فاصلاتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات کو روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات سے کماحقہ ہم آہنگ کر کے فاصلاتی تعلیم کے طلبا کے معیار کو بلند کیا جائے۔ چوں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی فاصلاتی اور روایتی طرزِ تعلیم کی جامعہ (Dual Mode University) ہے، لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے یو جی سی۔ڈی ای بی کے رہنمایانہ اصولوں کے مطابق Credit Based Credit System (CBCS) نظام متعارف کرایا گیا اور خود اکتسابی مواد (Self Learning Material) از سرِ نو، جس میں یو جی اور پی جی طلبا کے لیے چھ بلاک چوبیس اکائیوں اور چار بلاک سولہ اکائیوں پر مشتمل نئے طرز کی ساخت پر تیار کیا گیا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورسز پر مشتمل جملہ سترہ (17) کورسز چلا رہا ہے۔ ساتھ ہی تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز بھی شروع کیے جا رہے ہیں۔ متعلمین کی سہولت کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں 9 علاقائی مراکز بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر اور 6 ذیلی علاقائی مراکز حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح، وارانسی اور امراوتی کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک موجود ہے۔ اس کے علاوہ وجے واڑہ میں ایک ایکسٹنشن سنٹر بھی قائم کیا گیا ہے۔ ان مراکز کے تحت سرِ دست 160 سے زیادہ متعلم امدادی مراکز (Learner Support Centres) نیز 20 پروگرام سنٹرس (Programme Centres) کام کر رہے ہیں، جو طلبا کو تعلیمی اور انتظامی مدد فراہم کرتے ہیں۔ نظامت فاصلاتی تعلیم اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا بھرپور استعمال کرتا ہے، نیز اپنے تمام پروگراموں میں داخلے صرف آن لائن طریقے ہی سے دے رہا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی ویب سائٹ پر متعلمین کو خود اکتسابی مواد کی سافٹ کاپیاں بھی فراہم کی جارہی ہیں، نیز آڈیو۔ ویڈیو ریکارڈنگ کا لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ متعلمین کے درمیان رابطے کے لیے ای میل اور وہاٹس ایپ گروپ کی سہولت فراہم کی گئی ہے، جس کے ذریعے متعلمین کو پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس کے رجسٹریشن، مفوضات، کونسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔ پچھلے دو سال سے ریگولر کاؤنسلنگ کے علاوہ ایڈیشنل ریمیڈیل آن لائن کاؤنسلنگ مہیا کی جارہی ہے تاکہ طلبا کے تعلیمی معیار کو بلند کیا جاسکے۔

امید ہے کہ ملک کی تعلیمی اور معاشی حیثیت سے پچھڑی اردو آبادی کو عصری تعلیم کے مرکزی دھارے سے جوڑنے میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم کا بھی نمایاں رول ہوگا۔ آنے والے دنوں میں تعلیمی ضروریات کے پیش نظر نئی تعلیمی پالیسی (NEP-2020) کے تحت مختلف کورسز میں تبدیلیاں کی جائیں گی اور امید ہے کہ یہ فاصلاتی نظام کو زیادہ مؤثر و کارگر بنانے میں مددگار ثابت ہوگی۔

پروفیسر محمد رضا اللہ خان
ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم

کورس کا تعارف

نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے لیے یہ بات انتہائی باعث مسرت ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو جی سی)، ڈسٹنس ایجوکیشن بیورو (ڈی ای بی) کے 2017 ضابطوں اور دوسرے ترمیمی ضوابط 2018 کے مطابق اسلامک اسٹڈیز کے موضوع پر اردو زبان میں درسی مواد تیار کیا گیا ہے۔ یو جی سی ہدایت کے تحت یونیورسٹی کے روایتی اور فاصلاتی نظام تعلیم کے لیے ایک ہی نصاب لازمی قرار دیا گیا ہے؛ تاکہ نہ صرف ان دونوں نظام تعلیم کے طلبہ کا معیار یکساں ہو، بلکہ حصول تعلیم کے لیے فراہم کی جانے والی مختلف سہولیات کے اس دور میں ایک نظام تعلیم کے طلبہ کے لیے دوسرے نظام تعلیم کی طرف منتقلی بھی قابل عمل ہو۔

ان ضوابط کے تحت یونیورسٹی میں فراہم کیے جارہے تمام مضامین میں روایتی اور فاصلاتی نظام تعلیم کا ایک ہی نصاب تیار کیا گیا، اور اس کے مطابق درسی مواد کی تیاری کی گئی جو بیک وقت دونوں نظام تعلیم کے طلبہ وطالبات کے لیے ذریعہ استفادہ بن سکے۔ یہ مواد بی اے کے تین سالہ (چھ سمسٹرز) کورس اور ایم اے کے دو سالہ (چار سمسٹرز) کورس کے لیے تیار کروایا گیا ہے۔ اس درسی مواد کی تیاری میں ملک بھر کے ماہرین اسلامک اسٹڈیز، دانشوران اور اسلامی علوم پر گہری نظر رکھنے والے علما کی معیاری خدمات یونیورسٹی کو حاصل رہیں، اور اس میں اسلامک اسٹڈیز کے تقریباً تمام ہی موضوعات اور پہلوؤں کا جامع احاطہ کیا گیا۔ اس طرح یونیورسٹی کے ذریعے تیار ہونے والا یہ درسی مواد ایک معیاری، ہمہ گیر اور اسلامک اسٹڈیز کے پورے کورس پر محیط بن کر تیار ہوا، جس سے نہ صرف یہ کہ اسلامک اسٹڈیز کے طلبہ وطالبات کی ایک بڑی ضرورت کی تکمیل ہوئی بلکہ اسلامی مطالعات کے میدان میں قابل قدر اضافہ ہوا۔

اس نصاب کی تیاری میں قدیم نصاب کی خوبیوں کو باقی رکھتے ہوئے ضروری حذف واضافہ اور جدید تحریر کے ساتھ مضامین کی ایسی ترتیب اختیار کی گئی جو دونوں روایتی اور فاصلاتی تعلیم کے نظام کی ضرورت بیک وقت پوری کر سکے۔

یکساں نصاب کی تیاری کے بعد اسی کے مطابق درسی مواد کی تیاری بھی مطلوب تھی جس میں نئے نصاب کے مطابق پرانے تحریر شدہ مواد میں کہیں کم اور کہیں زیادہ حذف وترمیم اور تبدیلی کی ضرورت تھی۔ کئی مقامات پر کم یا زیادہ اضافہ بھی مطلوب تھا۔ بعض ذیلی عناوین پر بالکل نئی تحریر لکھنے کی ضرورت تھی اور بعض جگہوں پر مکمل اکائی کے اضافہ کی بھی ضرورت پیش آئی۔ ان سب کے علاوہ مواد کی ترتیب کو نئے نصاب کے مطابق بنایا گیا۔ نیز ہر اکائی کے تحت اکتسابی نتائج اور متنوع قسم کے سوالات کے تفصیلی نمونے شامل کیے گئے۔ ان تبدیلیوں کے بعد تیار ہونے والا مواد قدیم وجدید کا مجموعہ بن کر سامنے آیا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہم ایم اے کے کورس کی یہ کتاب آپ کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ تیسرے سمسٹر کے اس پرچہ کا عنوان "عہد عثمانی اور چھوٹی خاندانی حکومتیں" ہے۔ یہ روایتی تعلیم کے تحت ایم اے سال دوم کے لیے ہے۔ اس پرچہ میں کل سولہ اکائیاں ہیں، جن کو چار بلاک میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان بلاکس میں عثمانی دور، سلجوقی عہد، غزنوی عہد، غوری اور صفوی حکومت کا احاطہ کیا گیا ہے۔ جس میں عثمانی حکومت کا قیام واستحکام، اہم حکمراں، نظم ونسق اور سماجی ومعاشی حالات کے ساتھ زوال کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سلجوقی حکومت کا قیام اور علمی خدمات، غزنوی حکومت کا قیام واستحکام اور ان کی فتوحات وعلمی خدمات، غوری حکومت کا اجمالی خاکہ اور صفوی حکومت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ان سبھی موضوعات سے متعلق مواد شامل ہے۔

پروفیسر سید علیم اشرف

کورس کوآرڈی نیٹر

عہد عثمانی اور چھوٹی خاندانی حکومتیں

The Ottomans and the Petty Dynasties

اکائی 1: عثمانی حکومت کا قیام و استحکام

اکائی کے اجزا:

1.0 تمہید
1.1 مقصد
1.2 ترکوں کی مختصر تاریخ
1.3 ترک اسلام کے سائے میں
1.4 ترک دارالخلافہ بغداد میں
1.5 مسلم دنیا میں ترکوں کا عروج
1.6 عثمانی ترکوں کا تاریخی پس منظر
1.7 عثمانی حکومت کا بانی امیر عثمان خاں
1.8 عثمانی حکومت کا قیام
1.9 عثمانی حکومت کے قیام و استحکام میں اہم رول ادا کرنے والے بعض دیگر حکمراں
1.9.1 سکہ
1.9.2 لباس
1.9.3 فوج
1.9.4 ینی چری (نئی فوج)
1.10 اکتسابی نتائج
1.11 نمونہ امتحانی سوالات
1.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
1.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
1.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.0 تمہید

عثمانی حکومت جو اس خاندان کی حکومت کے بانی امیر عثمان خاں کے نام کی نسبت سے عثمانی حکومت کہلاتی ہے۔ یہ لوگ نسلاً ترک تھے اور خانہ بدوش قبائل کی زندگی گزارتے تھے۔ حالات کے مارے اس قبیلے کے افراد جنہیں وسطی ایشیا میں چنگیز خاں کے حملوں نے بے گھر کر دیا تھا، ایشیائے کوچک، جسے اناطولیہ اور ترکی بھی کہا جاتا ہے، کے مختلف علاقوں میں خانماں برباد پھرتے تھے کہ منگولوں کے ساتھ ایک جنگ میں سلجوقی حکمراں علاء الدین کی وقت پر ان لوگوں نے مدد کی اور اس کے نتیجے میں قبیلے کے سردار ارطغرل (متوفی 1258ء /687ھ) کو سلطان علاء الدین نے خوش ہو کر اور مدد کے صلے میں بازنطینی سلطنت (جو پہلے رومی سلطنت کہلاتی تھی) کی سرحد سے متصل ایک چھوٹی سی جاگیر عطا کر دی جسے بعد میں ارطغرل کے بیٹے عثمان خاں (1288ء687/ھ تا1326ء/726ھ) نے ایک آزاد اور خود مختار ریاست میں تبدیل کر دیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ چھوٹی سی ریاست جس کی بنیاد شاید 1300ء میں پڑی تھی، خاندان کے حوصلہ مند، مہم جو اور اعلی کردار حکمرانوں کی کوششوں سے صرف ڈھائی تین سو برس کے عرصے میں دنیا کی سب سے بڑی اور طاقت ور حکومت بن گئی۔ ایک ایسی سلطنت جو تین براعظموں (یورپ، ایشیا اور افریقہ) پر پھیلی ہوئی تھی اور دنیا کی کوئی بھی حکومت ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ عثمانی حکومت کے قیام و استحکام کے اس دور انیے میں ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب لگا کہ اس خاندان کی حکومت کا سورج غروب ہو جائے گا۔ خاندان کا حکمراں بایزید یلدرم سلطان تیمور کے ہاتھوں ایک جنگ میں گرفتار ہو گیا اور قید میں ہی اس کی موت بھی واقع ہو گئی، لیکن بہت جلد آل عثمان نے خود کو سنبھال لیا اور پھر سے عثمانی حکومت کو مستحکم بنیادیں فراہم کر دیں یہاں تک کہ پائیداری اور استحکام کے لحاظ سے یہ اسلامی تاریخ کی سب سے بڑی حکومت قرار پائی۔ اسلامی تاریخ میں کسی ایک خاندان کی سب سے طویل عرصے تک قائم رہنے والی حکومت کا سہرا ابھی آل عثمان کے ہی سر ہے۔

1.1 مقصد

اس یونٹ کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی کے آخر میں قائم ہونے والی ایک چھوٹی سی جاگیر، ایک مستحکم اور وسیع سلطنت میں کیسے تبدیل ہو گئی۔ اس کا قیام کیسے اور کیوں کر عمل میں آیا ہے۔ جن لوگوں نے یہ وسیع و مستحکم حکومت قائم کی وہ کون لوگ تھے، کس رنگ اور نسل سے ان کا تعلق تھا اور کن حالات نے انہیں یہاں تک پہنچایا۔ عثمانی حکومت جسے سلطنت عثمانیہ، دولت عثمانیہ اور خلافت عثمانیہ جیسے ناموں سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس اکائی میں اس کے قیام کے حالات و اسباب بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی بھی کوشش کی جائے گی کہ آل عثمان کے وہ کون سے حکمراں تھے جنہوں نے اس کے قیام اور استحکام میں اہم اور کلیدی رول ادا کیا۔

1.2 ترکوں کی مختصر تاریخ

ترک (Turk) لفظ جسے چینی زبان میں تو۔کیو (Tu-Kue) اور یونانی زبان میں Touexoi کہا جاتا ہے، اس لفظ کا سب سے پہلے پہل استعمال شاید چھٹی صدی عیسوی میں کیا گیا۔ یہ ایک خانہ بدوش گروہ یا قوم تھی جو مشرقی اور وسطی ایشیا کے علاقوں میں گھومتی پھرتی تھی۔ لفظ ترک کا مفہوم قوت اور طاقت ہے، مشرقی اور وسطی ایشیا کے خانہ بدوش قبائل کو یہ نام شاید اسی لیے دیا گیا کہ یہ لوگ فطری طور پر بہت ہی قوی، شجاع اور بہادر ہوتے تھے اور مختلف اوقات میں اپنی قوت وطاقت کا مظاہرہ بھی کرتے رہتے تھے۔ خاص طور پر مغربی ایشیا اور مشرقی یورپ کے علاقوں پر ان کی لوٹ مار اور تگ و تاز نے ایک طرح کا خوف اور ہیبت طاری کر رکھی تھی۔ جن علاقوں سے بھی ان کا گزر ہو جاتا یا جن آبادیوں میں بھی یہ لوگ داخل ہو جاتے، وہاں کے لوگ ڈر کے مارے اپنے گھروں کو چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔

مستند ذرائع کے مطابق ترک لفظ کا استعمال تاریخ میں شاید پہلی بار وسطی ایشیا کے ان خانہ بدوش قبائل کے لیے استعمال ہوا جنہوں نے چھٹی صدی عیسوی کے نصف اول میں منگولیا اور چین کی شمالی سرحد سے لے کر بحر اسود تک پھیلی ہوئی ایک وسیع اور طاقتور حکومت قائم کی۔ اس بڑی سلطنت کے بانی کا نام چینی مآخذ میں تومین (Tu-men) اور ترکی مصادر میں بومین (Bu-min) لکھا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تومین یا بومین کی قائم کردہ یہ عظیم سلطنت بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم تھی۔ شمالی حصے پر بومین کی حکومت تھی اور مغربی حصے پر اس کا بھائی اِستامی (Istami) حکمران تھا۔ چین والے ان دونوں بھائیوں کی حکومتوں کو شمالی ترکوں کی سلطنت اور مغربی ترکوں کی سلطنت کے الگ الگ ناموں سے یاد کرتے تھے۔ یہ دونوں سلطنتیں الگ، آزاد اور خود مختار تھیں اور اپنے بانیوں کے زمانے کے کچھ ہی دنوں بعد باہمی اختلاف و انتشار کا شکار ہو کر ساتویں صدی عیسوی کے وسط تک یعنی شمالی سلطنت 630ء میں اور مغربی سلطنت 659ء میں چین کے تانگ (Tang) خاندان کی حکومت کے زیر اثر آ گئیں۔ البتہ غیور اور بہادر خانہ بدوش ترکوں نے بہت جلد چینی بالا دستی سے (682ء) آزادی حاصل کر لی اور شمالی حصے میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ "کتبات اور خان" جو منگولیا کے دریائے اور خان کے نام کی طرف منسوب ہیں۔ اور جنہیں ترکی زبان کی قدیم ترین یادگار باور کیا جاتا ہے، ان کا تعلق ترکوں کی اسی شمالی سلطنت سے ہے۔ شمالی سلطنت کے ترکوں نے مغربی سلطنت کے ترکوں کو بھی اپنے زیر اثر لانے کی بار بار کوشش کی لیکن اس میں انہیں زیادہ کامیابی نہیں ملی۔ ترکوں کی مغربی سلطنت میں ترگیش (Turgesh) نامی ترک قبیلے کو نمایاں شہرت ملی۔ اس قبیلے کے سرداروں نے ساتویں صدی عیسوی میں سب سے پہلے خاقان کا لقب اختیار کیا۔ 121ھ مطابق 739عیسوی میں ترگیش قبیلے کی قیادت والی مغربی سلطنت کا خاتمہ عرب فاتح نصر بن سیّار کی قیادت میں ہوا جب کہ شمالی سلطنت 126ھ 744/ء تک قائم رہی۔

1.3 ترک اسلام کے سائے میں

ترکوں اور عربوں کے تعلقات کی کوئی تاریخ ہمیں زمانہ قبل از اسلام میں نہیں ملتی۔ اموی خلیفہ ولید بن عبد الملک کے زمانے میں شاید پہلی بار یہ دونوں قومیں ایک دوسرے کے رابطے میں آئیں جب بنو امیہ کے مشہور سپہ سالار قتیبہ بن مسلم باہلی نے بعض ترک علاقے

مثلاً بخارا، سمرقند، خیوا، فرغانہ، تاشقند اور کاشغر وغیرہ فتح کیے۔ قتیبہ بن مسلم کی فتوحات کے نتیجے میں ان علاقوں میں مسلمانوں کی حکومت تو ضرور قائم ہوئی، لیکن فوری طور پر ہی یہاں کے لوگ اسلام میں داخل ہو گئے ہوں ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ اسلامی حکومت کے قیام کے ایک طویل عرصے کے دوران دھیرے دھیرے کرکے ترک مسلمان ہوئے۔

خطے میں اسلام کی آمد سے پہلے یہاں کی تقریباً تمام تر ترک آبادی بت پرست تھی۔ البتہ پریچنگ آف اسلام کے مصنف ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے اپنی کتاب میں ترکوں کی بت پرستی کا ایک واقعہ لکھا ہے، جس سے یہ معلوم پڑتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد ترکوں میں بت پرستی کے جذبے کو صدمہ پہنچا ہوگا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ترکوں میں بت پرستی عام تھی اور بتوں کے ساتھ ان کا معاملہ بہت زیادہ عقیدت و احترام کا تھا۔ بتوں اور بت خانوں کے بارے میں یقین کی حد تک ان میں یہ خیال پایا جاتا تھا کہ جو بھی ان کی بے ادبی کرے گا وہ ضرور بالضرور ہلاک ہو جائے گا۔ قتیبہ بن مسلم جب اس علاقے میں داخل ہوا تو اس نے جا بجا بت خانے دیکھے جن کے بارے میں اسے بتایا گیا کہ ان کی بے ادبی کرنے والا ہلاک ہو جاتا ہے۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد قتیبہ نے ان بت خانوں میں آگ لگا دی مگر اس کے باوجود اسے کچھ بھی نہیں ہوا۔ قتیبہ بن مسلم کے اس اقدام کا اثر ترکوں پر پڑا۔ بڑی تعداد میں لوگوں نے بت پرستی چھوڑ دی اور ان کی ایک تعداد دائرہ اسلام میں بھی داخل ہو گئی۔

اموی حکومت میں حضرت عمر بن عبد العزیز کی خلافت کا مختصر زمانہ (101ھ 720/ء 99ھ-717ء) اس اعتبار سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ ان کے عہد خلافت میں خلافت راشدہ کی یاد تازہ ہو گئی۔ خاص طور پر انہوں نے اسلامی دنیا کے مفتوحہ اور دیگر علاقوں میں اسلام کی اشاعت پر بہت زیادہ توجہ دی۔ انہوں نے مختلف حکمرانوں کو اس حوالے سے خطوط لکھنے کے علاوہ مسلم دعاۃ کو بھی غیر مسلم علاقوں میں دین کی دعوت دینے کے لیے بھیجا۔ کہا جاتا ہے کہ اس سلسلے میں انہوں نے ماوراء النہر کے ترک بادشاہوں اور سرداروں کو بھی خطوط لکھے جن میں اسلام کی دعوت پیش کی گئی تھی۔ ان میں سے بعض نے اسلام کی دعوت قبول کرلی اور مسلمان ہو گئے۔ اسی طرح حضرت عمر بن عبد العزیز نے مشہور داعی عبد اللہ ابن معمر الیشکری کو بھی اسلام کی دعوت عام لوگوں تک پہنچانے کے لیے ماوراء النہر کے ترک علاقوں میں بھیجا اور ان کی دعوت پر خطے کے بعض قبائل مسلمان ہو گئے۔

البتہ ترکوں میں اسلام کی دعوت اس وقت زیادہ عام ہوئی۔ جب اموی خلیفہ ہشام، کے زمانۂ خلافت (105ھ 742/ء تا 125ھ 743/ء) میں اسلام کے ایک بڑے مبلغ اور داعی ابو صید اماوراء النہر کے علاقے میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے پہنچے اور کہا جاتا ہے کہ ان کی دعوت سے متاثر ہو کر بڑے پیمانے پر ترکوں نے اسلام قبول کیا۔ لیکن اس زمانے کے حالات و واقعات کا مطالعہ و تجزیہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اموی دور بلکہ عباسی خلافت کے زمانہ عروج میں معتصم باللہ کی حکومت (227ھ 842/ء-218ھ 833/ء) کے زمانے تک ترکوں میں اسلام کی اشاعت عام نہیں ہوئی تھی، کیونکہ اس زمانے تک اس علاقے سے جزیہ اور خراج کی رقمیں اسلامی بیت المال میں آتی تھیں۔

1.4 ترک دارالخلافہ بغداد میں

اسلامی دنیا میں ترکوں کی اہمیت کو سمجھنے اور ان کو متعارف کرانے کا سہرا عباسی خلیفہ منصور (158ھ/775ء-136ھ/754ء) کے سر بندھتا ہے جس نے سب سے پہلے ترکوں کو فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس کے زمانے میں فوج میں ایرانیوں کا اثر بہت زیادہ بڑھ گیا تھا اور وہ اس کی حکومت کے لیے خطرہ بنتے جا رہے تھے۔ فوج میں ترکوں کی بھرتی سے اس کا مقصد شاید یہ رہا ہو کہ ایرانیوں اور عربوں کے فوج میں اثرات کو کسی قدر کم کیا جائے۔ البتہ اس نے اپنے زمانہ حکومت میں جن ترکوں کو فوج میں بھرتی کیا ان کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ بنیادی طور پر فوج اور انتظامیہ دونوں جگہوں پر عربوں اور ایرانیوں کو ہی غلبہ حاصل رہا۔ مامون کے زمانے میں ایرانی اثرات بہت زیادہ بڑھ گئے کیونکہ اس کی ماں ایرانی نسل کی تھی۔ لیکن خلیفہ معتصم باللہ (218ھ/822ء تا 227ھ/842ء) پہلا عباسی خلیفہ ہے جس کے زمانے میں ترک بڑے پیمانے پر منظر عام پر آئے اور فوج میں ان کو نمایاں مقام حاصل ہوا۔

عباسی خلیفہ مامون کے بعد جب اس کا بھائی معتصم خلیفہ ہوا تو اس کی پریشانی یہ تھی کہ فوج اور انتظامیہ ہر جگہ ایرانیوں کو غلبہ حاصل تھا اور عرب کمزور پڑ چکے تھے۔ اسے ایک ایسے خاص گروپ کی ضرورت تھی جو ایرانیوں کے مقابلے میں اس کی مدد کر سکے۔ چونکہ معتصم کی ماں ترک کی تھی اس لیے فطری طور پر اس کا جھکاؤ ترکوں کی جانب ہوا کہ وہ اس کی اقتدار میں ایرانیوں کے مقابلے زیادہ مدد کر سکیں گے۔

چنانچہ معتصم نے بڑے پیمانے پر فوج میں ترکوں کی بھرتی شروع کی۔ اس نے ہزاروں کی تعداد میں ترک غلام خریدے، انہیں اسلامی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ فوجی تربیت بھی دی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عباسی فوج میں ترکوں کی تعداد اور طاقت دونوں میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ معتصم نے پچاس ہزار سے زیادہ ترکوں کو دارالخلافہ بغداد میں لا کر آباد کیا۔ فوج میں ہی نہیں انتظامیہ میں بھی انہیں بڑے بڑے عہدے اور منصب دیے گئے یہاں تک کہ صرف فوج میں ترکوں کی تعداد ستر ہزار ہو گئی۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلم دنیا میں ترکوں کو سب سے پہلے عروج خلیفہ معتصم عباسی کے زمانے میں حاصل ہوا۔

عباسی خلیفہ معتصم نے بڑے پیمانے پر وسطی ایشیا سے ترکوں کو دارالخلافہ بغداد میں لا کر فوج میں بھرتی کیا۔ ترکوں پر مشتمل ایک خاص فوجی دستہ بنایا۔ ان کے لیے طلاکار ریشمی لباس تجویز کیا اور زریں پٹکے ان کی فوجی وردی میں شامل کیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی فوجی دستے دوسری فوجوں کے مقابلے ممتاز معلوم ہونے لگے اور عام لوگوں میں یہ سمجھا جانے لگا کہ یہ اہم اور خاص فوجی دستے ہیں۔ ہر سال ہزاروں کی تعداد میں ترک غلام دارالخلافہ لائے جاتے، ان میں سے کچھ کو منتخب کر کے محافظ شاہی دستے میں شامل کر لیا جاتا۔ بقیہ کو فوجی تربیت دے کر فوج کا حصہ بنا دیا جاتا۔ انہیں میں سے کچھ ممتاز ترک فوجیوں کو فوج کے سپہ سالار کی ذمہ داری بھی دی جاتی۔ جیسے جیسے ترکوں کی تعداد اسلامی افواج میں بڑھتی گئی فوج کے ساتھ ساتھ حکومت اور انتظامیہ میں بھی ان کا اثر و نفوذ بڑھتا گیا اور چونکہ انہیں خلیفہ کی خاص سرپرستی حاصل تھی۔ اس لیے وہ نہ تو کسی سے ڈرتے تھے اور نہ ہی کسی کی پرواکرتے تھے۔ یہاں تک کہ معتصم کے زمانے ہی میں ان کی وجہ

سے دارالخلافہ بغداد میں امن و قانون کے مسائل کھڑے ہونے لگے اور ان کی شکایتیں خلیفہ تک پہنچنے لگیں۔ چنانچہ اس نے ترکوں کے لیے بغداد شہر سے باہر سامرا کے مقام پر ایک فوجی چھاؤنی بنانے کا فیصلہ کیا یہاں تک کہ سامرّا کو ہی اس نے دارالخلافہ بنا دیا۔ معتصم کی ترک نوازی کا اثر یہ ہوا کہ ترکستان کے علاقے میں لوگوں کی اسلام میں دلچسپی بڑھنے لگی۔ وہاں کے امراء اور سردار ترکستان سے نقل مکانی کر کے سامرّا میں آباد ہونے لگے۔ ان کی بڑی تعداد نے اسلام قبول کر لیا۔ ان کے زیر اثر ان کے علاقوں اور قبائل کے لوگوں نے بھی اسلام قبول کر لیا یہاں تک کہ دسویں اور گیارہویں صدی عیسوی تک ترکستان کی بیشتر آبادی مسلمان ہو گئی۔

1.5 مسلم دنیا میں ترکوں کا عروج

خلیفہ معتصم کے زمانے میں ترکوں پر جو خاص نوازش ہوئی اور جس طرح کی مراعات انہیں حاصل ہوئیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد فوج اور حکومت دونوں جگہوں پر ترکوں کا اقتدار بڑھتا گیا۔ کچھ ہی دنوں بعد ترک حکومت پر پوری طرح چھا گئے۔ عباسی خلفاء ان کے ہاتھ میں پوری طرح بے دست و پا ہو گئے۔ اگر کسی نے ان کے خلاف مزاحمت کی کوشش کی تو یا تو وہ معزول ہوا یا پھر قتل کر دیا گیا۔ گویا کہ خلیفہ کا تخت ہی نہیں اس کی جان بھی ترکوں کے رحم و کرم پر ہوتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ترکوں کو تو عروج ملا لیکن عباسی خلافت زوال پذیر ہو گئی۔ مختلف صوبوں کے گورنر آزاد و خود مختار ہو گئے۔ اور اپنی الگ حکومتیں قائم کر لیں۔ ان میں زیادہ تر حکومتیں یا تو ایرانیوں کی تھیں یا پھر ترکوں کی۔ یہاں ان کی تفصیل کا موقع نہیں ہے ہم مختصر طور پر ترکوں کی ان حکومتوں کا ذکر یہاں کریں گے جن کا براہ راست تعلق ہمارے موضوع (عثمانی حکومت کا قیام) سے ہے۔

ترکوں کے زمانۂ عروج میں جو ترک حکومتیں قائم ہوئیں ان میں آل سلجوق کی حکومت، جو سلجوقی حکومت کہلاتی ہے، بہت ہی اہم ہے۔ پانچویں صدی ہجری (گیارہویں صدی عیسوی) میں ترکوں کے ایک گروہ نے خراسان کے علاقے میں سلجوقی حکومت کی بنیاد رکھی، جس نے بہت جلد نہ صرف یہ کہ دارالخلافہ بغداد پر بھی سیاسی اقتدار و اختیار حاصل کر لیا بلکہ عباسی خلافت کے بیشتر علاقوں کو ایک سیاسی وحدت میں پرو دیا۔ آل سلجوق کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کا تعلق کاشغر کے قریب آباد ترکی قبائل سے تھا۔ ان کا مورث اعلی دقاق انہیں قبائل کا ایک رئیس تھا۔ البتہ اس کا بیٹا سلجوق (جس کے نام سے اس خاندان کو شہرت ملی) اپنے غیر مسلم ترک حکمراں کو چھوڑ کر بخارا چلا آیا جو اس وقت اسلامی مملکت کا حصہ تھا۔ اس نے اور اس کے پیچھے اس کے پورے قبیلے نے بخارا آکر اسلام قبول کر لیا اور بخارا سے قریب ہی جند کے علاقے میں آباد ہو گئے۔ یہیں سے انہوں نے اپنی فتوحات کا آغاز کیا جو آگے چل کر ایک بڑی حکومت کی تشکیل پر منتج ہوئیں۔ یہاں تک کہ بغداد بھی ان کے سیاسی اقتدار میں آگیا اور پھر بغداد پر تاتاریوں کے حملے 656ھ 1258/ء تک اس خاندان کو وہاں کے سیاسی فرماں روا کی حیثیت حاصل رہی۔

آل سلجوق کے سرداروں میں سے ایک قطلمش تھا، جس نے سلجوقی حکمراں الپ ارسلان کے خلاف بغاوت کی اور بعد میں مارا گیا۔ اس کا مہم جو بیٹا سلیمان تھا، باپ کی ہلاکت کے بعد وہ قسمت آزمائی کے لیے ایشیائے کوچک کے علاقے میں چلا آیا اور بازنطینی سلطنت کے

بعض علاقوں پر قبضہ کر کے ایک نئی حکومت کی بنیاد ڈالی جو سلاجقہ روم کے نام سے مشہور ہوئی۔ گیارہویں صدی عیسوی کی آخری دہائیوں میں اس نے ایشیائے کوچک میں ایک ایسی حکومت کی بنیاد ڈالی جو آئندہ ڈیڑھ سو برس سے زیادہ عرصے تک قائم رہی اور اسی وقت یہ بات بھی طے ہو گئی کہ آئندہ کے ایشیائے کوچک کی تاریخ اب ترکوں سے وابستہ ہے۔ کیونکہ اس خاندان کی حکومت کے زوال کے بعد بھی اس علاقے میں جو چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم ہوئیں وہ بنیادی طور پر ترک حکومتیں تھیں۔ انہیں حکومتوں میں سے ایک آل عثمان کی حکومت بھی تھی جسے آگے چل کر اسلامی تاریخ کی سب سے بڑی حکومت بننے کا افتخار حاصل ہونے والا تھا۔

1.6 عثمانی ترکوں کا تاریخی پس منظر

ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) میں عالم اسلام ایک عجیب کش مکش اور انتشار سے دوچار ہوا۔ اگر ایک طرف اس صدی کے آغاز میں شاہان خوارزم کو عروج حاصل ہوا اور انہوں نے اس وقت کی مسلم دنیا کے بڑے حصے پر حکومت قائم کر لینی چاہی تو دوسری طرف اس صدی کے وسط میں منگولیا سے اٹھنے والے چنگیز خان کے طوفان بلاخیز نے نہ صرف یہ کہ شاہان خوارزم کی عزت و سطوت خاک میں ملادی بلکہ ممالک اسلامیہ کے دل بغداد کو اس طرح تاخت و تاراج کیا کہ اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ لیکن جیسا کہ ذکر ہوا چنگیز خان کا حملہ ایک طوفان تھا جو آیا اور اپنے پیچھے تباہی و بربادی کے آثار چھوڑتا ہوا گزر گیا۔ اس میں شک نہیں کہ چنگیز خان کے حملے کے وقت مسلم دنیا کا افتراق و انتشار اپنے شباب پر تھا۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ تباہی و بربادی کے اس چنگیز خانی کھنڈر سے مسلم دنیا میں آل عثمان کی وہ مستحکم اور پائیدار حکومت قائم ہوئی جو وسعت میں شاید بعض دوسری مسلم حکومتوں سے کم رہی ہو لیکن پائیداری و استحکام میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔

چنگیز خان کے حملے نے مسلم دنیا کے مختلف علاقوں خاص طور پر ترکستان کے علاقے کو بری طرح تباہ و برباد کیا۔ سلطنت خوارزم کی تباہی و بربادی کے بعد بہت سارے ترک قبائل وطن چھوڑ کر نقل مکانی پر مجبور ہوئے۔ ان میں سے زیادہ تر جنوب کی طرف بھاگے۔ کچھ نے ایران اور شام میں پہنچ کر قسمت آزمائی کی اور وہاں ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے دوران کسی قدر اقتدار حاصل کیا۔ کچھ اور تھے جو مزید جنوب کی طرف بڑھے اور مصر کے مملوک سلاطین سے، جو خود بھی نسلاً ترک تھے، معرکہ آرا ہوئے، لیکن انہیں وہاں کامیابی نہیں ملی، مجبوراً واپس لوٹے اور ایشیائے کوچک میں سلاجقہ کی حکومت کے زیر سایہ پناہ لی۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں قبائل میں جو چنگیز خان کے حملے کے بعد اپنا وطن چھوڑ کر بھاگے تھے اور اب ادھر ادھر مارے مارے پھر رہے تھے عثمانیوں کے مورث اعلی ارطغرل کا قبیلہ بھی تھا۔ یہ قبیلہ اوغوز ترکوں کی ایک شاخ تھا اور ارطغرل کا باپ سلیمان شاہ قبیلے کا سردار تھا۔ شام کی طرف جاتے ہوئے جب یہ قبیلہ دریائے فرات کو پار کر رہا تھا کہ اس کا سردار سلیمان شاہ دریا میں ڈوب کر ہلاک ہو گیا۔ قبیلہ منتشر ہو گیا۔ بہت تھوڑے لوگ بچے اور وہ ارطغرل اور اس کے بھائی دوندار کی قیادت میں ایشیائے کوچک کی طرف روانہ ہوئے۔

ارطغرل اور اس کے قبیلے کی منزل مقصود ایشیائے کوچک میں سلطان علاء الدین سلجوقی کا دارالحکومت قونیہ کا شہر تھا۔ ابھی یہ قبیلہ

قونیہ کے راستے میں ہی تھا کہ ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جس نے نہ صرف اس قبیلے کی تقدیر بدل دی بلکہ آنے والی صدیوں میں آل عثمان کی عظیم سلطنت کے قیام کے لیے بنیاد کے پتھر کا کام کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب یہ لوگ ایشیائے کوچک میں انگورا کے قریب سے گزر رہے تھے، انہوں نے دیکھا کہ دو فوجیں آپس میں لڑ رہی ہیں---- واضح رہے کہ اس وقت بھی مختلف تاتاری فوجیں مسلم علاقوں پر حملے اور لوٹ مار کیا کرتی تھیں------ قبیلے کا سردار ان دونوں فوجوں میں سے کسی کو بھی جانتا نہیں تھا۔ البتہ اس وقت ترکوں میں پایا جانے والا مہم جوئی کا فطری جذبہ اس کے کام آیا۔ اس نے دیکھا کہ لڑنے والی فوجوں میں ایک تعداد میں کم اور کمزور ہے جب کہ دوسری فوج تعداد میں زیادہ اور طاقت ور ہے۔ اس نے کمزور فوج کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا، اس کے ساتھ سواروں کا جو مختصر دستہ تھا، اس کی تعداد پانچ سو سے بھی کم تھی۔ ارطغرل نے اپنے سواروں کو ساتھ لے کر کمزور فریق کی طرف سے طاقتور فوج پر حملہ کیا۔ اس کا یہ حملہ اتنا شدید تھا اور اس کے سوار سپاہی اس جنگ میں اتنی جاں بازی سے لڑے کہ جنگ کا پانسہ ہی پلٹ گیا۔ دشمن کو نہ صرف شکست ہوئی بلکہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ جنگ کے خاتمے اور فتح حاصل ہو جانے کے بعد ارطغرل کو یہ معلوم ہوا کہ جس فوج کی اس نے بروقت پہنچ کر مدد کی تھی وہ ایشیائے کوچک کے سلجوقی حکمران علاء الدین سلجوقی کی فوج تھی اور طاقت ور فوج جو اس کی فوج کو گھیرے ہوئے تھی حملہ آور تاتاریوں کی فوج تھی۔

ارطغرل اور اس کے قبیلے کا سوار دستہ اس وقت سلطان علاء الدین سلجوقی کے لیے فتح و نصرت کا فرشتہ بن کر نازل ہوا تھا۔ چنانچہ سلطان علاء الدین نے اس کے اس کارنامے اور مدد کے صلے میں ارطغرل کو ایک جاگیر عطا کی۔ یہ جاگیر سغوت کا زرخیز علاقہ تھا جو دریائے سقاریہ کے بائیں جانب بازنطینی حکومت کی سرحد کے قریب واقع تھا۔ جاگیر کے ساتھ ہی سغوت کا شہر یا قصبہ بھی سلطان علاء الدین نے ارطغرل کے حوالے کر دیا۔ سغوت کا علاقہ جاگیر میں دینے کا مقصد جہاں ایک طرف یہ تھا کہ ارطغرل کی مدد کا اعتراف کیا جائے وہیں دوسری طرف سلطان علاء الدین سلجوقی کے دل میں یہ خیال بھی رہا ہو گا کہ اس طرح ارطغرل جیسا بہادر سردار بازنطینی قلعہ داروں کی پیش دستیوں سے بھی اس کی سرحدوں کو محفوظ رکھے گا۔ ارطغرل اور اس کے قبیلے کے افراد جو اس کے ساتھ آئے تھے انہوں نے اس علاقے میں بود و باش اختیار کر لی۔ ارطغرل جو اپنی جاگیر کا سپہ دار بھی تھا، اس نے اپنی جاگیر کا انتظام و انصرام بہت اچھے طریقے سے کیا۔ چونکہ اس کی جاگیر بازنطینی سرحد پر واقع تھی، اس لیے اکثر بازنطینی قلعہ داروں سے لڑائیاں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ ارطغرل نے تھوڑے ہی دنوں میں ان پر اپنی بہادری اور شجاعت کا سکہ بٹھا دیا۔ بازنطینی سرداروں کے خلاف اس کی کامیابیوں کا اثر یہ ہوا کہ بہت سے دوسرے ترکی قبیلے بھی جو پہلے سے ایشیائے کوچک میں آباد تھے، اس کے ساتھ آ کر شامل ہو گئے۔ اس طرح ارطغرل کی قوت میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا اور اس کی جاگیر ایک چھوٹی سی ریاست کی شکل اختیار کرنے لگی۔

سلطان علاء الدین سلجوقی کے لیے ایک جاگیر دار کا اس طرح طاقت ور ہوتے چلا جانا تشویش کا سبب بن سکتا تھا، لیکن چونکہ ایشیائے کوچک میں خود اس کا اپنا اقتدار خطرے میں تھا۔ سرحدوں پر تاتاریوں اور عیسائیوں کے حملوں کے علاوہ اندرون مملکت بھی مختلف سرداروں نے اپنی خود مختار ریاستیں قائم کر لی تھیں۔ ایسے میں ارطغرل جیسے بہادر سردار کی بازنطینی سرحد پر موجودگی اس کے لیے تشویش کے بجائے یک گونہ اطمینان کا باعث تھی۔ چنانچہ جب ایک مرتبہ بنی شہر اور بروصہ کے درمیان ارطغرل نے سلطان علاء الدین سلجوقی کے

نائب کے طور پر تاتاریوں اور بازنطینیوں کی ایک مشترکہ فوج کو شکست دی تو سلطان اس سے بہت زیادہ خوش ہوا اور اس کامیابی کے صلے میں اس نے ارطغرل کو اپنے مقدمۃ الجیش کا سپہ سالار مقرر کرنے کے علاوہ اس کی شہر کو بھی اس کی جاگیر میں دے دیا۔ البتہ ان علاقوں پر مکمل کنٹرول حاصل کرنے کے لیے پہلے ارطغرل اور بعد میں اس کے جانشین عثمان خاں کو کافی محنت کرنی پڑی۔ اسی دوران ارطغرل نے ہلال کو جو سلطان علاء الدین کے علم کا نشان تھا، اپنے علم کے نشان کے طور پر اختیار کیا کیونکہ وہ سلطان کا نائب تھا۔ البتہ ہلال کا یہی نشان آگے چل کر عثمانی ترکوں کی عظمت کا قومی نشان بھی بن گیا۔ ارطغرل نے نہایت کامیابی کے ساتھ اپنی جاگیر اور علاقے کا انتظام سلطان علاء الدین سلجوقی کے نائب کے طور پر کیا اور نوّے سال کی عمر میں (687ھ/1288ء) اس کا انتقال ہوا اور سغوت کے قریب دفن ہوا۔

1.7 عثمانی حکومت کا بانی امیر عثمان خاں

1288ء میں ارطغرل کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا عثمان خاں اس کی جاگیر کا وارث ہوا۔ یہی عثمان خاں آگے چل کر دولت عثمانیہ یا عثمانی حکومت کا بانی ہوا اور اسی کے نام پر یہ حکومت عثمانی کہلائی۔ عثمان خاں 656ھ/1257ء میں سرگرت (سغوت) کے علاقے میں پیدا ہوا۔ وہ امیر ارطغرل کا سب سے بڑا لڑکا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ارطغرل کا قبیلہ ایشیائے کوچک میں داخل ہونے تک اپنے آبائی مذہب بت پرستی پر قائم تھا۔ ایشیائے کوچک میں داخلے اور سلطان علاء الدین سلجوقی سے ربط میں آنے کے بعد یہ قبیلہ اسلام میں داخل ہوا۔ مورخین اس بارے میں مختلف الرائے ہیں کہ آیا ارطغرل نے ایشیائے کوچک کی اسلامی فضا میں رہتے ہوئے علاء الدین سلجوقی کی صحبت سے اسلام قبول کیا یا پھر عثمان خان اس علاقے کے ایک خدا رسیدہ بزرگ اوہ بالی کی تلقین و تبلیغ کی وجہ سے اسلام سے متاثر ہوا اور پھر اپنے پورے قبیلے کے ساتھ اسلام قبول کر لیا۔ بہر حال اتنا طے ہے کہ عثمان خاں اپنی نوعمری سے ہی مسلمان تھا اور اکثر بزرگ اوہ بالی کی خدمت میں حاضری دیا کرتا تھا یہاں تک کہ ان بزرگ نے اپنی حسین اور خوبصورت بیٹی کی شادی عثمان خاں سے کر دی، جس کا نام مال خاتون تھا۔

مال خاتون سے عثمان خاں کی شادی کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے۔ کہتے ہیں کہ عثمان خاں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ ایک چاند ہلال بن کر اوہ بالی کے سینے سے نکلا اور رفتہ رفتہ بدر کامل بن کر عثمان کے سینے میں اتر آیا۔ پھر اس کے پہلو سے ایک زبردست تناور درخت نمودار ہوا جو بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ اس کی شاخیں بحر و بر پر چھا گئیں۔ درخت کی جڑ سے نکل کر دنیا کے چار بڑے دریا دجلہ، فرات، نیل اور ڈینوب بہہ رہے تھے اور چار بڑے پہاڑ کوہ قاف، کوہ بلقان، کوہ طور اور کوہ اٹلس اس کی شاخوں کو سنبھالے ہوئے تھے، اچانک بہت ہی تیز ہوا چلی اور اس عظیم درخت کی پتیوں کا رخ جو شکل میں تلوار سے مشابہ تھیں ایک عظیم الشان شہر کی طرف ہو گیا۔ یہ شہر ایک ایسی جگہ واقع تھا جہاں دو سمندر اور دو براعظم ملتے ہیں اور ایک انگوٹھی کی طرح دکھائی دیتا تھا جس میں دو نیلم اور دو زمرد جڑے ہوئے تھے۔ عثمان اس انگوٹھی کو پہننا ہی چاہتا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ نیند سے بیدار ہونے کے بعد یہ خواب عثمان خاں نے اوہ بالی سے بیان کیا۔ خدا رسیدہ بزرگ اوہ بالی نے اس خواب میں عثمان کے شاندار مستقبل کی تعبیر دیکھی نیز اسے ایک اشارہ غیبی سمجھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی بیٹی مال خاتون سے اس کا نکاح کر دیا۔

بعد کے زمانے کی عثمانی تاریخی روایات میں عثمان خاں کے اس خواب کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اسے بہت اچھا سمجھا گیا اور اس کی تعبیر یہ بتائی گئی کہ خواب میں بیان کردہ چاروں دریا اور پہاڑ بعد میں قائم ہونے والی عظیم الشان عثمانی سلطنت کی وسعت کا اشارہ اور پیش گوئی تھے۔ اور دو براعظموں اور دو سمندروں کے اتصال پر واقع شہر فی الواقع قسطنطنیہ کا شہر تھا جسے عثمان خاں فتح نہیں کر سکا لیکن اس کی اولاد اسے بھی فتح کرنے اور اپنا دارالسلطنت بنانے میں کامیاب رہی۔ واقعہ یہی ہے کہ عثمان خاں کے بعد اس کی اولاد میں بڑے بڑے فاتح حکمراں پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی خدمات کے ذریعہ عثمان خاں کے خواب کو حقیقت کا جامہ پہنا دیا۔

عثمان خاں کی تعلیم و تربیت اسلامی ماحول میں ہوئی تھی۔ وہ خدا ترس ہونے کے ساتھ نہایت ہی بہادر اور شجاع بھی تھا۔ ایشیاء کوچک کی سرحد پر جاگیر کا حکمراں اور اپنے قبیلے کا سردار بننے کے بعد نہ صرف یہ کہ اپنی جاگیر اور سلجوقی سرحد کا کامیابی کے ساتھ اس نے دفاع کیا بلکہ ایک ایسے زمانے میں جب آپسی انتشار کے سبب سلجوقی حکومت دم توڑ رہی تھی، سلجوقی امراء اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی خود مختاری کا اعلان کر رہے تھے، عثمان خاں سلجوقی حکمراں علاء الدین کا وفادار بھی رہا اور اپنی جاگیر اور اس سے متصل علاقوں کا انتظام و انصرام نہایت خوبی سے کیا۔ ہمیں یہ بات معلوم ہے کہ عثمان خاں کی جاگیر بازنطینی سرحد پر واقع تھی اور بازنطینی قلعہ دار اور فوجی حکام اکثر اس کی سرحدوں پر حملہ آور بھی ہوتے رہتے تھے۔ سرداری کے پہلے ہی سال سلطان کے ایک نائب کی حیثیت سے اسے بازنطینی علاقے میں داخل ہونا پڑا اور اس نے بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے قراجہ حصار کا قلعہ ان سے چھین لیا۔ اس کی فتح سے خوش ہو کر سلطان علاء الدین سلجوقی نے قلعہ اور اس کا پورا علاقہ عثمان خاں کے حوالے کر دیا۔ مزید اسے بک کا خطاب دے کر اپنا سکہ جاری کرنے اور جمعہ کے خطبے میں اپنا نام شامل کرنے کی اجازت بھی دے دی، گویا سلطان نہ ہوتے ہوئے بھی اسے سلطانی کا اعزاز مل گیا، لیکن عثمان خاں ایک وفادار اور بہادر ترک تھا۔ اس نے سلطان علاء الدین سلجوقی کی زندگی میں اپنی خود مختاری کا اعلان نہیں کیا۔

1.8 عثمانی حکومت کا قیام

عثمان خاں سلجوقی حکومت کے ایک امیر کے طور پر ایشیائے کوچک کے بازنطینی سرحد سے ملنے والے علاقوں پر 699ھ/1300ء تک حکومت کرتا رہا یہاں تک کہ سلجوقی سلطنت پر تاتاریوں نے ایک بار پھر حملہ کر دیا۔ سلطان علاء الدین سلجوقی ان کے ساتھ جنگ میں مارا گیا اور قونیہ کی سلجوقی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ تاتاری سلطان علاء الدین کی شکست کے بعد لوٹ مار کرتے ہوئے واپس لوٹ گئے۔ پہلے سے ہی انتشار کے شکار ایشیائے کوچک میں پورے طور پر طوائف الملوکی پھیل گئی اور جس علاقے میں جو امیر تھا وہ اس علاقے کا خود مختار حکمراں بن گیا۔ اس موقع کا فائدہ عثمان خاں نے بھی اٹھایا اور بازنطینی سرحد پر اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس کی شہر کو اس نے اپنا دارالحکومت قرار دیا۔ اس کے بعد آس پاس کی جو چھوٹی چھوٹی امارتیں تھیں ان کے امیروں کو شکست دے کر اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ اور اس طرح مستقبل کی عظیم الشان عثمانی سلطنت کی بنیاد پڑی۔

عثمان خاں کی زندگی اور اس کے زمانے کے حالات کے مطالعے سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بہادر فاتح ضرور تھا، لیکن

صرف فتوحات اس کا مقصود نہ تھیں، اگر ایسا ہوتا تو وہ بھی ایشیائے کوچک کے دیگر ترک امراء کی طرح علاء الدین سلجوقی کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی زندگی میں ہی اپنی خودمختاری کا اعلان کر چکا ہوتا اور ایک بڑے علاقے پر اپنی حکومت قائم کر لی ہوتی۔ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ جاگیر کا سربراہ بننے کے بعد اس نے جو بھی جنگیں لڑیں وہ زیادہ تر دفاعی تھیں اور ایک لمبے عرصے تک، جب کہ وہ چاہتا تو بازنطینی علاقوں میں اپنی جاگیر کو وسعت دے سکتا تھا، اس نے اپنی تمام تر توجہ انتظام و استحکام کی جانب مبذول رکھی۔ سلجوقی حکومت میں پہلے سے جو محکمے قائم تھے اور جس طرح افسروں کا تقرر ہوتا تھا، اس نے اپنے کنٹرول والے علاقوں میں اسی طرح کے محکمے قائم کیے اور ان میں ترک افسر مقرر کیے۔ خصوصیت کے ساتھ عام لوگوں کی فلاح و بہود پر اس نے خاص توجہ دی، جس کی وجہ سے وہ اپنی رعایا میں بہت ہی مقبول تھا۔

عثمان خاں ابھی اپنے علاقوں کے انتظام و استحکام میں ہی مصروف تھا کہ سلجوقی حکومت کے خاتمے کے بعد پیدا ہونے والی طوائف الملوکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بعض ترک سرداروں نے بازنطینی قلعہ داروں کے ساتھ ایک اتحاد بنا کر اس کے علاقوں پر حملے شروع کر دیے، عثمان خاں نے ان حملوں کا نہ صرف یہ کہ دفاع کیا بلکہ ان کو زیر کرتے ہوئے آس پاس کے بہت سے بازنطینی قلعوں کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ اسی دوران 701ھ 1301 / ء میں عثمان خاں کا مقابلہ نائیکومیڈیا سے قریب قیون حصار کے مقام پر قسطنطنیہ کے شہنشاہ کی باقاعدہ افواج سے ہوا۔ اس جنگ میں عثمان خاں نے شاندار کامیابی حاصل کی اور آنے والے چھ برسوں کے اندر اس نے مسلسل فتوحات کے ذریعہ اپنی ریاست کا دائرہ بڑھا کر بحر اسود کے ساحل تک پہنچا دیا۔ اس دوران ایک موقعہ ایسا بھی آیا کہ بازنطینی جو اب خود عثمان خاں کا مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے، انہوں نے تاتاریوں کو عثمان خاں کے علاقوں پر حملہ کرنے کے لیے اکسایا، عثمان خاں نے اپنے لڑکے اور خاں (آرخاں) کو تاتاریوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بھیجا، اس نے جنگ میں تاتاریوں کو سخت شکست دی اور انہیں اپنے علاقوں سے بھگا دیا۔

بروصہ ایشیائے کوچک میں بازنطینی سلطنت کا مشہور اور نہایت اہم شہر تھا۔ عثمان خاں نے 717ھ 1317 / ء میں اس شہر کا محاصرہ کیا۔ بروصہ والوں نے محصور ہو کر عثمان خاں کی فوجوں کا مقابلہ کیا۔ عثمان کی فوجوں نے دس سال تک بروصہ کا محاصرہ جاری رکھا، یہاں تک کہ مجبور ہو کر محصورین نے عثمان خاں کے لڑکے اور خاں کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور شہر ان کے لیے خالی کر دیا۔ اور خاں کی سرکردگی میں ترکی فوجیں بروصہ کے شہر میں 726ھ 1326 / ء میں فاتحانہ داخل ہوئیں لیکن ان کا محبوب حکمراں عثمان خان اس وقت بروصہ سے دور اپنی جائے پیدائش سغوت میں بستر مرگ پر زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اور خان بروصہ کی فتح کی خوش خبری لے کر اس کے پاس پہنچا۔ عثمان نے اور خان کی بہادری اور شجاعت کی تعریف کی، اسے اپنا جانشین مقرر کیا، رعایا کے ساتھ بلا تفریق عدل و انصاف اور بھلائی کرنے کی وصیت کی اور آخر میں یہ ہدایت بھی کی کہ موت کے بعد اسے بروصہ میں ہی دفن کیا جائے اور اسے عثمانی مملکت کا پایہ تخت بنایا جائے۔ چنانچہ اس کی وصیت کے مطابق 21/ رمضان 727ھ کو اس کی وفات کے بعد بروصہ ہی میں اسے دفن کیا گیا اور اس کی قبر پر ایک عالی شان مقبرہ تعمیر کیا گیا۔

عثمان خاں نے موت سے قبل اپنے بیٹے اور جانشین اور خان کو جو وصیت کی وہ اس لائق ہے کہ اسے یہاں نقل کیا جائے :

''بیٹا اب میں موت کی آغوش میں جا رہا ہوں، مجھ کو اب کسی بات کا غم نہیں ہے کیونکہ تم سا لائق بیٹا اپنی جگہ چھوڑ رہا ہوں جو میری قائم مقامی اس دولت کی مجھ سے بہتر کر سکے گا''۔

بیٹا یہ وصیت یاد رہے کہ :

ظاہر اور باطن میں اللہ کا خوف رکھنا اور عدل گستری کو اپنا شیوہ بنانا کہ اسی سے سلطنت کی بنیاد مضبوط رہتی ہے۔ رعایا پر رحم کرنا کیونکہ ہمارے رب کی صفت رحم ہے۔ حقوق کے معاملے میں قوی اور ضعیف کو یکساں سمجھنا۔ شریعت حقہ کو رائج کرنا اور کتاب و سنت کے مطابق عمل رکھنا۔ اگر میری اس وصیت پر عمل کرو گے تو تم ان اولیاء میں سے ہو جاؤ گے جو رضائے الٰہی سے کامیاب ہوئے ہیں اور بیٹا آخری کہنا یہ ہے کہ بروصہ کو پایہ تخت بنانا اور وہیں مجھ کو دفن کرنا۔

عثمان خان ایک عالی حوصلہ، بہادر اور عقل مند حکمراں تھا۔ کسی بھی سلطنت کے بانی کے لیے جن اوصاف حمیدہ کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب کے سب عثمان خان کی ذات میں موجود تھے۔ وہ غیر معمولی ہمت اور شجاعت کا حامل تھا، اس میں قیادت کا خداداد ملکہ تھا۔ میدان جنگ میں اپنی بہادری سے وہ اپنے سپاہیوں کے اندر بے پناہ دلیری کی روح پھونک دیتا تھا۔ انتظام حکومت میں اس کی دانش مندی نے رعایا کو اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ وہ ان کے ساتھ عدل و انصاف کرتا تھا اور اس حوالے سے اس کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ جیسا کہ اس کی وصیت سے ظاہر ہے وہ خود بھی اپنی رعایا کے ساتھ برتاؤ اور عدل و انصاف میں کسی قسم کا امتیاز روا نہیں رکھتا تھا۔ ترک، تاتار، مسلم، عیسائی اس کی نظر میں سب برابر تھے۔ وہ ہمیشہ اس بات کا خواہاں رہتا تھا کہ رعایا کے حالات بہتر ہوں اور ان کے اندر زیادہ سے زیادہ خوش حالی آئے۔ اس نے خود کبھی دولت نہیں جمع کی۔ وہ بہت ہی سادہ اور نام و نمود سے پاک زندگی گزارتا تھا۔ جو بھی مال غنیمت اسے حاصل ہوتا اس میں سے یتیموں اور غریبوں کا حصہ نکالنے کے بعد اپنے فوجیوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ وہ فیاض، رحم دل اور مہمان نواز تھا۔ حکمراں ہونے کے باوجود اس نے اپنے لیے عیش و آسائش کا سامان جمع نہیں کیا، اس کا گھر معمولی قسم کا اور حکمرانی کے لوازمات سے خالی تھا۔ اوہ بالی کے فیض صحبت سے عثمان خاں پر درویشی کا جو رنگ زندگی کے ابتدائی حصے میں چڑھ گیا تھا اس کے اثرات تمام عمر باقی رہے۔ اپنی مجاہدانہ زندگی، انسان دوستی کے رویے اور غیر معمولی جرات و شجاعت کی خوبیوں کے سبب وہ نہ صرف اپنی زندگی میں ہر دل عزیز تھا بلکہ آج تک ترک اس کا نام عزت اور احترام کے ساتھ لیتے ہیں۔ اپنی حکومت کے ابتدائی دنوں میں ہی عثمان خاں نے اس کی شہر میں ایک مسجد تعمیر کروائی تھی جو کسی بھی عثمانی حکمراں کے ذریعہ تعمیر کی جانے والی پہلی مسجد تھی۔ عثمان خان کی انہیں خصوصیات اور اوصاف کے سبب اس کے بعد عثمانی خاندان میں یہ روایت پڑ گئی کہ جب کوئی حکمراں تخت نشین ہوتا تو عثمان کی تلوار (جو اب تک محفوظ ہے) اس کی کمر سے باندھی جاتی اور ساتھ ساتھ یہ دعا بھی کی جاتی تھی کہ خدا اس میں بھی عثمان خاں ہی جیسی خوبیاں پیدا کر دے۔

عثمان خاں عثمانی سلطنت کا پہلا حقیقی حکمراں اور بانی ہے اور اکثر اس کے نام کے ساتھ سلطان کا لقب بھی شامل کر دیا جاتا ہے، لیکن خود اس نے یا اس کے بعد اور خاں اور مراد اول نے بھی کبھی اپنے لیے سلطان کا لقب استعمال نہیں کیا بلکہ صرف امیر کہلاتے رہے۔ اپنے والد ارطغرل سے عثمان خاں کو سغوت، اس کی شہر اور آس پاس کا کچھ علاقہ جاگیر کے طور پر ورثے میں ملا تھا۔ عثمان خاں نے اپنی 38 سالہ

امارت میں اس چھوٹے سے علاقے کو کافی وسعت دی اور ایک ایسی مملکت میں تبدیل کر دیا جس کی لمبائی 120 میل اور چوڑائی 60 میل تھی۔ عثمان خاں کے ذریعے قائم ہونے والی مملکت میں ترکوں کے علاوہ یونانی اور سلافی باشندے بھی کافی تعداد میں تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عثمان خاں کے مقبوضات میں بیشتر بازنطینی حکومت کے ایشیائی علاقے شامل تھے۔ عثمان خاں نے اپنے مفتوحہ علاقوں میں لوگوں کا نہ تو قتل عام کیا اور نہ ہی انہیں غلام بنایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے علاقوں میں اسلام بہت تیزی کے ساتھ پھیلا اور بڑی تعداد میں لوگ مسلمان ہوئے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اپنی رعایا کے درمیان کسی قسم کی تفریق نہیں کرتا تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ بہت جلد فاتح اور مفتوح ایک ہو گئے، ان کے درمیان آپس میں شادی بیاہ کے تعلقات بھی قائم ہو گئے اور پھر ان کے میل سے ایک نئی نسل تیار ہونے لگی جو ترکوں کے اقتدار والی دوسری ریاستوں سے قدرے مختلف تھی اور اپنے آپ کو عثمانی کہتی تھی۔

1.9 عثمانی حکومت کے قیام واستحکام میں اہم رول ادا کرنے والے بعض دیگر حکمراں

اس میں شک نہیں کہ عثمانی حکومت کا بانی اول امیر عثمان خاں ہے جس نے اپنے باپ امیر ارطغرل کی چھوٹی سی جاگیر کو ایک باضابطہ مملکت کی شکل عطا کی۔ عثمان خاں کی قائم کردہ مملکت بہت چھوٹی اور مختصر تھی۔ اس کا نام جمعہ کے خطبے میں ضرور شامل ہو گیا تھا لیکن اس نے اپنے لیے سلطان کا لقب اختیار نہیں کیا۔ یہ بعد میں آنے والے اس کے جانشین تھے جنہوں نے اس کی قائم کردہ چھوٹی سی ریاست کو ایک وسیع و عریض سلطنت میں تبدیل کر دیا جو ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ایک بڑے علاقے پر پھیلی ہوئی تھی۔

عثمان خاں کے بعد اس کی وصیت کے مطابق اس کا چھوٹا بیٹا اور خاں 760ھ 1359/ء-726ھ 1326/ء) تخت نشین ہوا۔ اس کی عمر اس وقت 42 برس تھی اور اپنے والد کی نگرانی میں اس وقت تک وہ حکمرانی کے اصول و آداب خاص طور پر فن سپہ گری میں کافی مہارت حاصل کر چکا تھا۔ عثمان خاں کے دو بیٹے تھے، بڑا بیٹا علاء الدین اور چھوٹا اور خاں۔ عثمان خاں نے دونوں کی تعلیم وتربیت پر خاص توجہ دی تھی۔ علاء الدین کو علوم دینیہ سے دل چسپی تھی جبکہ اور خاں کو فنون سپہ گری سے خاص لگاؤ تھا اور وہ مملکت کے امور میں باپ کے ساتھ شریک رہتا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ عثمان خاں نے اپنی جانشینی کے لیے اور خاں کا انتخاب کیا۔ البتہ اور خاں نے باپ کے انتقال کے بعد بڑے بھائی کے سامنے یہ پیش کش رکھی کہ سلطنت کو باہم تقسیم کر لیا جائے۔ لیکن علاء الدین نے باپ کی وصیت اور اپنی عافیت پسند طبیعت کی بنا پر اس تجویز کو قبول نہیں کیا۔ البتہ اور خاں کے اصرار پر اس نے انتظام مملکت کی ذمہ داری قبول کر لی۔

اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ علاء الدین خاں گویا عثمانی حکومت کا پہلا وزیر تھا۔ بلاشبہ عثمانی حکومت کی توسیع اور استحکام میں اور خاں کی شجاعت اور بہادرانہ کارناموں کا بڑا اہم رول ہے۔ لیکن یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ بحیثیت وزیر علاء الدین نے مملکت کے نظم و نسق کو چلانے اور اسے منظم و مستحکم رکھنے کے لیے جو اصلاحات کیں اور جس طرح کے قدم اٹھائے فی الواقع وہی اصلاحات و اقدامات عظیم الشان عثمانی سلطنت کی اساس اور بنیاد قرار پائے۔

باپ کی وصیت کے مطابق اور خاں نے حکومت سنبھالنے کے بعد بروصہ کو اپنی مملکت کا پایہ تخت بنایا۔ اور بہت جلد بازنطینی

سلطنت کے باقی ایشیائی مقبوضات پر بھی قبضہ کر لیا، خاص طور پر نائیسا کا شہر جو اپنی اہمیت کے اعتبار سے قسطنطنیہ کے بعد دوسرے درجے کا شہر تھا۔ 730ھ میں اسے بھی فتح کر لیا۔ ان فتوحات کے نتیجے میں عثمانی مملکت کا رقبہ پہلے سے کہیں زیادہ وسیع ہو گیا۔ اور خاں نے فتوحات کے سلسلے کو مزید وسعت دینے کے بجائے پہلے مفتوحہ علاقوں کے انتظام و انصرام پر توجہ دی۔ چنانچہ آئندہ طویل عرصے کے لئے اس کی حکومت میں کوئی جنگ نہیں ہوئی (اپنی عمر کے آخری حصے میں اس نے یورپ کی طرف توجہ کی اور اس کی قیادت میں مسلمان پہلی بار مشرقی یورپ میں فاتحانہ داخل ہوئے) جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے اور اس کے حکام کو مملکت کے اندرونی معاملات کو سدھارنے، عوام کی فلاح و بہبود کے کام کرنے اور آئندہ اقدامات کے لیے خود کو تیار کرنے کا کافی موقع مل گیا۔

اور خاں کے بڑے بھائی اور اب عثمانی حکومت کے وزیر علاء الدین خاں نے بطور وزیر مملکت کے جن امور پر خاص طور پر توجہ دی اور جن کی وجہ سے عثمانی حکومت کو حقیقی استحکام نصیب ہوا، بنیادی طور پر وہ تین امور تھے جن کو علاء الدین کی اصلاحات کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ 1. سکہ. 2. لباس. 3. فوج۔

1.9.1 سکہ

اس سے پہلے ہم یہ پڑھ چکے ہیں کہ سلجوقی حکمراں سلطان علاء الدین کیقباد نے امیر عثمان خاں کو اس بات کی اجازت دے دی تھی کہ وہ جمعہ کے خطبے میں اپنا نام شامل کر لے اور اپنے نام کا سکہ بھی جاری کر سکتا ہے۔ امیر عثمان خاں نے اپنے مزاج کی سادگی اور قناعت پسند طبیعت کی وجہ سے اور شاید اس وجہ سے بھی کہ اس وقت اس جیسے سادگی پسند حکمراں کے لیے سکہ ڈھالنے کی ٹکسال کا انتظام کرنا آسان کام نہیں تھا، اس نے اپنے نام کا سکہ جاری نہیں کیا تھا اور عثمانی علاقوں میں سلجوقی سکّے ہی رائج تھے۔ اب جب کہ سلجوقی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا، عثمانی حکومت ہی نہیں ایشیائے کوچک کی دوسری ریاستوں کو بھی سکے کا مسئلہ درپیش تھا۔ اس کے ساتھ ہی مملکت میں سلجوقی سکوں کے جاری رہنے سے وہ دوسری ریاستوں سے ممتاز نہیں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ علاء الدین نے وزارت کے ابتدائی دنوں ہی میں اس اہم معاملے کی طرف توجہ دی اور حکمرانی کے اس امتیاز کو اختیار کیا۔ اس نے دارالحکومت بروصہ میں طلائی اور نقرئی سکے ڈھالنے کے لیے ٹکسال قائم کی اور عثمانی حکمراں اور خان کے نام سے طلائی اور نقرئی دونوں طرح کے سکے جاری کر کے سلجوقی دور کے سکوں کے استعمال پر پابندی عائد کر دی۔

1.9.2 لباس

لباس شناخت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اکثر افراد اور اقوام کی شناخت اور پہچان ان کے لباس سے بھی ہوتی ہے۔ عثمانی حکومت کے بانی عثمان خاں نے اس جانب بھی توجہ نہیں دی تھی اور اس کے زمانے میں عثمانی مملکت کے شہریوں کے لیے لباس کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ لوگ یکساں طور پر ایک ہی جیسا لباس پہنا کرتے تھے۔ اور خاں کے زمانہ حکومت میں وزیر علاء الدین نے لباس کی جانب بھی توجہ دی اور مملکت میں رہنے والے مختلف طبقات کے لیے الگ الگ لباس کی نہ صرف تجویز دی بلکہ اسے قانون کے ذریعے عملاً نافذ بھی کیا۔ شہریوں اور دیہاتیوں کے لباس الگ الگ تھے اسی طرح مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لباس بھی الگ الگ مقرر تھے۔ گویا اس طرح مملکت کے مختلف طبقات میں آسانی کے ساتھ فرق و امتیاز کیا جاسکتا تھا۔

1.9.3 فوج

فوج کسی بھی مملکت و حکومت کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر فوج مستحکم ہے تو مملکت و حکومت مستحکم رہتی ہے، اور اگر فوج افتراق وانتشار کا شکار ہو جائے تو پھر مملکت بھی منتشر ہو جاتی ہے اور حکومت ختم ہو جاتی ہے، اس لیے ہر مملکت و حکومت اپنے استحکام وبقا کے لیے فوج پر خاص توجہ دیتی ہے۔ عثمانی حکومت کے قیام کے زمانے تک با قاعدہ فوج کا انتظام نہیں تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ارطغرل یا عثمان خاں کے زمانے میں ان کی کوئی با قاعدہ فوج نہیں تھی۔ بلکہ ان کے زمانے تک یہ دستور تھا کہ جب بھی کوئی جنگ در پیش ہوتی تو عوام میں اس کا اعلان کر دیا جاتا اور جو شخص بھی لڑائی میں شریک ہونا چاہتا ہے وہ متعینہ تاریخ اور مقام پر حاضر ہو جاتا۔ گویا یہ ایک طرح کی رضاکار فوج ہوتی تھی جو بوقت جنگ یکجا ہو جاتی تھی اور لڑائی ختم ہونے کے بعد واپس چلی جاتی تھی۔ اس طرح کی فوج کو با قاعدہ تنخواہ یا معاوضہ نہیں ملتا تھا، بلکہ مال غنیمت کے طور پر جو کچھ ہاتھ آتا تھا وہی ان کی خدمت کا معاوضہ ہوتا تھا۔ ان فوجوں کا کوئی مخصوص لباس (وردی) بھی نہیں ہوتا تھا۔ عثمان خاں کے زمانے تک جب کہ مملکت زیادہ وسیع نہیں ہوئی تھی اس طرح کی غیر منظم فوج سے کام چل جاتا تھا۔ لیکن اس کے بعد اورخاں کے زمانے میں جب مملکت وسعت اختیار کرنے لگی اور اس کے استحکام کے مسائل پیش آنے شروع ہوئے تو یہ ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جانے لگی کہ رضاکاروں کے علاوہ ایک با قاعدہ، مستقل اور منظم فوج بھی ہونی چاہیے، چنانچہ اس کے لائق بھائی اور وزیر علاء الدین خاں نے تنخواہ دار پیادوں پر مشتمل ایک با قاعدہ پیدل فوج ترتیب دی، جس کا نام 'پیادے' تھا۔ یہ فوج دس دس، سو سو اور ہزار ہزار کی ٹکڑیوں اور دستوں میں تقسیم تھی۔ اس فوج میں شامل فوجیوں کو با قاعدہ بڑی بڑی تنخواہیں ملتی تھیں اور فن سپہ گری میں باضابطہ ان کی تربیت ہوتی تھی۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد اس منظم فوج سے خود سری کا اظہار ہونے لگا جو اورخاں جیسے حکمراں کے لیے تشویش کا باعث تھا کیونکہ یہ فوج کسی بھی وقت خود اس کے لیے بھی خطرہ بن سکتی تھی چنانچہ اس نے علاء الدین اور شاہی خاندان کے ایک اور معزز رکن قرا خلیل (قرا خلیل کا عثمانی شاہی خاندان سے ازدواجی تعلق تھا اور علاء الدین خاں کے بعد یہ وزیر سلطنت ہو کر خیر الدین پاشا کے نام سے مشہور ہوا ہے) سے اس سلسلے میں مشورہ کیا۔ اس موقع پر قرا خلیل نے اس کے سامنے جو تجویز رکھی اس نے نہ صرف یہ کہ اورخاں کو اپنی پیادہ فوج کی طرف سے مطمئن کر دیا بلکہ ایک ایسی فوج کے قیام کا راستہ ہموار کر دیا جو اپنے زمانے کی سب سے زیادہ منظم اور طاقت ور فوج تھی اور جس نے عثمانی حکمرانوں کے لیے فتوحات کا ایک ایسا دروازہ کھول دیا جو آنے والی تین صدیوں تک جاری رہا، اس دوران انہوں نے یورپ، ایشیا اور افریقہ میں نہ صرف یہ کہ تیز رفتار فتوحات حاصل کیں بلکہ اس فوج کی مدد سے عثمانی سلطنت کو مستحکم رکھنے میں بھی کامیاب رہے۔

1.9.4 ینی چری (نئی فوج)

عثمانی حکمراں اورخاں نے علاء الدین خاں اور قرا خلیل کے سامنے پیادہ فوج کے حوالے سے جب اپنی تشویش ظاہر کی اور اس پر ان سے مشورے کا طالب ہوا تو قرا خلیل نے اس کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ جنگوں کے دوران جو عیسائی گرفتار ہوتے ہیں ان میں سے بارہ چودہ سال کے قوی اور ہونہار بچوں کو منتخب کیا جائے۔ پھر ان منتخب بچوں کو اسلامی ماحول میں رکھ کر ان کی فوجی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا

جائے۔ جب یہ بچے بڑے ہو جائیں اور فوجی تربیت مکمل کر لیں تو ان کی ایک مستقل فوج قائم کر دی جائے۔ چونکہ یہ بچے اسیر ان جنگ میں سے ہوں گے اور ان کی پوری تعلیم و تربیت سلطان کے خرچ اور نگرانی میں ہو گی اس لیے یہ سلطان کے ہی وفادار رہیں گے۔ اور خان کو قرا خلیل کی یہ تجویز بہت پسند آئی، چنانچہ اس نے عیسائی اسیر ان جنگ میں سے ایک ہزار عیسائی لڑکوں کو منتخب کر کے اسلامی ماحول میں انہیں تعلیم و تربیت دینی شروع کی۔ اگلے سال اس نے ایک ہزار مزید لڑکوں کو منتخب کیا اور انہیں بھی اسی طرح اسلامی ماحول میں فوجی تعلیم و تربیت دی۔ اس طرح عثمانی فوج کی بھرتی کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جو آئندہ تین سو برس تک جاری رہا۔ جب کبھی عیسائی بچوں کی ایک ہزار کی تعداد اس سال کے جنگی قیدیوں سے پوری نہیں ہوتی تو اس کمی کو مقامی عیسائی رعایا کے بچوں سے پورا کیا جاتا۔ لیکن بعد میں سلطان محمد رابع کے دور حکومت میں ینی چری فوج کی بھرتی کا یہ نظام بدل گیا اور 1058ھ / 1648ء سے خود ینی چری کے فوجیوں اور ترکوں کے لڑکوں کو اس فوج میں داخل کیا جانے لگا اور اس کے بعد ہی یہ فوج اپنی اہمیت کھو بیٹھی۔

اور خان نے نو عمر عیسائی لڑکوں کی اسلامی ماحول میں فوجی تعلیم و تربیت کے ذریعہ جو فوج تیار کی اس کا نام ینی چری (نئی فوج) تھا۔ عربی زبان میں پہنچ کر یہ لفظ انکشاری بن گیا۔ ینی چری کے نو عمر سپاہیوں کا جب پہلا دستہ اپنی فوجی تعلیم و تربیت مکمل کر کے تیار ہوا تو اور خان نے حصول برکت کے لیے اس فوجی دستے کو حاجی بکطاش کی خدمت میں بھیجا جو اپنے زمانے کے شیخ المشائخ اور ولی کامل تھے اور اپنے زہد و تقوی کی وجہ سے دور دور تک شہرت رکھتے تھے۔ حاجی بکطاش نے اس فوج کے لیے فتح و نصرت کی دعا کی اور اس فوج کا نام ینی چری (نئی فوج) رکھا۔

سلطنت عثمانیہ کی ابتدائی تین صدیاں جو اس کے عروج و استحکام کا عہد شباب کہی جا سکتی ہیں اس دوران عثمانی حکمرانوں کو مختلف جہتوں میں جو بھی فتوحات حاصل ہوئیں وہ زیادہ تر اسی نئی فوج (ینی چری) کے زور بازو کا نتیجہ تھیں۔ جو نو عمر لڑکے اس فوج میں شمولیت کے لیے منتخب کیے جاتے تھے سب سے پہلے انہیں ایک ایسے ماحول میں رکھا جاتا تھا جہاں وہ خود بخود اسلام کی طرف مائل ہوتے جائیں اور پھر اس کی تعلیمات سے متاثر ہو کر حلقہ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ ان نو عمر لڑکوں کو اسلام قبول کر لینے کے بعد خاص طور پر سلطان کی نگرانی میں رکھا جاتا۔ انہیں بنیادی تعلیم کے ساتھ فن حرب کی اعلی تعلیم دی جاتی اور ان کی فوجی تربیت میں حد درجہ سختی برتی جاتی۔ اس سخت تربیت کا نتیجہ یہ ہوتا کہ یہ فوجی ہر قسم کے شدائد اور سخت حالات کو آسانی کے ساتھ برداشت کر لیتے تھے۔ چونکہ جنگ میں قید ہو جانے کے ساتھ ہی ان کا رابطہ اپنے والدین، وطن اور مذہب سے ٹوٹ جاتا تھا اور نو عمری کے سبب ان میں اس کا احساس بھی باقی نہیں رہ پاتا تھا۔ اس لیے فوج میں داخل ہونے کے بعد ان کی تمام تر امیدیں سلطان کی اطاعت، دولت عثمانیہ کی خدمت اور مذہب اسلام کی حمایت سے وابستہ ہو جاتی تھیں، اس لیے یہی ان کی زندگی کا نصب العین بن جاتا اور وہ ہمیشہ پوری طرح سلطان کے وفادار رہتے۔ سلطان کو بھی ان پر مکمل بھروسہ اور اعتماد رہتا تھا اور وہ ہمیشہ ان کو انعام و اکرام سے نوازتا رہتا تھا۔

اور خان کے زمانے میں اس کے بھائی اور وزیر علاء الدین خان کی اصلاحات عثمانی حکومت کے استحکام میں نہایت معاون اور مفید ثابت ہوئیں۔ اسی زمانے میں عثمانی فوج کے دیگر تنخواہ دار، جاگیر دار پیادہ و سوار فوجی دستے تشکیل پائے، جنہوں نے باہم مل کر عثمانی فوجوں کو

آئندہ ایک لمبے زمانے تک لیے نا قابل تسخیر بنا دیا۔ عثمانی حکومت کے استحکام میں اس کی فوجی طاقت کے علاوہ جس چیز نے اہم اور کلیدی رول ادا کیا وہ یہ کہ اس حکومت کے شروع کے حکمرانوں نے صرف فتوحات کے حصول کو ہی اپنا مقصد نہیں بنایا بلکہ انہوں نے یہ پالیسی بنائی کہ جو بھی علاقہ فتح ہو تو قبضے کے فوراً بعد ہی اس کے اندرونی نظم ونسق پر توجہ دی جائے، اس طرح وہ علاقوں کو صرف فتح نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے آئین اور ضوابط کے مطابق ان کی تنظیم کر کے عثمانی سلطنت کا حصہ بنالیا کرتے تھے۔ اور شاید ابتدائی عثمانی حکمرانوں کی یہی پالیسی ان کی حکومت کے زیادہ طویل عرصے تک قائم رہنے میں مددگار بنی۔

اورخان کے بعد اس کا لڑکا مراد اول (791ھ 1389/ء-760ھ 1359/ء) عثمانی سلطنت کا وارث ہوا، وہ بھی اپنے باپ کی طرح انتہائی بہادر تھا۔ اس نے اپنے تیس سالہ دور حکومت میں نہ صرف یہ کہ سلطنت عثمانیہ کو مزید مستحکم بنیادیں فراہم کیں بلکہ عثمانی علاقوں کو اورخان کے مقابلے پانچ گنا مزید وسعت دی۔ البتہ درمیان میں ایک ایسا موقع بھی آیا جب عثمانی حکمراں بایزید یلدرم (جو اپنی شجاعت اور بہادری میں بے مثال تھا) کو وسطی ایشیا کے امیر تیمور کے ہاتھوں نہ صرف شکست ہوئی بلکہ وہ قید بھی ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ اب عثمانی سلطنت کا سورج غروب ہو جائے گا لیکن بہت جلد اس کے لڑکے محمد اوّل نے اپنی کھوئی ہوئی سلطنت حاصل کر لی اور ایک بار پھر عثمانی علاقوں کو منظم کر لیا۔ اسی لیے سلطان محمد اول کو سلطنت عثمانیہ کا دوسرا بانی بھی کہا جاتا ہے۔ بعد میں اس کے لڑکے مراد ثانی (855ھ 1451/ء-824ھ 1421/ء) اور پھر محمد فاتح (886ھ 1481/ء-855ھ 1451/ء) نے عثمانی سلطنت کو وہ عروج بخشا جو پہلے کبھی اسے حاصل نہ ہوا تھا۔

1.10 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- خلاصہ یہ کہ تاتاریوں کے وسطی ایشیا اور مسلم دنیا پر حملوں کے نتیجے میں خراسان و دیگر علاقوں سے جو ترک قبائل بے گھر ہونے پر مجبور ہوئے تھے انہیں میں سے ایک چھوٹا سا قبیلہ ایشیائے کوچک میں وارد ہوا۔ ترکوں کی روایتی بہادری اور کچھ ان کے مقدر نے ان کا ساتھ دیا۔ منگولوں کے خلاف انگورا کی جنگ میں سلطان علاء الدین سلجوقی کا ساتھ دینے اور اسے فاتح بنانے کے نتیجے میں اس کے سردار ارطغرل کو جو چھوٹی سی جاگیر بازنطینی سلطنت کی سرحد پر ملی۔
- اس کے جانشینوں نے اس چھوٹی سے جاگیر کو اپنے تدبر، حسن انتظام اور بے مثال شجاعت و بہادری سے ایک وسیع و عریض سلطنت میں بدل دیا جو اپنے پہلے حکمراں عثماں خاں کے نام پر عثمانی سلطنت کہلاتی ہے اور جس کا ستارہ تین سو برس تک مسلسل عروج پر رہا اور جس نے اپنے عہد زوال میں بھی بار بار ایسے کارنامے انجام دیے کہ زوال کی رفتار تھم سی گئی اور اس کو ختم ہونے میں بھی تقریباً تین سو برس کا عرصہ لگ گیا۔

1.11 نمونہ امتحانی سوالات

1.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. کس عباسی خلیفہ نے فوج میں ترکوں کی بھرتی بڑے پیمانے پر کی؟

(a). معتصم باللہ (b). ہارون رشید (c). مامون رشید (d). مستعصم باللہ

2. عثمانی سلطنت کا بانی کون ہے؟

(a). عثمان خاں (b). اور خاں (c). محمد اول (d). مراد ثانی

3. عثمانی سلطنت کے بانی کے بعد کس نے پایہ تخت سنبھالا؟

(a). عثمان خاں (b). اور خاں (c). محمد اول (d). مراد ثانی

4. اور خاں نے حکومت سنبھالنے کے بعد کس کو اپنا پایہ تخت بنایا؟

(a). بروصہ (b). قسطنطنیہ (c). بغداد (d). دمشق

5. عثمانی سکے کس کے عہد میں جاری ہوئے؟

(a). اور خاں (b). عثمان خاں (c). محمد فاتح (d). بایزید اول

6. ینی چری فوج کا قیام کس بادشاہ کے عہد میں ہوا؟

(a). اور خاں (b). محمد فاتح (c). مراد اول (d). بایزید اول

7. ینی چری فوج کی اسلامی ماحول میں فوجی تعلیم و تربیت کے ذریعہ جو فوج تیار کی وہ کن لڑکوں پر مشتمل ہوتی تھی؟

(a). نوعمر عیسائی (b). نوعمر مسلم (c). نوعمر سکھ (d). نوعمر یہودی

8. کس وزیر کی اصلاحات عثمانی حکومت کے استحکام میں نہایت معاون اور مفید ثابت ہوئیں؟

(a). علاء الدین خان (b). احمد توفیق پاشا (c). حاجی پاشا (d). نظام الدین احمد پاشا

9. اور خاں کے بعد عثمانی سلطنت کا وارث کون ہوا؟

(a). مراد اول (b). بایزید اول (c). محمد اول (d). سب غلط

10. اور خاں اور وزیر علاء الدین کے درمیان کیا رشتہ تھا؟

(a). بھائی (b). چچا (c). دادا (d). ماموں

1.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. ترکوں میں اشاعت اسلام پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. مسلم دنیا میں ترکوں کے عروج کا جائزہ لیجیے۔
3. ینی چری فوج پر اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔
4. دارالخلافہ بغداد میں ترکوں کی تاریخ پر روشنی ڈالیے۔
5. بانی سلطنت امیر عثمان خاں کا جائزہ لیجیے۔

1.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. عثمانی ترکوں کے تاریخی پس منظر کو بیان کیجیے۔
2. عثمانی حکومت کے قیام واستحکام پر ایک مضمون لکھیے۔
3. عثمانی حکومت کے استحکام میں اورخاں اور اس کے وزیر بھائی علاء الدین خاں کی اصلاحات کا جائزہ لیجیے۔

1.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.	ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ (جلد دوم)	:	ثروت صولت، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی
2.	آل عثمان	:	مولانا اسلم جیراج پوری، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی
3.	دولت عثمانیہ (جلد اول، دوم)	:	ڈاکٹر محمد عزیر، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
4.	تاریخ ملت (جلد سوم)	:	مفتی زین العابدین سجاد میرٹھی ومفتی انتظام اللہ شہابی، ادارہ اسلامیات، کراچی، پاکستان
5.	مسلمانوں کا عروج اور زوال	:	مولانا سعید احمد ایم اے۔ فیمس بکس، لاہور

اکائی 2: عثمانی حکومت کے اہم حکمراں (حصہ اول)

اکائی کے اجزا:

2.0 تمہید

2.1 مقاصد

2.2 محمد فاتح

2.3 قسطنطنیہ

2.3.1 اسباب

2.3.2 قسطنطنیہ پر حملے کی تیاریاں

2.3.3 قسطنطین کی حکمت عملی

2.3.4 مغربی یورپ کی سرد مہری

2.3.5 محاصرہ

2.3.6 فتح قسطنطنیہ کے اثرات

2.3.7 دیگر فتوحات

2.3.8 فوجی قابلیت

2.3.9 نظم مملکت

2.4 اکتسابی نتائج

2.5 نمونہ امتحانی سوالات

2.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

2.5.1 مختصر جوابات کے حامل سوالات

2.5.2 طویل جوابات کے حامل سوالات

2.0 تمہید

عثمانی سلطنت میں محمد فاتح ایک عظیم حکمراں گزرا ہے جس نے اپنے کارناموں کی وجہ سے اپنے سے پہلے سلاطین پر سبقت لے گیا۔ محمد فاتح کا سب سے بڑا کارنامہ قسطنطنیہ کی فتح ہے۔ سلطان محمد فاتح کا دور وسیع و عریض رقبہ اور فتوحات کی وجہ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ محمد فاتح نے اپنے زمانے میں بحری قوت میں اضافہ کیا کیوں کہ سلطنت کے دونوں طرف سمندر تھا اور بحری قوت کے بغیر سلطنت کو قائم رکھنا مشکل ہو جاتا۔ عثمانی سلطنت میں محمد فاتح پہلا بادشاہ ہے جس کو پوری دنیا میں شہرت حاصل ہوئی، اس سے پہلے کے عثمانی سلاطین نے اپنی سلطنت کو وہ وسعت نہیں دے پائے جو محمد فاتح نے کیا۔ محمد فاتح صرف فتوحات کی وجہ سے شہرت نہیں رکھتا ہے بلکہ اس نے اس علاقوں میں انتظام سلطنت اور حیرت انگیز قابلیت کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ محمد فاتح انتظامی صلاحیتوں میں اپنے اجداد پر بازی لے گیا۔ علوم وفنون کا بھی سرپرست تھا اور سلطنت میں کثرت سے مسجدیں، مدرسے اور شفاخانے عوام کو راحت پہنچانے کے لیے بنوائے۔ اس نے پہلی بار سلطنت عثمانیہ کے لیے باقاعدہ قوانین مرتب کیا۔

2.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ یہ جان سکیں کہ عثمانی سلطان محمد فاتح نے اپنے دور میں کیا کارنامے انجام دیے۔ قسطنطنیہ جیسے عظیم شہر کو فتح کرنے کے لیے اس نے کس طریقے کی حکمت عملی اختیار کی اور فتح حاصل کرنے کے بعد شہر والوں کے ساتھ کیسا رویہ رکھا۔ ان سب باتوں سے آپ کو واقفیت حاصل ہو گی۔

2.2 محمد فاتح

سلطان محمد ثانی جو کہ سلطان محمد فاتح کے نام سے مشہور ہوئے۔ 30/ مارچ 1429ء کو ایڈرین میں پیدا ہوئے، فاتح اور ابوالخیر کے لقب سے معروف ہوئے۔ اپنے والد کی وفات کے بعد بائیس سال کی عمر میں ساتویں عثمانی سلطان کی حیثیت سے آپ نے تخت سنبھالا۔ تخت سنبھالتے ہی سلطان محمد فاتح نے اپنے چھوٹے شیر خوار بھائی کو فتنہ اور حکومت کے دعویدار کے خوف سے حوض میں غرق کروادیا۔ سلطان مراد خاں ثانی کی وفات کے وقت وہ ایشیائے کوچک میں تھا۔ وفات کی خبر سن کر وہ ادرنہ پہنچا جہاں تخت نشینی کی رسم ادا کی گئی، باپ کی زندگی میں دو مرتبہ تخت پر بیٹھ چکا تھا لیکن حالات نے ساتھ نہ دیا اور مجبوراً تخت سے دستبردار ہونا پڑا اور دونوں بار باپ نے واپس آکر معاملے کو رفع دفع کیا۔ پہلی بار ہونیاڈے اور لارڈ سلاس کی وعدہ خلافی سامنے آئی اور دوسری بار ینی چری فوج نے بغاوت کی۔ اسی وجہ سے سماج میں یہ تاثر پھیل گیا تھا کہ محمد فاتح کے اندر ملک چلانے کی صلاحیت موجود نہیں ہے حالانکہ اس سے پہلے دونوں بار محمد کی عمر کم تھی لیکن تیسری بار جب

بائیس سال کی عمر میں تخت سنبھالا تو محمد فاتح کی شخصیت نکھر چکی تھی۔ سلطان محمد ثانی عثمانی حکومت کا ساتواں بادشاہ تھا۔ سلطان محمد فاتح کے اندر قوت اور عدل دونوں خوبیاں ایک ساتھ تھیں۔ مختلف علوم وفنون میں اس کو اپنے ہم عمر لوگوں میں بچپن سے ہی برتری حاصل تھی۔ مختلف زبانوں میں مہارت رکھتے ہوئے محمد فاتح کو تاریخی کتب کے مطالعہ بینی کا خاص شوق تھا۔ آپ کا عہد مسلمانوں کے لیے خیر وفلاح اور عزت ومرتبہ کا سبب رہا۔ آپ بے مثال شخصیت کے حامل تھے، محمد فاتح نے اپنے عہد میں وہی پالیسی اپنائی جو ان کے آباء واجداد نے اپنائی تھی۔ تخت سنبھالنے کے بعد مختلف تنظیمی اداروں کی از سر نو ابتدا کی اور مالی معاملات کو بہتر بنانے کی طرف خاص دھیان دیا۔ آمدنی اور اخراجات کا اس طریقے سے بندوبست کیا کہ فضول خرچی کی گنجائش نہیں رہ گئی۔ فوج کی اصلاحات کی طرف بھی توجہ دی اور اس کے اندر پائی جانے والی کمزوریوں کا ازالہ کیا اور فوجوں کے مشاہرہ میں اضافہ کیا، ان کے رجسٹر بنائے گیے اور فوجوں کو نئے اسلحے سے آراستہ کیا گیا۔ فوجی نظام میں سخت قوانین بنائے گیے اور اس نظام میں کوتاہی ہونے پر لوگوں کو نوکری سے ہاتھ دھونا پڑا۔ سلطان محمد فاتح نے اس کے بعد دربار شاہی کی طرف خصوصی توجہ مبذول کی اور دربار شاہی میں جو کمیاں تھیں اس کو دور کیا۔ غرض جب ملک کے داخلی امور کی طرف سے اطمینان حاصل ہو گیا تو اس نے فتوحات اور عثمانی حکومت کو وسعت دینے کی طرف اپنی توجہ دی۔

2.3 قسطنطنیہ

قسطنطنیہ دنیا کے اہم ترین شہروں میں شامل تھا اور پوری دنیا میں اس شہر کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔ مسلمان اس شہر کو شروعاتی دور سے ہی فتح کرنا چاہتے تھے اس کی وجہ تھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی موقعوں پر اس شہر کو فتح کی بشارت سنائی تھی۔ اس لیے اسلامی تاریخ کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ کئی خلیفہ اور اسلامی لشکر اس شہر کو فتح کرنے کی کوشش کرتے رہے تا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو بشارت تھی وہ ان کے حق میں حاصل ہو مسند امام احمد بن حنبل کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’قسطنطنیہ جس شخص کے ہاتھ پر فتح ہو گا وہ امیر بہترین امیر ہو گا اور وہ لشکر بہترین لشکر ہو گا‘‘۔ (مسند احمد)

اس شہر پر فتح حاصل کرنے کی جدوجہد اسلامی تاریخ کے شروعاتی دور میں ہی شروع ہو چکی تھی۔ حضرت امیر معاویہ نے 668ء میں ایک لشکر تیار کر کے قسطنطنیہ کی طرف روانہ کیا۔ جس میں بڑے بڑے صحابہ کرام نے شرکت کی، اس لشکر کی قیادت یزید بن معاویہ نے کی بعض کے نزدیک حضرت سفیان بن عوفؓ نے کی۔ مدینے میں آپؐ کی میزبانی کا شرف حاصل کرنے والے حضرت ابوایوب انصاریؓ بھی اس مہم میں شامل تھے، آپ کو شہادت حاصل ہوئی اور آج بھی آپ کا مزار استنبول میں موجود ہے۔ اس جنگ میں مسلمان فوج قسطنطنیہ شہر پر اپنا تسلط قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ دوسری کوشش اموی خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے اپنے بھائی مسلمہ بن عبدالملک کو لشکر دے کر بھیجا۔ اس وقت شہنشاہ لیوسوم کی حکمرانی تھی جس نے اپنی دوراندیشی اور اتحادی فوج کی حکمت عملی سے مسلمانوں کا یہ خواب اس بار بھی نہ پورا ہو سکا۔ عثمانی سلطنت میں سلطان بایزید اول نے قسطنطنیہ پر چڑھائی کی لیکن چند روز ہی محاصرے کو ہوئے تھے کہ تیموری حملے نے بایزید کو مجبور کیا کہ وہ دفاعی پوزیشن اختیار کرے، جنگ انگورہ ہوئی اور اس کے سبب قسطنطنیہ کچھ دنوں کے لیے محفوظ ومامون ہو گیا۔ اس کے بعد عثمانی سلطان مراد ثانی نے قسطنطنیہ کو فتح کرنے کا عزم کیا لیکن یہ مہم بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ بالآخر یہ قسطنطنیہ کو فتح کرنے کا اعزاز

سلطان محمد فاتح کو حاصل ہوا اور اس طرح مسلمانوں کے دیرینہ خواب کی تکمیل ہوئی۔

2.3.1 اسباب

محمد دوم کے تخت سنبھالنے سے تین سال پہلے بازنطینی سلطنت کا آخری بادشاہ و بارہواں قسطنطین قسطنطنیہ کا سنبھال چکا تھا۔ وہ ایک بہادر بادشاہ تھا لیکن محمد دوم کو غصہ دلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جس کا خمیازہ اس کو بھگتنا پڑا۔ سلطان بایزید یلدرم کا ایک پوتا اور خان نامی جو سلیمان کی اولاد میں سے تھا اس کو قسطنطنیہ میں محبوس کیا گیا تھا اور اس کے مصارف عثمانی سلطان ادا کرتے تھے۔ بازنطینی بادشاہ قسطنطین نے اس رقم کو بڑھانے کے لیے کہا اور دھمکی بھی دی کہ قبول نہ کرنے کی صورت میں اور خاں کو محمد کے مدمقابل لا کھڑا کرے گا۔ قسطنطین کو اس کا احساس نہ تھا کہ اب محمد فاتح کے اندر تبدیلیاں آچکی ہیں اور وہ پہلے جیسا محمد نہیں رہ گیا ہے بلکہ اس نے اپنی کمیوں کو مضبوطی میں تبدیل کر کے تخت سنبھالا ہے۔ جس وقت قسطنطین کا یہ پیغام محمد فاتح کو موصول ہوا تو اس وقت محمد ایشیائے کوچک کی بغاوتوں کو ختم کرنے میں مشغول تھا اس لیے بازنطینی سفراء کو نرمی سے جواب دے کر لوٹا دیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ عہد بھی کیا کہ جب تک صلیبی سلطنت کا خاتمہ نہیں ہو گا اس وقت تک عثمانی سلطنت کو وجود خطرے میں گھرا رہے گا۔ وزیر اعظم خلیل پاشا نے سفراء کو اس بیوقوفانہ تقاضے کے اندیشے سے ان کو آگاہ کیا اور کہا: ''تمہارا جنون قسطنطنیہ کو سلطان کے ہاتھ میں دے کر رہے گا، یورپ میں اور خان کے سلطان ہونے کا اعلان کرو، اہل ہنگری کو اپنی مدد کے لیے بلاؤ، جو صوبے تم واپس لے سکتے ہو واپس لے لو لیکن بہت جلد تم کو بازنطینی سلطنت کا خاتمہ نظر آئے گا''(ص95)

2.3.2 قسطنطنیہ پر حملے کی تیاریاں

محمد فاتح نے قسطنطنیہ کی جانب پیش قدمی سے پہلے سوچا کہ ملک کے اندر جو بغاوتیں ہیں اس کو ختم کر کے اطمینان حاصل کر لیا جائے پھر یکسوئی کے ساتھ قسطنطنیہ پر حملہ کرے۔ اس لیے اس نے پہلے ایشیائے کوچک کی بغاوت کا خاتمہ کیا اور کرمانیہ کے امیر سے صلح کی صرف صلح ہی نہ کی بلکہ اس کی لڑکی سے شادی کر کے اپنے رشتے کو اور مضبوط کیا۔ اس کے بعد ہونیاڈے سے تین سال کے عرصے کے لیے صلح کر لی۔ جب شمالی یورپ کی طرف سے مکمل اطمینان ہو گیا تو محمد نے ایک فوجی دستہ موریا میں بھیج دیا تاکہ قسطنطین کے بھائی جو اس علاقے میں حکومت کرتے تھے ضرورت پڑنے پر مدد نہ کر سکیں۔ اس طرح کی حکمت عملی سے جب سکون ہو گیا تو محمد نے آبنائے باسفورس کے یورپی ساحل جو قسطنطنیہ سے پانچ کلو میٹر کی دوری پر تھا وہاں پر زبردست قلعے کی تعمیر شروع کروادی۔ یہ قلعہ بایزید کے بنوائے ہوئے قلعے کے بالکل سامنے تھا۔ قسطنطین نے اس قلعہ کی تعمیر کو لے کر مخالفت شروع کی لیکن اس کا کوئی اثر محمد پر نہ ہوا۔ اس تعمیر کے دوران ہی ترکوں اور یونانی کاشت کاروں کے بیچ جھڑپ ہوئی اور یہ جھڑپ ایک لڑائی کی صورت میں بدل گئی۔ جس میں کچھ سپاہی مارے گئے، قسطنطین ان سازشوں کو سمجھ چکا تھا اور اندازہ کر لیا کہ ساری تیاریاں قسطنطنیہ پر حملے کی ہو رہی ہے۔ جس سے اس نے ڈر کر شہر کا دروازہ بند کر دیا اور اپنے سفیر کے ذریعے محمد ثانی کے پاس ترک سپاہیوں کے رویہ کی شکایت کی، محمد نے اس شکایت کے جواب میں جنگ کا اعلان کر دیا۔

جو قلعہ محمد ثانی تیار کروا رہا تھا وہ ٹھنڈک کے موسم آنے سے پہلے تیار ہو گیا۔ آبنائے باسفورس کا علاقہ اب ترک قوم کی دسترس میں تھا

اور کوئی جہاز اس علاقے سے ان کی مرضی کے بغیر نہیں نکل سکتا تھا۔ قلعہ بننے کے بعد محمد دوسری تیاریوں میں مشغول ہو گیا۔ محمد نے ادرنہ میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ فوج اکٹھا کی۔ قسطنطنیہ کی فتح کے لیے فوج کی تعداد میں اضافہ ہی کافی نہ تھا کیوں کہ یہ شہر مثلث نما تھا دو طرف سے پانی تھا، شمال میں شاخ زریں اور جنوب میں بحر ِمامور تھا۔ زمینی فوجیں صرف تیسری طرف سے حملہ کر سکتی تھی جو پچھم کی جانب تھا لیکن اس طرف ایک کے بعد ایک تین مضبوط دیواریں اس شہر کی حفاظت کر رہی تھی۔ یہ دیواریں جب تک توپ کی ایجاد نہیں ہوئی تھی وہ ہر لحاظ سے محفوظ تصور کی جاتی تھی۔ اندر کی دونوں دیواریں بہت موٹی تھیں اور ان پر ایک سو ستر فٹ کی دوری سے برج بنے ہوئے تھے۔ دونوں دیواروں کے درمیان ساٹھ فٹ کی دوری تھی باہر کی طرف دوسری اور تیسری دیوار کے وسط میں ساٹھ فٹ چوڑی خندق بھی تھی جو سو فٹ گہری تھی۔ ان دیواروں کو پانچویں صدی عیسوی میں بادشاہ تھیوڈوسیس ثانی نے بنوایا تھا اور ان دیواروں کی مدد سے ہی اکیس بار دشمن کو مجبور ہونا پڑا اور ہر بار قسطنطنیہ محفوظ رہا۔

قسطنطنیہ کو فتح کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ان دیواروں کو کمزور کیا جائے۔ جب سے جنگ میں توپوں کا استعمال شروع ہوا تو اس بات کی گنجائش نکلی دیواروں پر گولہ باری کر کے اس کو کمزور کیا جائے۔ عثمانی حکومت اب جنگ میں توپوں کا استعمال شروع کر چکی تھی۔ اس وقت جو توپیں رائج تھیں اس کو محمد نے ناکارہ سمجھتے ہوئے نئی توپیں بنوائی۔ جو بہت بڑی تھیں، اس کو اربان نامی ایک عیسائی انجینئر جو ہنگری سے تعلق رکھتا تھا اس نے ایک بڑی توپ ڈھالی، اس کے علاوہ اس نے اور کئی چھوٹی توپیں بنوائیں جو چھوٹی تھی لیکن زیادہ تیزی سے گولے برسانے کی قوت تھی۔ اس کے علاوہ محمد نے ایک سو اسی جہازوں کا بیڑہ بھی تیار کروایا۔ وہ اس جنگ کی تیاریوں میں بہت مصروف تھا اور اس کے لیے ساری تیاریاں اپنی دیکھ ریکھ میں کر رہا تھا۔

2.3.3 قسطنطین کی حکمت عملی

دوسری طرف قسطنطین اپنے دفاع کی تیاریوں میں بے حد منہمک تھا، اس نے دیواروں کی مرمت کروائی اور جو کچھ مدد ہو سکتی تھی اس کو پہنچایا گیا۔ پھر قسطنطین نے مغربی یورپ کے سلاطین سے گزارش کی اور اس نے پادری کی مدد حاصل کرنے کے لیے کلیسائے رومہ کے تمام مطالبات کو قبول کر کے یونانی کلیسا کو اس جوڑ دیا۔ سینٹ صوفیا میں پوپ کے نمائندہ کارڈینل اسیڈور کے صدارت میں ایک بیٹھک ہوئی جس میں شہنشاہ، دربار کے لوگ اور شہر کے مذہبی عہدے دار بھی شریک ہوئے، جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ کلیسائے رومہ اور کلیسائے قسطنطنیہ کو متحد کیا جائے۔ اس فیصلے نے یونان کی پادریوں کے اندر بے زاری پیدا کر دی اور شہر کی عوام کے ایک بڑے طبقے نے اس فیصلے سے اپنی براَت کا اعلان کیا۔ دونوں کلیساؤں کے درمیان پہلے سے عداوت چلی آرہی تھی وہ بھی اس نزاکت بھرے ماحول میں کم نہ ہوئی۔ اسی بابت گرانڈ ڈیوک نوٹاراس جو فوج کا سپہ سالار اور قسطنطین کے بعد سلطنت میں سب سے بڑی شخصیت تھی وہ اس قدر برہم ہوا کہ اور کہا: ”کارڈینل کی ٹوپی کے مقابلے میں قسطنطنیہ میں ترکوں کے عمامے دیکھنا مجھے زیادہ گوارا ہے۔“ جس کے بعد یونانیوں میں بذات خود دو گروپ بن گیے۔ ایک گروپ ان کو مدد دینا چاہتا تھا اور دوسرا گروپ بالکل بھی مدد فراہم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ آخر میں ہم دیکھتے ہیں کہ قسطنطین کی تائید کرنے کے لیے صرف چھ ہزار لوگ ہی اپنی خدمات دے پائے۔ ص98-99

2.3.4 مغربی یورپ کی سرد مہری

قسطنطین نے مغربی یورپ سے اس جنگ میں حصہ لینے کی درخواست کی، جو کسی حد تک کامیاب بھی رہے۔ یہاں سے سپاہیوں کی ایک تعداد اور مالی مدد کے ساتھ کارڈینل اسیڈور کے ساتھ بھیجی گئی۔ اٹلی اور اسپین نے بھی اپنے یہاں سے فوجی دستے بھیجے۔ وینس اور اسپین کے صوبے کٹالونیا اور اراگن نے بھی اپنی امداد بھیجی۔ سب سے بڑی مدد اہل جنوا نے کی اور اپنے مشہور کمانڈر جان چسٹینانی کو دو جنگی جہازوں اور سات سو بہادروں کے ساتھ بھیجا۔ جان چسٹینانی کو اپنی بہادری پر بہت ناز تھا اور اس نے جنگ کے دوران اپنی طاقت کے جلوے بھی دکھائے اور ایسی جاں نثاری کا مظاہرہ کیا کہ محمد نے بذات خود جنگ میں اس کی قابلیت کی تعریف کی اور فرمایا: "کاش یہ شخص میرے فوجی سرداروں میں ہوتا۔" قسطنطین کی مدد کی درخواست کے بعد بھی پورے مغربی یورپ سے صرف تین ہزار فوج کی تعداد ہی اس جنگ میں شریک ہو سکی۔ حیرت ہے کہ قسطنطین کی گزارش کا کوئی زیادہ اثر فرانس، جرمنی، ہنگری اور پولینڈ پر نہ ہوا۔ اس سے پہلی کی جنگوں کو دیکھا جائے تو مسیحی اتحاد کو بنا کر فوجیں ترکوں کو یورپ سے نکالنے اور آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے پوری مذہبی ولولہ کے ساتھ شامل ہوتی تھیں لیکن اس آخری اور فیصلہ کن جنگ میں ان ملکوں کی طرف سے اس سرد مہری کا مظاہرہ حیرت انگیز تھا۔

2.3.5 محاصرہ

سلطان محمد اس جنگ کے لیے نوے ہزار فوج کو لے کر ادرنہ سے آگے بڑھا۔ 6 / اپریل 1453 کو محاصرے کی شروعات ہوئی۔ اس محاصرے میں جس طرح سے یونانیوں نے بہادری اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا وہ قابل تعریف ہے۔ بری فوج ابھی کوئی بہتر کارکردگی نہ کر پائی تھی کہ اپریل میں ہی چھوٹی سی بحری جنگ ہوئی۔ ایک یونانی اور چار جنوی جہاز قسطنطنیہ کی مدد کے لیے سازوسامان لا رہے تھے اور انہوں نے جب آبنائے باسفورس میں قدم رکھا تو دیکھا کہ عثمانی فوج کی 140 کشتیاں ان کے راستے میں رکاوٹ ہیں۔ جس وقت جنوی اور یونانی جہاز بندرگاہ کے پاس پہنچے تو ترکی بیڑے نے دھاوا بول دیا لیکن جنوی جہاز بلند اور بہت طاقت ور تھے اور انہوں نے عثمانی کشتیوں پر آگ اور پتھر برسانا شروع کر دیا جس سے عثمانی فوج میں بدنظمی پیدا ہو گئی اور اس بدنظمی میں تعداد کی وجہ سے اور اضافہ ہوا۔ ساحل پر کھڑا ہوا سلطان اس منظر کا نظارہ کر رہا تھا جس سے صبر نہ ہوا اور اس نے اپنے گھوڑے کو سمندر میں اتار دیا لیکن ترکی بیڑہ اس وقت تک اتنا منتشر ہو چکا تھا کہ ان جہازوں کو نکل جانے کا راستہ مل گیا۔

جنوی جہاز کی اس شاندار کامیابی سے محصورین کی حوصلہ افزائی ہوئی اور ان لوگوں میں مدافعت کا حوصلہ پیدا ہو گیا حالانکہ یہ جوش و جذبہ کافی نہ تھا۔ کیوں کے اس کے بعد ایک بھی رسد ان لوگوں تک نہیں پہنچ سکی۔ دوسری محمد نے بھی ان غلطیوں سے سبق سیکھا اور حکمت عملی یہ اپنائی کہ خشکی میں باسفورس اور قسطنطنیہ بندرگاہ کے مابین پانچ میل کا فاصلہ ہے وہاں اس نے لکڑی کے تختوں کی ایک سڑک بنوائی اور ان تختوں کو چربی سے خوب چکنا کروایا۔ اس کے بعد بیلوں کی مدد سے 80 کشتیاں بندرگاہ کے اس حصہ میں پہنچا دیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آبنائے باسفورس کے علاقے میں پانی زیادہ تھا اور وہاں ترکی فوج عیسائیوں کے طاقت ور مقابلے میں زیادہ دیر تک مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس تدبیر سے قسطنطنیہ کا یہ علاقہ بھی حملے سے متاثر ہوا جس کے جواب میں قسطنطین کو ایک فوجی دستہ اس علاقے میں متعین کرنا پڑا۔

اس کے علاوہ شہر کے دوسرے حصوں میں مسلسل حملے جاری تھے لیکن ان مضبوط دیواروں پر ان کا اثر زیادہ نہ ہوا جو ایک ہزار سال سے اس شہر کی حفاظت کر رہی تھی۔ آخر کار سات ہفتوں کی لگاتار محنت کے بعد تین جگہ دیوار میں سوراخ ہوا تو فوج کو کامیابی کا یقین ہونے لگا۔ محمد نے قسطنطین کے پاس پیغام بھیجا کہ:"اگر وہ شہر سپرد کر دے تو رعایا کی جان ومال سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا اور موریا کی حکومت اسے دے دی جائے گی لیکن قسطنطین نے اس کو نامنظور کیا۔"اس کے بعد محمد نے فوج میں یہ اعلان کر دیا کہ 29/مئی 1453ء کو آخری حملہ ہو گا۔ اس رات ترک فوج نے عبادت میں گزاری اور صبح فجر کے بعد حملے کی شروعات ہوئی۔ حملہ چوطرفہ تھا لیکن سب سے زوردار حملہ سینٹ رومانس کی طرف تھا کیوں کہ وہاں پر ترک فوج اپنے حملے سے ان جگہوں کی دیواروں کے اکثر حصوں کو چوٹ پہنچا چکے تھے۔ رومیوں نے نہایت ہی بہادری کے ساتھ دفاع کیا۔ عثمانی فوج کی تعداد زیادہ ہونے کے باوجود بھی دوپہر تک فوج کا ایک بھی شخص شہر میں داخل نہیں ہو سکا۔ محمد نے بھی عزم واستقلال کا مظاہرہ کیا اور ابتدائی ناکامیوں سے ہمت نہ ہاری بلکہ بذات خود ینی چری فوج کو لے کر آگے بڑھا۔ یونانی اس وقت تک تھک چکے تھے اور اس تازہ دم فوج کو روکنا مشکل تھا۔ اسی درمیان جسٹینانی کو ایک گہرہ زخم لگا، جسٹینانی جس نے مدافعت میں ایک اہم رول ادا کیا۔ زخمی ہونے کے بعد اس نے جنگ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ایسے مشکل وقت میں جسٹینانی کا فوج سے الگ ہو جانا ایک طرح سے شہر کو محمد کو حوالے کرنا جیسا تھا۔ قسطنطین نے لاکھ کوشش کی اس کو دوبارہ میدان جنگ لایا جائے لیکن وہ بندرگاہ میں چلا گیا، اس کے جاتے ہی فوج کمزور نظر آنے لگی بالآخر قسطنطین نے اپنے ہاتھ میں کمان سنبھالی، مگر ینی چری فوج کا حملہ اتنا سخت تھا کہ قسطنطین اور اس کی فوج اس کی تاب نہ لا سکی۔ ینی چری کا سردار آغا حسن اپنے تیس ساتھیوں کے ساتھ دیوار پر چڑھ گیا، حالانکہ آغا حسن اور اس کے اٹھارہ ساتھیوں کو مار دیا گیا لیکن ان کے باقی ساتھیوں کو کامیابی ملی اور ترک فوج کو اندر جانے کا راستہ مل گیا۔ قسطنطین اپنی سرخ عبا جو امتیازی پوشاک تھی اس کو اتار کر ترک فوج کی پیش قدمی کے طوفان میں داخل ہو گیا۔ آخر اس جاں باز سپاہی نے لڑتے ہوئے اور اپنے ملک کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیا۔

فصیل توپ کے گولوں کی قوت برداشت نہ کر سکی اور ٹوٹ گئی اس کے بعد ترک فوج کشتیوں سے نکل کر شہر میں داخل ہونے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے قسطنطنیہ شہر ترک فوجوں سے بھر گیا، شروعاتی دور فوج نے جیت کی خوشی میں قتل عام شروع کر دیا لیکن جیسے ہی خوشی کا جوش سرد ہوا اور یہ دیکھا کہ شہر والوں کی طرف سے کوئی مزاحمت نہیں ہو رہی ہے تو ترک فوجوں نے اپنی تلواروں کو نیام میں رکھ لیا۔ ظہر کے وقت سلطان محمد فاتح اپنے لوگوں کے ساتھ شہر میں داخل ہوا۔ مشہور کنیسہ ایا صوفیہ کے پاس پہنچ کر اذان دلوائی اور ظہر کی نماز پڑھی۔

قسطنطنیہ پر فتح حاصل کرنے کی سلطان محمد فاتح کا رویہ جو شہریوں کے ساتھ تھا وہ قابل تعریف تھا۔ ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا گیا اور ان لوگوں کو مذہبی آزادی دی گئی یہاں تک کہ ان کے مذہبی رہنما کو دینی معاملات طے کرنے کا اختیار دیا گیا۔ حالانکہ قرون وسطی کی جنگ کا اگر جائزہ لیا جائے تو فاتح کس طریقے کا سلوک روا رکھتے تھے اور ظلم کی ایسی ہولناک سزائیں دی جاتی تھیں کہ تخیل میں بھی بمشکل آئیں۔ اس کے مقابلے میں ترکوں نے داخلے کے وقت جو کچھ کیا وہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس موقعے پر ایورسلے اپنی کتاب " The Trurkish Empire its Growth and Decay" میں لکھتے ہیں:

"اگرچہ سلطان اور اس کے سپاہیوں نے بہت سے مظالم کیے اور یونانیوں کی پوری جماعت پر سخت مصیبت ٹوٹ پڑی تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فتح قسطنطنیہ کے موقع پر ویسی نفرت انگیز بدمستیوں کا مظاہرہ ہوا جیسا 1204ء میں دیکھا گیا تھا جب کہ محاربین صلیبی نے اس پر قبضہ کیا تھا، داخلہ کے شروعاتی کچھ گھنٹوں کے بعد کوئی بڑے پیمانے پر قتل عام نہیں ہوا، آتش زنی بھی زیادہ نہیں ہوئی، سلطان نے گرجاؤں اور دوسری عمارتوں کو محفوظ رکھنے میں پوری کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب بھی رہا۔ اگرچہ سلطان اپنے کچھ کاموں میں سب سے زیادہ سفاک تھا، لیکن اس نے دوسرے معاملے میں قابل ذکر دور اندیشی اور مدبرانہ صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ اس کی ابتدائی کاروائیوں میں سے ایک، شہر کو ختم کرنے کے بعد خود کو یونانی چرچ کے محافظ کے طور پر اعلان کرنا تھا۔ اس چرچ کے ممبران کو یہ حق دیا گیا تھا جس میں دارالحکومت کے کچھ گرجاگھروں کو اس کے استعمال کو محفوظ بنایا گیا تھا، اور ان میں مذہبی رسومات کو اسی طرح ادا کرنے کی اجازت دی گئی جس طریقے سے وہ کرتے تھے۔ اس نے انہیں سول معاملات میں خود مختاری کی بھی آزادی دی۔ اس نے ان کے شادی اور جائیداد کی جانشینی کے قوانین کو تسلیم کیا اور ان کو نافذ کرنے کے لیے پیٹریارک اور کلیسائی عدالتوں کو دائرہ اختیار دیا۔"

2.3.6 فتح قسطنطنیہ کے اثرات

قسطنطنیہ کی جیت کی خبر پوری دنیا میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ اس شہر کی فتح پر جشن منائے گیے اور ہر سلطان و بادشاہ نے محمد فاتح کو اس فتح کی خوش خبری دی۔ فتح حاصل کرنے کے بعد سلطان محمد فاتح نے حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مزار پر ایک جامع مسجد بنوائی جو جامع ایوب کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس وقت سے یہ اصول ہو گیا کہ تخت نشینی کے وقت ہر سلطان اس مسجد میں جا کر عثمان کی تلوار حمائل کرتا تھا اور اس جشن کو تاج پوشی کے قائم مقام سمجھا جاتا تھا۔ قسطنطنیہ کی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے سلطان محمد نے اس شہر کو دارالخلافہ بنایا۔ کیوں کہ قسطنطنیہ کی فتح عثمان خاں کے خواب کی تعبیر تھی، قسطنطنیہ ہی وہ شہر ہے جس کا نگینہ عثمان خان پہننا چاہتا تھا بالآخر محمد فاتح نے اس خواب کو شرمندہ تعبیر کیا۔

قسطنطنیہ شہر یورپ میں اسلامی تعلیمات کے فروغ میں بہت بڑی رکاوٹ کا سبب تھا۔ اس فتح کو اہم ترین واقعات میں شمار کیا جاتا ہے۔ مغربی دنیا بھی اس فتح سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور خوف وہراس کی لہر دوڑ گئی۔ روما میں پوپ کی سربراہی میں ایک میٹنگ منعقد کی گئی جس میں شامل تمام ملکوں کے افراد نے عہد کیا کہ وہ اس معاملے میں پوری مدد کریں گے اور دشمن کے خلاف پورے وسائل کا استعمال کریں گے۔ امید تھی کہ یہ معاہدہ اپنے انجام کو پہنچتا لیکن پوپ کا انتقال ہو گیا۔ اس طرح یہ کوشش ناکام ہو گئی۔ اس کے علاوہ مشرق کی اسلامی سلطنتوں کا جائزہ لیں تو ایشیا سے افریقہ کے لوگوں میں خوشی کی انتہا نہ رہی۔ کیوں کہ یہ جیت ان کے آباء واجداد کا سنہرا خواب تھا جس کی تکمیل محمد فاتح کے ہاتھوں ہوئی۔

2.3.7 دیگر فتوحات

قسطنطنیہ کی فتح محمد فاتح کا سب سے بڑا کارنامہ ہے اور اسی وجہ سے ان کا لقب فاتح پڑا۔ ہم محمد فاتح کا عہد کا مطالعہ کریں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ قسطنطنیہ کی فتح ان کی فتوحات کی پہلی کڑی تھی، ان کا تیس سالہ دور سلطنت کی توسیع میں گزرا اور پورا وقت کم و بیش میدان جنگ میں

ہی گزارا۔ بوسنیا اور موریا جو پہلے کے سلاطین میں معاون ریاستیں بن چکی تھیں سلطان نے ان علاقوں کو جنگ کر کے دوبارہ حاصل کیا۔ سربیا کے بادشاہ کی وفات ہوئی تو سلطان نے اس علاقہ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ پھر سلطان محمد نے بلغراد کی طرف توجہ دی، بلغراد کی فتح کے لیے محمد کے پاس تین لاکھ فوجیں اور تین سو توپیں تھیں۔ بلغراد اس وقت تک ہنگری کے قبضہ میں تھا اور بلغراد سے ہنگری کی فتح کا راستہ نکلتا تھا۔ محمد بلغراد پہنچ کر فوراً محاصرہ کر لیا جس سے یورپ کے ملکوں میں ایک بھگدڑ سی مچ گئی اور پوپ نے ساٹھ ہزار پر جوش مجاہدوں کا دستہ روانہ کیا۔ جنرل ہونیاڈے سے محمد کا سخت مقابلہ ہوا، آٹھ دنوں تک جنگ کا بازار گرم رہا اس کے بعد سلطان محمد نے عام حملے کا حکم دیا جس میں ترک فوج شہر میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئی لیکن ابھی شہر کو کنٹرول نہ کر پائے تھے کہ عیسائی فوج کے حملے نے ان کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ عثمانی دستے کو منتشر ہوتا دیکھ کر محمد نے خود کمان سنبھالی اور دشمنوں کی صفوں میں داخل ہو گیا لیکن اس کی بہادری بھی ترک فوجوں کے قدم کو نہ روک سکی اور اس کو بھی جنگ کے میدان سے راہ فرار اختیار کرنا پڑی۔ اس جنگ میں پچیس ہزار ترک فوجوں کو جان گنوانی پڑی، ترکی توپ خانوں پر عیسائی فوجوں نے قبضہ کر لیا۔ مجبوراً محاصرے کو ختم کر دیا گیا اور بلغراد کی جیت جو ہنگری کے لیے فائدے مند ثابت ہو سکتی تھی وہ ملتوی کر دی گئی۔

محمود پاشا صدر اعظم نے سرویا کے علاقے میں دو سال کے اندر اپنی جیت درج کر لی۔ اس بات کی امید تھی کہ سلطان پھر سے خراج قبول کر کے ان کو خود مختار ریاست رہنے دیتا۔ جارج برنیکو ویچ کے انتقال کے بعد خاندان میں لڑائیاں شروع ہو گئیں اور آخر میں چھوٹے لڑکے لازار نے بیس ہزار طلائی سکے سالانہ خراج دے کر سلطان کی سرپرستی قبول کر لی لیکن سلطان کا دوسرے سال انتقال ہو گیا۔ جس کے بعد سلطان نے یہ فیصلہ کیا کہ سرویا کو عثمانی سلطنت کا حصہ بنالیا جائے۔ سرویا کی لوگوں کو روکنے کی طاقت نہ تھی، چنانچہ سرویا کے امراء نے محمود اعظم کے بھائی کو اپنا سردار مقرر کیا۔

بوسنیا کے لوگ کلیسائے رومہ کے ظلم سے تنگ آچکے تھے اور ان لوگوں نے ترکوں کو اپنے لیے نجات کا سبب سمجھا۔ شاہ بوسنیا کی سرزنش کے لیے محمود پاشا کی فوج بڑھی کیوں کہ شاہ بوسنیا نے خراج دینا بند کر دیا تھا۔ یہ فوج فاتحانہ بوسنیا میں داخل ہوتی رہی اور بادشاہ کے پاس جب طاقت نہ رہی تو اس نے جان بخشی کے عوض میں ہتھیار ڈال دیے لیکن محمد نے اس کا پاس ولحاظ نہ کیا اور قتل کروادیا، اس طریقے سے یہ حصہ بھی عثمانی سلطنت کا حصہ بن گیا۔

موریا میں خاندان پلیولوگس کی حکومت دن بہ دن تنزلی کی طرف گامزن تھی، طامس اور دمتریس نے خراج دینے کا وعدہ کر کے اپنی آزاد ریاست کو قائم کر رکھا تھا۔ سلطان محمد کو جب بلغراد میں فتح نہیں ملی تو یہاں کے سلطان نے بھی عثمانیوں کی بالادستی کو تسلیم نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے نے گویا بغاوت کا اعلان کر دیا تو محمد فاتح ایک بڑی فوج کے ساتھ خود موریا پہنچا اور وہاں کے تمام علاقوں کو فتح کر کے عثمانی سلطنت کا حصہ بنالیا۔

کرمانیہ کا علاقہ ابھی تک سلطنت عثمانیہ کا حصہ نہیں تھا اور ان دونوں میں بہت پرانی دشمنی چلی آرہی تھی۔ حالانکہ محمد کے تخت سنبھالنے کے بعد کرمانیہ کے امیر نے خراج ادا کرنے کا وعدہ کر کے سلطان سے صلح کر لی تھی لیکن ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹوں میں خانہ

جنگی شروع ہو گئی۔ محمد نے سب کو بر طرف کر کے کرمانیہ کو بھی عثمانی حکومت میں ضم کر دیا۔

قسطنطنیہ کی فتح حاصل کرنے کے بعد کریمیا کی فتح کرنا محمد کا اہم کارنامہ شمار کیا جاتا ہے۔ اس فتح کا سہرا مشہور عثمانی سپہ سالار صدر اعظم احمد کدک پاشا کو جاتا ہے۔ کریمیا کے محل وقوع ایسا ہے کہ قسطنطنیہ پر جیت حاصل کرنے کے بعد یہ علاقہ عثمانیوں کے لیے اور اہم ہو گیا۔ احمد کدک نے چالیس ہزار فوج اور جنگی بیڑے کی مدد سے فتح حاصل کی۔ ان علاقوں کے علاوہ محمد نے ولاچیا، البانیا، وینس وغیرہ علاقے پر فتح حاصل کی۔

تیس سال حکومت کرنے کے بعد اکیاون سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس نے ایک اور مہم کے لیے ایک بڑی فوج جمع کی تھی، لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے مقاصد اور ارادے کیا ہیں، چاہے روڈز پر ایک اور حملہ، یا کینڈیا پر حملہ، یا کلابریا میں اپنی کامیابی کی پیروی کرنا، اس کا راز اس کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ وہ پہلا سلطان تھا جسے قسطنطنیہ کی مشہور مسجد میں دفن کیا گیا جو اس نے وہاں بنائی تھی۔

2.3.8 فوجی قابلیت

سلطان محمد فاتح اپنے عہد میں شروع سے آخر تک میدان جنگ میں ہی رہا۔ فاتح کا لقب اسے قسطنطنیہ حاصل کرنے کے بعد ہی مل چکا تھا لیکن اس کی ہر ایک جنگ اس بات کی شاہد ہے، غور کریں جنگی میدان میں سلطان محمد کی خدمات مراد ثانی سے بھی زیادہ ہے۔ اس کی خاصیت یہ تھی کہ وہ اپنے ارادوں کا ظاہر نہیں کرتا تھا اور کمانڈروں کو بھی علم نہ ہوتا کہ حملہ کس طرف ہونے والا ہے۔ ایک بار فوجیں جمع کی جا رہی تھیں تو کسی فوجی افسر نے سوال کیا کہ کون سا ملک یا علاقہ پیش نظر ہے۔ تو محمد نے جواب دیا: ”اگر میری داڑھی کے ایک بال کو بھی اس کی اطلاع ہو جائے تو میں اسے توڑ کر آگ میں ڈال دوں“ محمد فاتح جنگ کی پالیسی میں رازداری اور تیز رفتاری کو ضروری سمجھتا تھا اور پوری طاقت کے ساتھ دشمن پر حملہ کرتا۔ سلطان کی بہادری کا یہ عالم تھا کہ وہ جنگوں میں بذات خود داخل ہو جاتا۔ اس کی فوجی لیاقت احمد کدک پاشا اور محمود پاشا جیسے جنرلوں کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا اور وہ جنگی فہم و ذکاء میں اس کی قابلیت کو تسلیم کرتے تھے۔ (دولت عثمانیہ۔ ص 121)

2.3.9 نظم مملکت

محمد ثانی نے اور خان اور ان کے اسلاف نے جو نظام قائم کیا تھا اس کو جاری رکھا۔ لیکن بعد میں سلطان نے وقت کی ضرورتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اس میں اصلاحات کیں اور آئین سلطنت مرتب کیا اور بحیثیت واضع قانون وہ سلاطین عثمانیہ میں الگ شناخت رکھتا ہے۔ محمد فاتح کی شہرت اس وجہ سے بھی ہے کہ اس نے سلطنت عثمانیہ کے لیے باقاعدہ طور پر قانون مرتب کیا اور بعد کے عثمانی سلاطین اسی پر عمل پیرا ہوتے رہے۔ قانون نامہ میں سلطان نے سلطنت کو ایک خیمہ بتایا ہے جو چار ستونوں پر قائم ہے۔ 1-وزرائے سلطنت: عثمانی حکومت میں سب سے بڑا عہدے دار چار وزیر ہوتے اور اس جماعت کا صدر وزیر اعظم سلطنت ہوتا تھا۔ 2-قضاۃ عسکر: اس کا تقرر علماء کی جماعت سے کیا جاتا تھا۔ محمد کے عہد میں دو قاضی عسکر منتخب ہوتے تھے ایک یورپ کی عدالتوں کا صدر ہوتا جس کو قاضی عسکر رومیلیا کہا جاتا اور دوسرا ایشیا کی عدالتوں کا جو قاضی عسکر اناطولیہ کہا جاتا تھا۔ 3-دفتر دار (خازن): ان کے ذمہ مالی امور تھا جو تمام مالی معاملات کے جواب دہ ہوتا تھا۔ 4-نشانچی (معتمد سلطنت) ان کے ذمہ سرکاری دستاویزوں کے تیار کرنے اور ان پر سلطان کی مہر لگانا ہوتا تھا۔

2.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- سلطان محمد ثانی جو کہ سلطان محمد فاتح کے نام سے مشہور ہوئے۔30 / مارچ1429ء کوایڈرین میں پیدا ہوئے، فاتح اور ابوالخیر کے لقب سے معروف ہوئے۔ اپنے والد کی وفات کے بعد بائیس سال کی عمر میں ساتویں عثمانی سلطان کی حیثیت سے آپ نے تخت سنبھالا۔ تخت سنبھالتے ہی سلطان محمد فاتح نے اپنے چھوٹے شیر خوار بھائی کو فتنہ اور حکومت کے دعویدار کے خوف سے حوض میں غرق کروادیا۔ سلطان مراد خاں ثانی کی وفات کے وقت وہ ایشیائے کوچک میں تھا۔ وفات کی خبر سن کر وہ ادرنہ پہنچا جہاں تخت نشینی کی رسم ادا کی گئی، باپ کی زندگی میں دو مرتبہ تخت پر بیٹھ چکا تھا لیکن حالات نے ساتھ نہ دیا اور مجبوراً تخت سے دستبردار ہونا پڑا اور دونوں بار باپ نے واپس آکر معاملے کو رفع دفع کیا۔
- محمد فاتح نے قسطنطنیہ کی جانب پیش قدمی سے پہلے سوچا کہ ملک کے اندر جو بغاوتیں ہیں پہلے اس کو ختم کر کے اطمینان حاصل کرلیا جائے پھر یکسوئی کے ساتھ قسطنطنیہ پر حملہ کرے۔ اس لیے اس نے پہلے ایشیائے کوچک کو بغاوت کو ختم کیا اور کرمانیہ کے امیر سے صلح کی صرف صلح ہی نہ کی بلکہ اس کی لڑکی سے شادی کر کے اپنے رشتے کو اور مضبوط کیا۔ اس کے بعد ہونیاڈے سے تین سال کے عرصے کے لیے صلح کرلی۔ جب شمالی یورپ کی طرف سے مکمل اطمینان ہو گیا تو محمد نے ایک فوجی دستہ موریا میں بھیج دیا تاکہ قسطنطین کے بھائی جو اس علاقے میں حکومت کرتے تھے ضرورت پڑنے پر مدد نہ کرسکیں۔
- قسطنطنیہ کی جیت کی خبر پوری دنیا میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ اس شہر کی فتح پر جشن منائے گیے اور ہر سلطان و بادشاہ نے محمد فاتح کو اس فتح کی خوش خبری دی۔ فتح حاصل کرنے کے بعد سلطان محمد فاتح نے حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مزار پر ایک جامع مسجد بنوائی جو جامع ایوب کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس وقت سے یہ اصول ہو گیا کہ تخت نشینی کے وقت ہر سلطان اس مسجد میں جاکر عثمان کی تلوار حمائل کرتا تھا اور اس جشن کو تاج پوشی کے قائم مقام سمجھا جاتا تھا۔
- قسطنطنیہ کی فتح محمد فاتح کا سب سے بڑا کارنامہ ہے اور اسی وجہ سے ان کا لقب فاتح پڑا۔ ہم محمد فاتح کا عہد کا مطالعہ کریں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ قسطنطنیہ کی فتح ان کی فتوحات کی پہلی کڑی تھی، ان کا تیس سالہ دور سلطنت کی توسیع میں گزرا اور پورا وقت کم و بیش میدان جنگ میں ہی گزارا۔ بوسنیا اور موریا جو پہلے کی سلاطین میں معاون ریاستیں بن چکی تھیں سلطان نے ان علاقوں کو جنگ کر کے دوبارہ حاصل کیا۔

2.5 نمونہ امتحانی سوالات

2.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. قسطنطنیہ کو کس نے فتح کیا؟

(a). محمد ثانی (b). بایزید یلدرم (c). اورخان (d). عثمان خان

2. محمد فاتح نے کتنے سال کی عمر میں تخت کو سنبھالا؟

(a). 22سال (b). پچیس سال (c). پچاس سال (d). سب غلط

3. سلطان محمد دوم کو کون سا لقب عطا کیا گیا؟

(a). محمد فاتح (b). ارطغرل (c). محمد عثمان (d). سب صحیح

4. ساتویں عثمانی سلطان کی حیثیت سے کس نے تخت سنبھالا؟

(a). محمد ثانی (b). بایزید یلدرم (c). اورخان (d). سلیم اول

5. قسطنطنیہ کی فتح کے وقت وہاں کا بادشاہ کون تھا؟

(a). قسطنطین (b). اعظم احمد کدک پاشا (c). محمود پاشا (d). سب صحیح

6. کس سال قسطنطنیہ پر فتح حاصل ہوئی؟

(a). 1453ء (b). 1522ء (c). 1250ء (d). 1501ء

7. قسطنطنیہ کی فتح کے وقت ینی چری کا سردار کون تھا؟

(a). آغا حسن (b). اورخان (c). محمود پاشا (d). ارطغرل

8. قسطنطنیہ میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مزار پر کس نے جامع مسجد بنوائی؟

(a). محمد فاتح (b). اورخان (c). علاء الدین (d). سلیم اول

9. وہ کون سا پہلا سلطان ہے جسے قسطنطنیہ کی مشہور مسجد میں دفن کیا گیا؟

(a). محمد فاتح (b). بایزید اول (c). محمد اول (d). سلیم اول

10. سلطنت عثمانیہ کے لیے باقاعدہ طور پر کس نے قانون مرتب کیا؟

(a). محمد فاتح (b). بایزید اول (c). محمد اول (d). اورخان

2.5.1 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. قسطنطنیہ کی تاریخ پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. قسطنطنیہ پر حملے کے اسباب بیان کیجیے۔
3. قسطنطنیہ پر حملے کی تیاریوں کا جائزہ لیجیے۔
4. محمد فاتح کی فوجی قابلیت پر روشنی ڈالیے۔

5. محمد فاتح کی نظم مملکت پر مضمون لکھیے۔

2.5.2 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. محمد فاتح کے عہد کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
2. قسطنطنیہ کے محاصرہ پر روشنی ڈالیے۔
3. محمد فاتح کی دیگر فتوحات پر مضمون لکھیے۔

2.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

---

1. دولت عثمانیہ، مرتبہ عزیز احمد، معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ، 2009
2. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ (جلد دوم)، ثروت صولت، مکتبہ جدید پریس، لاہور، 2014
3. تاریخ اسلام (جلد سوم)، شاہ اکبر نجیب آبادی، مکتبہ خلیل لاہور، 2004
4. تاریخ ملت (جلد سوم)، تالیف مفتی زین العابدین، مفتی انتظام اللہ شہابی، ادارہ اسلامیات، پبلشرز لاہور، 1991
5. سلطنت عثمانیہ، ڈاکٹر علی محمد الصلابی، مترجم علامہ محمد ظفر اقبال کلیار، گائیڈنس پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، نئی دہلی 2021
6. The Turkish Empire Its Growth and Decay, Lord Eversley, London T. Fisher Unwin LTD. A Delphi Terrace 1918.

اکائی 3: عثمانی حکومت اہم حکمراں (حصہ دوم)

اکائی کے اجزا:

3.0 تمہید
3.1 مقاصد
3.2 سلیم اول
3.2.1 سلیم اور شاہ اسماعیل
3.2.2 جنگ چالدران
3.2.3 فتح مصر
3.2.4 خلافت
3.3 سلیمان اعظم
3.3.1 بلغراد کی فتح
3.3.2 روڈس کی فتح
3.3.3 ہنگری کی فتح
3.3.4 ویانا کا محاصرہ
3.3.5 ایران کی مہم
3.3.6 خیر الدین باربروسہ
3.3.7 سلیمان کی وفات
3.3.8 قوانین میں اصلاح
3.4 اکتسابی نتائج
3.5 نمونہ امتحانی سوالات

3.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

3.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

3.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

3.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

3.0 تمہید

سلطان محمد ثانی کے بعد بایزید ثانی کا عہد بہت پر سکون رہا۔ اس دور میں عثمانی سلطنت میں مزید اضافہ نہیں ہوا لیکن ان کے ولی عہدوں نے عثمانی سلطنت کو تھوڑے ہی وقفے میں طاقتور سلطنت بنا دیا۔ بایزید ثانی کے بعد سلیم اول نے تخت سنبھالا، یہ عہد عثمانی سلطنت میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس سے پہلے کی سلاطین نے یورپ کی طرف زیادہ توجہ دی اور مشرق کی طرف ان کا بہت کم جھکاؤ رہا لیکن سلیم نے یورپ کے بجائے مشرق کی طرف رخ کیا۔ مصر میں مملوکوں سے جنگ جیتنے کے بعد اس نے اپنے لیے خلیفہ کا لقب اختیار کیا۔ سلیم کے بعد اس کا لڑکا سلیمان اعظم نے تخت سنبھالا، اس دور میں سلطنت عثمانیہ اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی ۔ عثمانی سلطنت کا سب سے بڑا اور اہم حکمراں گزرا ہے۔ یورپ والے سلیمان اعظم کو ذی شان کے لقب سے یاد کرتے تھے لیکن ترک والے سلیمان قانونی کہنا پسند کرتے ہیں۔

3.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ یہ جان سکیں عثمانی سلطنت کیسے خلافت میں تبدیل ہوئی، سلیم اول نے کس طرح سے اپنی حکومت عثمانی خلافت کو استحکام پہنچایا اور کس طریقے سے ایران، مصر و شام کو فتح کر کے عثمانی سلطنت حصہ بنایا۔ اس اکائی میں آپ سلیمان اعظم کے بارے میں جانیں گے کیسے انہوں نے ان علاقوں کو فتح کیا جس کو محمد فاتح جیسا لیڈر بھی فتح نہیں کر پایا تھا۔ سلیمان اعظم کے دور میں عثمانی بحری اور بری طاقتوں میں کس طرح اضافہ ہوا، ان سب کے بارے میں آپ تفصیل سے جانیں گے۔

3.2 سلیم اول

سلیم اول نے 1512ء میں بایزید ثانی کی جگہ تخت کو سنبھالا، اس کے دونوں بھائی احمد اور کرکود تخت کے حریف تھے لیکن ظاہری طور پر انہوں نے سلیم کی اطاعت کی اور درپردہ اپنی حکومت قائم کرنے کی کوششیں شروع کر دی۔ سلیم کو اپنے بھائیوں کی طرف سے اطمینان حاصل نہ ہوا اور سلطنت سنبھالے چند روز ہی گزرے تھے کہ احمد نے اماسیا میں بغاوت کر دی اور بروصہ پر قابض ہو گیا۔ سلطان سلیم نے فوراً پیچھا کیا لیکن احمد بروصہ چھوڑ کر فرار ہو گیا اور اپنے دونوں بیٹوں کو صفوی بادشاہ شاہ اسماعیل کے پاس مدد کے لیے ایران بھیجا۔ سلیم بروصہ پر قابض ہو گیا اور احمد اپنی جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ ان ساری صورتحال کو دیکھتے ہی شہزادہ کرکود کو بھی خطرہ نظر آنے لگا

اور اس نے اپنی زندگی بچانے کے لیے ینی چری فوج کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کی۔ سلیم کو اس تیاری کا پتہ چلا تو شکار کے بہانے سے دس ہزار فوج لے کر کرکود کے علاقے میں داخل ہوا اور کرکود کو گرفتار کرنا چاہا۔ اس نے راہ فرار اختیار کی لیکن جلد ہی وہ پکڑا گیا۔ سلیم نے اسے قتل کرنے کا حکم دیا لیکن کرکود نے ایک گھنٹے کی مہلت مانگی اور کرکود نے اس وقفے میں سلطان سلیم کے ظلم کی مذمت کرتے ہوئے ایک نظم لکھی جس کو بعد میں سلیم پڑھ کر روتا رہا اور تدفین کا حکم دیا۔ شہزادہ احمد جس نے بروصہ سے نکلنے میں کامیابی حاصل کرلی اس نے فوج اکٹھا کر کے سلیم سے مقابلہ کیا، شروعاتی دور میں کامیاب بھی رہا لیکن یہ جنگ جیت نہ سکا اور اس کو بھی ہلاک کر دیا گیا۔ اندرونی خانہ جنگی کی طرف سے جب مکمل اطمینان حاصل ہو گیا تو سلیم نے ایران کی طرف توجہ دی۔

3.2.1 سلیم اور شاہ اسماعیل

شاہ اسماعیل صفوی نے ایران میں اپنی حکومت قائم کی اور تبریز کو اپنا مرکز بنایا۔ ان کے ارادے تھے کہ عثمانیوں کی طاقت کو کمزور کر کے ان کے علاقوں میں اپنا اثر ورسوخ بڑھا سکے۔ غرض ایران کی فتوحات کا سلسلہ اتنا طویل ہو گیا کہ دونوں سلطنتوں کی سرحدیں مل گئیں۔ دونوں سلاطین بہادری میں بے مثال تھے۔ جس سے سرحدی لڑائیاں وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی تھی۔ شاہ اسماعیل اور سلیم میں جنگوں کے کئی اسباب تھے۔ شاہ اسماعیل نے شہزادہ احمد کو سلیم کے خلاف فوجی مدد فراہم کی۔ اس کے علاوہ باغی عثمانی شہزادوں کو پناہ دے رکھی تھی۔ مصر اور ایران میں عثمانیوں کے خلاف لڑائی کے لیے معاہدہ ہوا تھا۔ شیعہ اور سنی کی مخالفت کو ہوا دی گئی، عثمانی سلطنت میں شیعوں کی ایک اچھی خاصی تعداد آباد تھی، شاہ اسماعیل کے کارندے اناطولیہ میں شیعیت کی تعلیم کو فروغ دے تھے اور ساتھ ساتھ سلطان سلیم کے خلاف لوگوں کو متنفر کر رہے تھے۔ شاہ اسماعیل کی ان سب حرکتوں کا سلیم کو علم ہوا تو اس نے پہلے یورپ کی مختلف حکومتوں سے صلح ناموں کی تجدید کی اور مشرق کی طرف متوجہ ہوا۔ شاہ اسماعیل شہزادہ مراد کو پناہ دینے کے بعد سلطان سلیم کو تخت سے اتار کر شہزادہ مراد کو بیٹھانے کی بات علی الاعلان کہہ رہا تھا۔ سلیم کو جب اطلاع ہوئی تو اس نے ایران پر حملہ کرنے کا تہیہ کر لیا۔

3.2.2 جنگ چالدران

عثمانی فوجیں ینی شہر کے میدان میں اکٹھا کی گئیں اور 1514ء کو ایک لاکھ چالیس ہزار اور تین سو توپوں کے ساتھ ایران کے دارالسلطنت تبریز کی جانب روانہ ہوئی۔ تبریز کی دوری تقریباً ایک ہزار میل تھی، پر خطر پہاڑی والا راستہ تھا، سامان رسد لے جانے کی مشکلات تھی۔ سلطان سلیم جب ایران کی سرحد پر پہنچا تو شاہ اسماعیل نے مقابلہ کرنے کے بجائے پورے علاقوں کو ویران کر دیا اور تبریز کی طرف لوٹ گیا جس سے عثمانی فوج کے لیے مشکلات پیدا ہو گئیں۔ فوج طویل سفر کر کے تھک چکی تھی جس سے فوج میں بغاوت شروع ہو گئی اور گھر واپس جانے کا مطالبہ ہونے لگا۔ اس نازک وقت میں سلیم نے بہادری اور حکمت عملی سے فوج کو بے قابو نہ ہونے دیا۔ سلطان سلیم اپنی فوج کے ساتھ جب تبریز پہنچا تو مجبوراً شاہ اسماعیل کو میدان میں آنا پڑا۔ دونوں فوج وادی چالدران میں صف آراء ہوئیں، ابتدائی دور میں صفوی دستہ عثمانی فوج پر حاوی رہا لیکن جلد ہی عثمانیوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور پلٹ کر پوری قوت سے حملہ کیا۔ عثمانی فوج نے توپ کے گولے برسانے شروع کیے تو صفوی فوج اس حملے کی تاب نہ لا سکی۔ شاہ اسماعیل بھی زخمی ہو گیا اور بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب

ہوا۔ 1514ء میں سلطان سلیم فتح کے بعد تبریز میں داخل ہوا اور آٹھ دن وہاں قیام کیا۔ سلیم کی خواہش تھی کہ پورا ایران کو فتح کر کے صفوی حکومت کا خاتمہ کر دے لیکن فوج نے آگے بڑھنے سے منع کر دیا تو سلیم کو بادل ناخواستہ واپس ہونا پڑا۔

3.2.3 فتح مصر

ایران میں فتح حاصل کرنے کے بعد سلیم شام اور مصر کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ ملک ڈھائی سو سال تک مملوکوں کے زیر حکومت تھا، اس وقت یہاں کا حاکم قانصوہ غوری تھا۔ کردستان اور دیار بکر کے عثمانی اور شامی مقبوضات ایک دوسرے سے مل گیے۔ قانصوہ غوری نے 1516ء میں ایک فوج شام کی طرف متعین کر دی تا کہ ترک فوجوں کی کارکردگی کا علم ہو سکے۔ سنان پاشا اس علاقے میں ترکی سپہ سالار تھا اس نے ساری صورتحال سے سلیم کو آگاہ کیا۔ سلیم نے شام کے علاقے میں چڑھائی کر دی، سلیم نے قانصوہ غوری کے پاس ایلچی بھیجا اور ایلچی کو بھیجتے ہی خود بھی فوج کے ساتھ شام کا رخ کیا۔ سلیم کا ایلچی جب پہنچا تو قانصوہ غوری اس وقت حلب میں مقیم تھا اس نے ایلچی کو قید خانے میں ڈال دیا۔ عثمانی لشکر جیسے ہی شام کی سرحد میں پہنچی تو قانصوہ غوری کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے فوراً ایلچی کو آزاد کر دیا اور صلح کا پیغام بھیجا لیکن بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ 24/اگست 1516ء کو مرج دابق کے میدان میں معرکہ پیش آیا جس نے شام کا فیصلہ کر دیا۔ مملوکوں نے بڑی بہادری کے ساتھ ترکوں کا مقابلہ کیا لیکن مملوکوں کے پاس بھی توپ نہ تھی اور عثمانی فوج نے توپ کی مدد سے ان کو زیادہ دیر تک میدان میں ٹھہرنے نہیں دیا۔ قانصوہ غوری نے موقع کو دیکھ کر بھاگنے میں عافیت سمجھی لیکن بھگدڑ میں دب کر مر گیا۔ سلطان سلیم فاتحانہ حلب میں داخل ہوا تو اہل شہر نے وفاداری کا عہد لیا۔ حلب کی جامع مسجد میں داخل ہوا تو خطبے میں اس کا نام شامل کیا گیا اور خطیب مسجد نے "خادم الحرمین الشریفین" کا خطاب دیا اور سلطان سلیم خوش ہو کر جو حلہ پہنا ہوا تھا اتار کر خطیب کو دے دیا۔

اس شکست سے مملوکیوں کے حوصلے نہیں ٹوٹے کیوں کہ وہ عثمانیوں کو اپنے برابر کا جاں باز نہیں سمجھتے تھے۔ قانصوہ غوری کی وفات کے بعد سرداران فوج قاہرہ کی طرف چلے گیے تا کہ وہاں نئے سلطان منتخب کر سکیں۔ مملوکوں میں سردار منتخب کرنے کا طریق کار یہ تھا کہ چوبیس سردار اعلی درجے کے ہوتے تھے جو ایک سلطان کی وفات کے بعد متفقہ رائے سے دوسرا سلطان منتخب کرتے۔ ایسے موقعوں پر سبھی چوبیس کا قاہرہ میں ہونا ضروری تھا۔ ان لمحوں میں سلطان سلیم کو موقع مل گیا اور شام کے تقریباً سارے علاقوں کو فتح کر لیا۔ دوسری طرف مملوکوں نے طومان بے کو اپنا سلطان منتخب کیا۔

شام پر فتح حاصل کر لینے کے بعد سلیم نے مصر کا رخ کیا۔ ادھر طومان بے بھی دفاع کا انتظام کر چکا تھا اس نے ایک فوج غزہ کی طرف بھیجی تا کہ عثمانی فوج کو روکا جا سکے اور خود قاہرہ میں رہ کر فوج کو اکٹھا کرنے میں مصروف ہوا۔ غزہ میں عثمانی اور مملوک فوج میں تصادم ہوا۔ ترکی صدر اعظم سنان پاشا کی سپہ سالاری اور ترکوں کی گولہ باری کے سامنے زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکے۔ طومان بے کو ان حالات کا علم ہوا تو اس کے جوش میں اور اضافہ ہو گیا۔ اس نے قاہرہ کے قریب ردانیہ میں فوج کو جمع کر کے ترک فوجوں کا انتظار کرنے لگا۔ حالانکہ اس جنگ میں بھی توپ خانوں کی وجہ سے ترک فوجوں کا پلہ بھاری رہا لیکن مملوک فوجوں نے جس جانبازی اور بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا وہ قابل دید ہے۔ مجبوراً طومان بے نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ میدان چھوڑنے میں عافیت سمجھی۔ سلطان سلیم جنگ کے بعد جب قاہرہ شہر میں داخل

ہوا تو طومان بے اپنی مختصر فوج کے ساتھ ہی قاہرہ پر حملہ آور ہوا۔ ان ترکوں کا خاتمہ کیا جو شہروں پر قابض ہو چکے تھے اور شہر کے اندر ایک بھی عثمانی سپاہی اس حملے سے نہ بچ سکا۔ طومان بے شہر پر قابض ہو کر گلیوں، کوچوں اور شہر کے مکانوں سے محاذ سنبھالا اور کسی بھی صورت میں سلیم کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ مجبوراً مملوک سردار خیری بے کو بلایا جو اس کی فوج میں شامل ہو چکا تھا اس سے مشورہ طلب کیا گیا۔ خیری بے نے مشورہ دیا کہ آپ اعلان کر دیں: ''جو مملوک ہتھیار رکھ دے گا اور ہمارے پاس چلا آئے گا اس کے جان و مال کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا اور اس کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کیا جائے گا۔'' اس بات کا اعلان ہوتے ہی مملوک فوجوں نے سلطان سلیم پر اعتماد کر کے تقریباً آٹھ سو مملوک سردار سلیم کے سامنے پیش ہوئے جو قاہرہ کی قوت تھے۔ سلیم نے ان سب کو قتل کرا کر قاہرہ شہر میں قتل عام کا حکم دیا اور قاہرہ کے نظم و نسق کا انتظام کیا۔

3.2.4 خلافت

مصر فتح ہو جانے کے بعد سلیم نے حجاز کی طرف توجہ دی کیوں کہ یہ علاقہ بھی مملوک سلطنت کے زیر حکومت تھا۔ سلیم کو اس بات کی بالکل امید نہ تھی یہ علاقہ بغیر جنگ و جدل کے حاصل ہو گا لیکن مصر پر عثمانیوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد حجاز کے امیر نے مکہ اور مدینہ کی کنجیاں عثمانیوں کو بھیج کر ان کی اطاعت کر لی۔ اس کے بعد اہل مکہ کے لوگوں نے بھی بیعت لی۔ خادم حرمین شریفین کے لقب سے نوازا گیا اور یہ رتبہ عثمانیوں کو چار سو سال تک حاصل رہا حالانکہ سلطان سلیم صرف تین سال تک ہی خدمت کر سکا۔ متول علی اللہ ثالث جو بنو عباس مصر کا آخری خلیفہ تھا قاہرہ سے اس کو قسطنطنیہ لے گیا۔ متوکل نے جامع آیا صوفیہ میں علماء و امرا کے سامنے خلافت کے تمام حقوق و امتیازات اس کے سپرد کر دیا۔ متوکل نے آنحضرتؐ کے تبرکات یعنی علم، تلوار اور چادر مبارک جو خلفاء کے پاس بطور نشان رکھے جاتے تھے ان سب کو سلیم کو سونپ دیا۔ اس طریقے سے خلافت عثمانیوں میں منتقل ہو گئی۔

سلطان سلیم نے آٹھ سال تک حکومت کی لیکن اس مختصر وقفے میں سلطنت عثمانیہ کے دائرے کار کو دو گنا کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ سلیم نے یورپ کے علاقوں کی طرف توجہ نہ دے کر بلکہ مشرقی ممالک فارس، کردستان، مصر، سیریا اور عرب ممالک کو اپنے مقبوضے میں شامل کیا۔ مصر سے واپس ہونے کے بعد وہ ایک جنگ کی تیاری کر رہا تھا کہ 1530ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ وہ بہترین فاتح اور اعلیٰ درجے کا سپہ سالار تھا، انتظامی صلاحیت میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا۔ اس کے انتظام ملک اور رعب کی وجہ سے اس کے عہد میں سلطنت میں بغاوت نہیں ہوئی۔

3.3 سلیمان اعظم

سیلم کے بعد اس کے اکلوتے بیٹے سلیمان نے چھبیس سال کی عمر میں تخت سنبھالا، جس نے چھیالیس سال تک حکومت کی، جس کا دور سلطنت عثمانیہ میں عروج کا دور تھا اس کی بنیادی وجہ اس کی ذاتی خوبیاں تھیں۔ سلیمان فوجی قابلیت، عملی صلاحیت اور شجاعت میں نمایاں حیثیت کا مالک تھا، انتظامی صلاحیت اور قانون سازی میں بے مثال تھا اور اس نے اپنے تمام پیشروؤں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ فتوحات اور ملک کی

وسعت سے لحاظ سے یہ عہد سب پر فوقیت لے گیا اور اپنی انتہائی حد کمال کو پہنچ گیا۔ تخت پر بیٹھنے سے پہلے وہ مختلف علاقوں کا حاکم رہ چکا تھا اور اپنی رعایا کو انصاف فراہم کرنے کے عزم کے لیے ان کو بڑی شہرت حاصل کی تھی، خواہ وہ کسی بھی نسل یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ ان کی نجی زندگی بالکل پاک وصاف تھی۔ وہ اپنی نرمی اور رحم دلی کی وجہ سے مشہور تھا۔ لیکن اس نے بھی اپنے سے پہلے عثمانی سلاطین کی طرح جو لوگ تخت کے دعویدار ہوسکتے تھے ان کو قتل کرادیا۔ سلیمان نے اپنے دو بیٹوں کا قتل کروادیا کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ وہ عثمانی تخت پر قبضہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا، مصطفیٰ، سب سے زیادہ ہونہار شہزادہ تھا۔ وہ پہلے ہی ایک صوبے کے گورنر کی حیثیت سے اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کر چکا تھے۔ وہ اپنے والد کی تمام خوبیوں سے مالا مال تھا، وہ فوج کا آئیڈیل اور اپنے ملک کی امید تھا۔ سلیمان نے اپنے عہد میں سلطنت میں بے حد اضافہ کر دیا۔

3.3.1 بلغراد کی فتح

سلیم کے آخری دور میں عثمانی سلطنت اور ہنگری کی سلطنت کے درمیان جھڑپ شروع ہوچکی تھی تو سلیمان نے ان علاقوں کو فتح کرلینا ضروری سمجھا۔ سلیمان نے ہنگری اپنا سفیر بھیجا اور خراج کا مطالبہ کیا جس پر ہنگری کے بادشاہ نے عثمانی سفیر کا قتل کروادیا۔ سلیمان کو جب یہ اطلاع ملی تو وہ فوراً فوج لے کر ہنگری کے لیے چل پڑا۔ اس شہر کے گرد محاصرہ شروع کر دیا جس شہر نے محمد فاتح کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ سات دن تک گولہ باری کرنے کے بعد سلیمان نے 1521ء کو فتح کرلیا۔ فتح کے بعد نہ قتل عام کیا گیا اور نہ ہی شہر کے لوگوں سے کوئی سوال کیا گیا۔ سلیمان نے بلغراد میں ایک ترکی دستہ مامور کیا۔ اس علاقے پر فتح حاصل کر لینے کے بعد ہنگری کو فتح کرنا اب کوئی مشکل نہ تھا اور سلیمان دارالسلطنت بوداکی طرف بڑھ سکتا تھا لیکن روڈس کی فتح کو زیادہ اہمیت دی اور بلغراد کے بعد اسی طرف سلیمان نے رخ کیا۔

3.3.2 روڈس کی فتح

روڈس کی فتح کے بھی کئی اسباب تھے ایک تو بلغراد اور روڈس کے ہی جنگ میں محمد فاتح کو شکست ہوئی تھی۔ بلغراد کی جیت نے سلیمان کا حوصلہ بڑھایا اور اس نے سوچا کہ سلطنت عثمانیہ پر روڈس کی شکست کا جو داغ ہے اس کو ختم کیا جائے۔ اس کے علاوہ بحر روم میں روڈس کے جہاز اناطولیہ کے ساحلوں پر قتل وغارت مچائے ہوئے تھے اور قسطنطنیہ کے شام سے تعلقات قائم ہونے کے بعد ان علاقوں میں روڈس کے جہازراں بہت دشواری پیدا کر رہے تھے۔ انہی اسباب کی بنا پر سلیمان نے روڈس کو بھی سلطنت عثمانیہ کا حصہ بنانے کا ارادہ کر لیا۔ تین سو جہازوں کا بیڑہ روڈس کی طرف بھیجا اور ایک لاکھ فوج کے ساتھ مغربی ساحل کی طرف اپنا قدم بڑھایا۔ 1522ء کو سلیمان روڈس کے ساحل پر اترا اور محاصرہ شروع کر دیا۔ تقریباً پانچ مہینہ تک محاصرہ چلا اور وہاں کے لوگوں نے بڑی ہمت کے ساتھ دفاع کیا لیکن محاصرین کی قوت سے مجبور ہو کر ان لوگوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ سلیمان نے ان کو اجازت دی کہ بارہ دن کے اندر اپنے تمام ساز وسامان لے کر روڈس سے چلے جائیں اور ضرورت پڑے تو عثمانی جہاز کا بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ سلیمان نے رعایا بننے پر ان لوگوں کو پوری مذہبی آزادی دی اور یہ وعدہ کیا کہ ان کے کلیساؤں سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔

3.3.3 ہنگری کی فتح

سلیمان نے ہنگری کو فتح کرنے کی مہم شروع کی اس کی وجہ یہ تھی کہ شاہ ہنگری نے ایران سے عثمانیوں کے خلاف جارحانہ اور مدافعانہ اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی، انہی اسباب کی بنا پر سلیمان نے ہنگری کو فتح کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک لاکھ لشکر اور تین سو توپوں کے ساتھ قسطنطنیہ سے روانہ ہوا اور پانچ ماہ بعد موہاکز کے میدان میں ہنگری کی فوج سے جنگ ہوئی۔ ترک لشکر کو زیادہ تعداد اور توپ خانوں کی وجہ سے برتری حاصل رہی۔ دو گھنٹے سے ہی کم وقت میں ہنگری کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ شاہ لوئی نے بھاگتے ہوئے دریا میں کود کر اپنی جان دے دی۔ سلیمان نے دارالسلطنت بودا پہنچا تو شہر کے لوگوں نے دروازے کھول دیے اور لوگوں نے سلیمان کی خدمت میں حاضر ہو کر اطاعت قبول کی۔ ہنگری کے بعض علاقوں میں ترکی دستے متعین کر کے قسطنطنیہ چلا گیا۔

3.3.4 ویانا کا محاصرہ

شہنشاہ چارلس پنجم جو آسٹریا کا شہنشاہ تھا اور یورپ کا سب سے بڑا بادشاہ تھا۔ نیدرلینڈ، اسپین، جرمنی اور سسلی کا تن تنہا مالک تھا۔ سلیمان نے جب ویانا کا گھیراؤ کیا تو چارلس اٹلی سے جنگ میں مشغول تھا، اس لیے عثمانی فوج کے مقابلے میں وہ کچھ مدد نہ کر سکا اور آسٹریا کو اپنی قوت پر ہی منحصر ہونا پڑا۔ محاصرہ سے پہلے یہاں کے دس لوگوں میں ایک آدمی کو فوج میں شامل کیا گیا اور آس پاس کے علاقوں سے بھی مدد لی گئی لیکن پھر بھی یہ فوج ترکوں کے مدمقابل کافی نہ تھی۔ سلیمان ویانا کی طرف برابر بڑھتا رہا، آسٹریا میں کوئی مزاحمت نہ ہوئی، اس لیے دارالسلطنت ویانا کو بچانے کی کوششیں شروع ہوئی۔ ویانا فوج کا سپہ سالار کانٹ ڈی سام جس کے ہاتھوں میں کمان تھی۔ ترک فوج کے ویانا پہنچنے سے پہلے حفاظت کے انتظام پختہ کر لیے گیے۔ عام لوگوں کو بچے، بوڑھے سب کو شہر چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ سلیمان ویانا پہنچ کر محاصرہ شروع کیا لیکن بارش کے زیادہ ہونے کی وجہ سے راستے اتنے خراب ہو گیے تھے کہ توپوں کو لے جانا مشکل ہو گیا۔ ترک فوجوں کو اب سرنگوں کو کھود کر دیوار کو منہدم کرنے کے لیے کوشش کرنی پڑی، ترکوں کی طرف سے متعدد حملے کیے گیے لیکن ساری کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ مسلسل ناکامی کی وجہ سے فوج کے اندر بھی بے زاری پیدا ہونے لگی۔ موسم کی سختی اور سامان کی قلت بھی سلیمان کے لیے حالات اور پیچیدہ بنا رہے تھے بالآخر یہ فیصلہ کیا گیا کہ پوری قوت کے ساتھ آخری حملہ کیا جائے حالانکہ سلیمان نے اس سے پہلے فوجیوں کے جوش کو بڑھانے کے لیے خزانہ کھول دیا اور یہ وعدہ کیا کہ جو شخص دیوار پر پہلے چڑھ جائے گا اسے انعام و کرام سے نوازا جائے گا اور بڑا عہدہ دیا جائے گا۔ ویانا کے فوجیوں نے اتنی جانبازی سے اپنا دفاع کیا کہ ترک فوجوں کے قدم شہر کی طرف بڑھنے نہ دیا۔ بادل ناخواستہ سلیمان نے اس محاصرے کو اٹھا لیا اور فوج میں واپسی کا اعلان کیا۔

تین سال کا وقفہ گذر جانے کے بعد سلیمان پھر سے ہنگری کی جانب بڑھا اور وہاں سے ویانا کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ اس دفعہ شہنشاہ چارلس نے فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں رکھی۔ قلعہ گنس کو فتح کرنے میں ترک فوج کا تقریباً تین ہفتہ خرچ ہو گیا اس کے بعد سلیمان نے ویانا کا ارادہ ترک کر دیا اور آسٹریا پر جیت حاصل کر کے قسطنطنیہ لوٹ گیا۔ شہنشاہ چارلس نے بھی پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کی اور ویانا میں ہی اپنی فوج لے کر کھڑا رہا۔

3.3.5 ایران کی مہم

1534ء میں سلیمان نے مشرق کی طرف توجہ دی، شاہ اسماعیل کی وفات ہو چکی تھی اور شاہ طماسپ ایران کا بادشاہ تھا۔ سلیمان اپنے جانے سے پہلے ابراہیم پاشا کو فوج کے ساتھ بھیج دیا تھا ابراہیم سیدھا تبریز کا رخ کیا اور بغیر کسی جھڑپ کے یہاں پر اپنا قبضہ جما لیا۔ سلیمان بھی تبریز پہنچ گیا اور وہاں سے دونوں نے بغداد اور موصل کا رخ کیا۔ حالانکہ یہاں کی آب و ہوا کی وجہ سے فوج کو بہت خسارہ اٹھانا پڑا۔ سلیمان بغداد پہنچا تو وہاں کے حاکموں نے شہر کو اس کے حوالے کر دیا۔ درحقیقت شاہ طہماسپ نے عثمانی فوج کے حملے کو روکنے کی کوئی کوشش بھی نہیں کی اور فارس کی طرف سے بغیر کسی لڑائی کے دو عظیم صوبے بغداد اور موصل کو عثمانی حکومت میں شامل کر دیا گیا۔ پھر 1548ء، 1553ء اور 1554ء میں سلیمان نے ایران پر حملہ کیا۔ ایڈان اور ودان کے شہروں کے علاوہ آرمینیا اور میسوپوٹامیہ کے علاقے اپنی حکومت میں شامل کر لیے۔ ایرانیوں نے ذاتی طور حملے کو روکنے کی کوشش کی لیکن شاہ طہماسپ کی طرف سے کسی طرح کا ترک فوجوں کو روکنے کا اقدام نہیں کیا گیا اور ترک لگاتار اپنی سلطنت میں اضافہ کرتے رہے۔

3.3.6 خیر الدین باربروسہ

بری طاقت کا معائنہ کریں تو عثمانی سلطنت کا جواب ایشیا یا یورپ میں کسی سلطنت کے پاس نہ تھا۔ عثمانیوں کے بحری بیڑے بھی دوسری حکومتوں پر اپنا دبدبہ قائم کر چکے تھے۔ اسپین اور وینس کے بیڑے اپنی طاقت کا لوہا پورے یورپ کو منوا چکے تھے۔ ترکی بیڑوں نے مختلف معرکوں میں ان کو شکست دے چکے تھے۔ سلیمان کے دور میں ترکی بیڑے کا غلبہ بحر روم میں برابر قائم رہا۔ عثمانیوں کا سب سے زیادہ مشہور بحری سردار خیر الدین باربروسہ تھا جس نے اپنی قابلیت کی وجہ سے بہت زیادہ شہرت حاصل کی۔ باربروسہ بحر روم میں اپنے جہازوں کے ساتھ تجارتی قافلوں پر حملہ کرتا تھا اور ساحلی علاقوں پر چھاپے مارتا تھا۔ لیکن بعد میں سلطان سلیم کی بادشاہت کو قبول کر لیا یہ وہ دور تھا جب اندلس پر عیسائی حکومتوں کا قہر جاری تھا، باربروسہ ان لوگوں کے لیے رحمت بن کر سامنے آیا اور تقریباً ستر ہزار لوگوں کو اپنے جہازوں کی مدد سے الجزائر پر پہنچا دیا۔ سلیمان نے اپنے عہد میں خیر الدین باربروسہ کو عثمانی بحریہ کی کمان دے دی۔ باربروسہ نے شہنشاہ چارلس کے بیڑے پر حملہ کیا، چارلس کے مشہور امیر البحر اینڈریا ڈوریا کو شکست دی۔ سلیمان کی تحریک سے اس نے تونس کے علاقے پر قبضہ کر کے اسے الجزائر کے علاقے میں شامل کر دیا۔ تونس کے فرماں روا نے شہنشاہ چارلس سے مدد مانگی تو چارلس نے اپنے ہاتھ میں کمان لی اور پانچ سو جہاز اور تیس ہزار فوج لے کر تونس پر چڑھائی کی۔ خیر الدین کو اس مقابلے میں شکست ہوئی کیوں کہ وہاں کے لوگوں نے خیر الدین کو اسپینی حملے کے خلاف کوئی مدد نہیں فراہم کی۔ چارلس نے فتح حاصل کر کے اپنے سپاہیوں کو شہر میں لوٹ مار کی اجازت دے دی۔

خیر الدین نے بحر الجین کے تقریباً پورے جزائر جو وینس کے ماتحت تھے اس پر قبضہ کر لیا اور ان علاقوں کو عثمانی سلطنت کا حصہ بنا دیا۔ خیر الدین باربروسہ نے اس متحدہ بحری بیڑے کو شکست دی، وینس، جنیوا اور ہسپانیہ کی بحری قوت بڑھی ہوئی تھی، 1538ء میں پریویسا کی مشہور بحری جنگ میں ہرایا۔ خیر الدین نے فرانس کے شہر طولون اور ہسپانیہ کے ساحلی علاقوں پر اپنا قبضہ جمایا۔ 1546ء میں خیر الدین پاشا کا انتقال ہوا۔ اس نے اپنی حیرت انگیز بہادری اور اپنی قابلیت سے عثمانی سلطنت کی ریاست کے رقبہ میں اضافہ کیا۔ خیر الدین

پاشا کی قبر دارالخلافہ استنبول کے پاس بحیرہ باسفورس کے کنارے پر ہے۔ باربروسہ کی وفات کے بعد جب بھی کوئی ترکی بیڑہ جنگ پر جاتا تو قبر کے پاس سلامی دیتا ہوا گزرتا۔

اسی طریقے دوسرے بحری قزاقوں نے ترک بحریہ میں باربروسہ کی جگہ لی، دو مشہور بحری کپتان جنہوں نے بعد میں عثمانی سلطنت کی خدمت کی۔ طورغوت اور پیالے۔ طورغوت بھی بحری قزاق تھا اس میں اور باربروسہ میں بہت ساری مماثلت تھی۔ اٹلی اور اسپین کے علاقوں میں اس نے اپنا دبدبہ قائم کرر کھا تھا۔ عثمانی سلطنت میں شامل ہونے کے بعد بھی وہ عثمانی معاہدے کے ساتھیوں تک کو نہیں چھوڑا۔ ایک بار وینس کے چند تجارتی جہاز کو اس نے اپنی گرفت میں لے لیا سلیمان نے پوچھ تاچھ کے لیے اسے قسطنطنیہ بلایا تو اس نے صاف انکار کر دیا اور مراکش جاکر وہاں کے سلطان کی نوکری کرلی۔ خیر الدین کی وفات کے بعد سلیمان نے اسے اعلی منصب دینے کا وعدہ کر کے بلوایا۔ طورغوت کے آنے کے بعد سلیمان نے اسے طرابلس کی فتح کے لیے بھیجا، طورغوت نے اس مہم کو بڑی خوش اسلوبی سے مکمل کیا اور طرابلس کو عثمانی سلطنت میں شامل کر دیا۔ 1565ء میں ترکوں نے مالٹا پر حملہ کیا تو طورغوت بھی اپنا بیڑہ لے کر عثمانی مدد کو پہنچا تو اسی جنگ میں مارا گیا۔

پیالے بھی طورغوت اور خیر الدین کی طرح بحری قزاق تھا، اس نے سلیمان کی ملازمت اختیار کرلی اور دھیرے دھیرے ترقی کر کے عثمانی امیر البحر تک کا سفر مکمل کیا۔ مالٹا پر جب ترکوں نے حملہ کیا تو پیالے ہی امیر البحر تھا۔

3.3.7 سلیمان کی وفات

سلیمان آسٹریا سے نئی جنگ کی تیاریاں کر رہا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ ہنگری کی حلیف ساتھیوں میں پھر سے جھگڑا شروع ہو گیا۔ بعض عثمانی قلعوں پر بھی اپنا قبضہ جمالیا، سلیمان کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے خود میدان میں آنے کا فیصلہ کیا حالانکہ سلیمان کی عمر 76 سال ہو چکی تھی۔ کمزوری اور بیماری کی وجہ سے وہ گھوڑے پر بیٹھنے کا قابل بھی نہیں تھا۔ پالکی پر سوار ہو کر سلیمان قسطنطنیہ سے ہنگری کی جانب نکلا اور فوجوں کو زیجیتھ (Szigeth) شہر کا محاصرہ کرنے کا حکم دیا، پانچ دن میں شہر پر تو عثمانی جھنڈا لہرانے لگا لیکن قلعوں میں حاکم زرینی اور اس کے ساتھیوں نے قسم کھائی کہ جب تک زندہ رہیں گے اس پر فتح نہ حاصل ہونے دیں گے۔ شروعاتی حملوں میں ترکوں کو پسپا ہونا پڑا لیکن پھر قلعہ کے سب سے بڑے برج کے نیچے سرنگ کھودی گئی اور اس میں بارود بھر کر آگ لگادی گئی۔ پھر لگاتار چار دن کی مسلسل جھڑپ کے بعد یہ قلعہ 8/ستمبر 1566ء کو فتح ہوا۔ 5/ستمبر کو ہی سلیمان کی وفات ہو چکی تھی لیکن صدر اعظم صوقوللی نے سلطان کی موت کی خبر کو بالکل پوشیدہ رکھا اور شہزادہ سلیم کے پاس اس کی اطلاع بھجوادی۔ اس دوران عثمانی فوجیں مسلسل فتوحات کرتی رہیں۔ صوقوللی نے سلیمان کی لاش کو مصالحے و دیگر ترکیبوں سے خراب ہونے سے بھی محفوظ رکھا۔ جب فوج ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی تو سلیمان کی میت کو پالکی میں رکھ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا اور فوج میں اطلاع کروادی کہ سلطان اپنی بیماری کے باعث باہر نکلنے سے قاصر ہیں۔ قسطنطنیہ میں جب شہزادہ سلیم نے تخت کو سنبھال لیا تو اس نے 24/ستمبر کو تمام فوج کو اکٹھا کر کے سلیمان کی وفات کا اعلان کیا۔

3.3.8 قوانین میں اصلاح

سلیمان ترکی میں قانون ساز کے طور پر بھی بہت مشہور ہے، آپ کا عہد قانون کے ہر ڈیپارٹمنٹ عظیم اصلاحات کے لیے نمایاں

تھا۔ اس کا مقصد سوسائٹی میں انصاف کو بڑھاوا دینا تھا۔ زمینی قوانین میں تبدیلی کی گئی اور جاگیر دارانہ نظام میں بھی ردوبدل کیا گیا۔ قانون فوج داری، قانون پولیس اور عام قوانین پر سلیمان نے اپنی توجہ مرکوز کی اور مناسب تبدیلیاں کیں۔ سلیمان کے عہد میں ہی سلطنت عثمانی اپنے پورے عروج پر پہنچ چکی تھی اور سلیمان نے ہی اپنے عہد میں کچھ ایسی روش شروع کی جس کو مورخین زوال کا اسباب بھی شمار کرتے ہیں۔ سلیمان کے عہد سے پہلے تک دیوان یا عظیم ریاستی کونسل کے اجلاسوں میں سلطان کی باقاعدہ حاضری کا سلیمان کے زمانے میں بند ہونا۔ سلیمان نے ملحقہ کمرے میں ایک کھڑکی بنائی تھی جو کونسل کے چیمبر میں کھلتی تھی، جہاں پردے کے پیچھے چھپ کر وہ دیوان کی گفتگو کو ان میں حصہ لیے بغیر سن سکتا تھا۔ ان کے جانشینوں نے پردے کے پیچھے سے بھی سننا چھوڑ دیا۔ اس کونسل سے سلطان کی غیر موجودگی نے اس کی من مانی طاقت میں اضافہ کیا اور اس کے وزراء کے اثر و رسوخ کو کم کیا۔ جب تک سلیمان جیسا قابل آدمی تخت پر براجمان تھا، اس نئی طرز عمل کے شاید بدترین نتائج نہ نکلے ہوں، لیکن ان کے نااہل جانشینوں کے معاملے میں اس نے بے پناہ برائیاں جنم لیں۔

سلیمان نے ایک نئی روش یہ کی کہ بعض لوگوں کو جو نچلے عہدوں کے درجات سے نہیں گزرے بلکہ کچھ آدمیوں کو سیدھا اعلی عہدوں پر متعین کر دیا۔ اس قسم کا پہلا اور سب سے نمایاں معاملہ سلیمان کے پسندیدہ ساتھی ابراہیم کا ہے جس کی لیاقت سے سلیمان متاثر ہو کر چند سال کے اندر سلطنت عثمانیہ کی وزارت عظمیٰ کے عہدے پر بیٹھا دیا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی لوگ سیدھے اونچے عہدے پر متعین کر دیے گیے۔ سلیمان لوگوں کی صلاحیت کو پرکھنے میں ماہر تھا لیکن ان کے جانشین کو یہ ملکہ حاصل نہ تھا اور ایسے شخص کا انتخاب ہوا جو اس عہدے کے لیے مناسب شخص نہ تھے۔

سلیمان کے عہد میں بدعنوانی اور رشوت کی بنیاد رستم پاشا نے ڈالی۔ یہ شخص پندرہ سال تک وزیر اعظم رہا اور اس کی شادی سلیمان کی بیٹی سے ہوئی۔ سلیمان کی نظر میں اس کی عزت شاہی خزانے بھرنے کے لیے ہی تھی اور اس نے خزانہ بھرنے کا جو طریقہ اختیار کیا وہ ریاست کو کمزور کرنے والا تھا۔ سلطنت کے انتظامی عہدوں پر جو لوگ فائز کیے جاتے رستم ان سے تقرری کے موقع پر بڑی رقمیں وصول کرتا۔ سلیمان کے دور میں یہ ابتدا انتظامی عہدوں تک ہی خاص تھی، بری اور بحری فوج کو اس سے علاحدہ رکھا گیا لیکن سلیمان کے بعد انتظامی عہدوں کی قید نہ رہی اور ان لوگوں کی تقرری ہونے لگی جو زیادہ رقمیں لے آتے۔ گویا عہدے نیلام ہونے لگے۔ جس کی وجہ سے ریاست کو بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔

سلیمان کی ایک عادت یہ بھی تھی جس وزرا سے وہ خوش ہوتا اس پر بے انتہا انعام و کرام لٹاتا اور ان سے کسی طرح کا تعرض نہ کرتا تھا۔ ابراہیم جو تیرہ سال تک وزیر رہا اور رستم پاشا پندرہ سال تک۔ ان دونوں نے بہت ساری دولت اکٹھا کی جس کی وجہ سے وزراء میں شاہانہ زندگی کا چلن عام ہوا۔

3.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- بایزید ثانی کے بعد سلیم اول نے تخت سنبھالا، یہ عہد عثمانی سلطنت میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس سے پہلے کی سلاطین نے یورپ کی طرف زیادہ توجہ دی اور مشرق کی طرف ان کا بہت کم جھکاؤ رہا لیکن سلیم نے یورپ کے بجائے مشرق کی طرف رخ کیا۔ مصر میں مملوکوں سے جنگ جیتنے کے بعد اس نے اپنے لیے خلیفہ کا لقب اختیار کیا۔ سلیم کے بعد اس کا لڑکا سلیمان اعظم نے تخت سنبھالا، اس دور میں سلطنت عثمانیہ اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی۔
- سلطان سلیم نے آٹھ سال تک حکومت کی لیکن اس مختصر وقفے میں سلطنت عثمانیہ کے دائرے کار کو دوگنا کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ سلیم نے یورپ کے علاقوں کی طرف توجہ نہ دے کر بلکہ مشرقی ممالک فارس، کردستان، مصر، سیریا اور عرب ممالک کو اپنے مقبوضے میں شامل کیا۔ مصر سے واپس ہونے کے بعد وہ ایک جنگ کی تیاری کر رہا تھا کہ 1530ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ وہ بہترین فاتح اور اعلی درجے کا سپہ سالار تھا، انتظامی صلاحیت میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا۔ اس کے انتظام ملک اور رعب کی وجہ سے اس کے عہد میں سلطنت میں بغاوت نہیں ہوئی۔
- سلیم کے بعد اس کے اکلوتے بیٹے سلیمان نے چھبیس سال کی عمر میں تخت سنبھالا، جس نے چھیالیس سال تک حکومت کی، جس کا دور سلطنت عثمانیہ میں عروج کا دور تھا اس کی بنیادی وجہ اس کی ذاتی خوبیاں تھیں۔ سلیمان فوجی قابلیت، عملی صلاحیت اور شجاعت میں نمایاں حیثیت کا مالک تھا، انتظامی صلاحیت اور قانون سازی میں بے مثال تھا اور اس نے اپنے تمام پیشروؤں کو پیچھے چھوڑ دیا۔
- سلیمان ترکی میں قانون ساز کے طور پر بھی بہت مشہور ہے، آپ کا عہد قانون کے ہر ڈیپارٹمنٹ عظیم اصلاحات کے لیے نمایاں تھا۔ اس کا مقصد سوسائٹی میں انصاف کو بڑھاوا دینا تھا۔ زمینی قوانین میں تبدیلی کی گئی اور جاگیر دارانہ نظام میں بھی ردوبدل کیا گیا۔ قانون فوج داری، قانون پولیس اور عام قوانین پر سلیمان نے اپنی توجہ مرکوز کی اور مناسب تبدیلیاں کیں۔ سلیمان کے عہد میں ہی سلطنت عثمانی اپنے پورے عروج پر پہنچ چکی تھی اور سلیمان نے ہی اپنے عہد میں کچھ ایسی روش شروع کی جس کو مورخین زوال کا اسباب بھی شمار کرتے ہیں۔ سلیمان کے عہد سے پہلے تک دیوان یا عظیم ریاستی کونسل کے اجلاسوں میں سلطان کی باقاعدہ حاضری کا سلیمان کے زمانے میں بند ہونا۔

3.5 نمونہ امتحانی سوالات

3.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. عثمانی سلطنت کو خلافت میں کس نے تبدیل کیا؟

(a). عثمان خان (b). اورخان (c). سلیم (d). محمد فاتح

2. یورپ والے سلیمان اعظم کو کس لقب سے یاد کرتے تھے؟

(a). ذی شان (b). محمد فاتح (c). اورخان (d). سب غلط

3. عثمانی اور صفوی کے درمیان کب جنگ ہوئی؟

(a).1514ء (b).1453ء (c).1926ء (d).1940ء

4. 1516ء میں مرج دابق کے میدان میں کس کے درمیان جنگ ہوئی؟

(a). عثمانی اور مملوک (b). عثمانی اور عباسی (c). عثمانی اور پہلوی (d). عثمانی اور مغل

5. سلیمان نے کتنے سال کی عمر میں تخت سنبھالا؟

(a). چھبیس سال (b). اٹھارہ سال (c). چالیس سال (d). سب غلط

6. خیر الدین باربروسہ کس حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں؟

(a). امیر بحریہ (b). ینی چری کے امیر (c). بری فوج امیر (d). سب غلط

7. کس کے عہد میں دیوان یا عظیم ریاستی کونسل سے سلطان کے غیر حاضر ہونے کی رسم شروع ہوئی؟

(a). سلیمان اعظم (b). سلیم اول (c). اورخان (d). عثمان خان

8. سلیم نے کتنے سال تک حکومت کی؟

(a). آٹھ سال (b). دس سال (c). بیس سال (d). سب صحیح

9. سلطان سلیم کا انتقال کب ہوا؟

(a).1530ء (b).1453ء (c).1250ء (d).1924ء

10. سلیمان نے جب ایران پر حملہ کیا تو وہاں پر کون بادشاہ تھا؟

(a). شاہ طہماسپ (b). شاہ اسماعیل (c). رضا شاہ پہلوی (d). احمد شاہ قاچار

3.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. جنگ چالدران پر گفتگو کیجیے۔
2. عثمانی سلطنت خلافت میں کیسے تبدیل ہوئی؟ مختصر مضمون لکھیے۔
3. سلیمان اعظم کی بلغراد پر تعارفی نوٹ تحریر کیجیے۔
4. سلیمان کی قانون میں اصلاح اور نئی روش کا جائزہ لیجیے۔
5. ہنگری اور روڈس کی فتح پر روشنی ڈالیے۔

3.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. سلطان سلیم کے فتوحات کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

2. عثمانی سلطان سلیمان اعظم کے ویانا کا محاصرہ کا جائزہ لیجیے۔

3. عثمانی بحری امیر خیر الدین باربروسہ کی خدمات پر مضمون لکھیے۔

3.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. دولت عثمانیہ، مرتبہ عزیز احمد، معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ، 2009

2. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ (جلد دوم)، ثروت صولت، مکتبہ جدید پریس، لاہور، 2014

3. تاریخ اسلام (جلد سوم)، شاہ اکبر نجیب آبادی، مکتبہ خلیل لاہور، 2004

4. تاریخ ملت (جلد سوم)، تالیف مفتی زین العابدین، مفتی انتظام اللہ شہابی، ادارہ اسلامیات، پبلشرز لاہور، 1991

5. سلطنت عثمانیہ، ڈاکٹر علی محمد الصلابی، مترجم علامہ محمد ظفر اقبال کلیار، گائیڈنس پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، نئی دہلی 2021

6. The Turkish Empire Its Growth and Decay, Lord Eversley, London T. Fisher Unwin LTD. A Delphi Terrace 1918.

اکائی 4: عثمانی حکومت کا نظم ونسق

اکائی کے اجزا:

4.0 تمہید

4.1 مقاصد

4.2 عثمانیوں کا نظام حکومت آغاز وارتقا

4.3 عثمانی نظام حکومت

4.3.1 ادارہ حکومت کے ارکان کے حقوق

4.4 عثمانی فوج

4.5 ادارہ اسلامیہ

4.6 نظام عدالت

4.6.1 ملت سسٹم یا نظام ملت

4.6.2 نئے نظام کی طرف

4.7 اکتسابی نتائج

4.8 نمونہ امتحانی سوالات

4.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

4.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

4.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

4.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

4.0 تمہید

عثمانی ترک منگولوں کے حملوں کے سبب بے گھر ہو کر ایشیائے کوچک میں داخل ہوئے تھے۔ اصلاً یہ ایک خانہ بدوش قوم تھی اور

قبائل کی زندگی کے اوصاف ان میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے یعنی عثمانی ترک بہادری اور شجاعت جیسے اوصاف کے ساتھ ساتھ نظم و تنظیم کے لحاظ سے بھی نمایاں تھے۔ خانہ بدوشی کی زندگی نے ان میں نظم وضبط کی ایسی خوبی پیدا کر دی تھی کہ جب انہیں حکمرانی کا موقع ملا تو انہوں نے اپنی فوجی تنظیم، جمہوری مزاج اور اجتماعی نظام کے ذریعے ایک ایسے نظام حکومت کو فروغ دیا جو اپنے زمانے کا شاید سب سے بہتر نظام حکومت تھا اور جس کی بدولت ان کی حکمرانی کو نہ صرف یہ کہ پائیداری اور استحکام حاصل ہوا بلکہ وہ دنیا کی ایک عظیم الشان سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے اور تقریباً پانچ سو برس تک دنیا کے ایک بہت بڑے خطے پر حکمرانی کرتے رہے۔

اس میں شک نہیں کہ خانہ بدوش اقوام اپنی فطری شجاعت اور بہادری نیز قبائلی تنظیم کے ذریعہ بہت جلد متمدن اقوام اور سماج کو شکست دینے اور ان پر حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ لیکن ان کی یہ کامیابی بہت زیادہ دیرپا نہیں ہوتی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ متمدن اقوام سے میل ملاپ میں ان کے امتیازات و اوصاف کھو جاتے ہیں اور سوڈیڑھ سو برس کے اندر ہی وہ زوال کا شکار ہو جاتی ہیں۔ البتہ عثمانی ترک اس عموم سے مستثنیٰ ہیں۔ انہوں نے ایشیائے کوچک میں داخل ہونے کے بعد ایک ایسی سلطنت کی بنیاد رکھی جو مسلسل تین سو برس تک وسعت، عروج اور استحکام کی طرف گامزن رہی۔ اور دنیا کی وسیع ترین اور سب سے زیادہ طاقت ور سلطنت بن گئی۔ ایک موروثی بادشاہت جس کی رعایا میں مختلف قوموں اور نسلوں کے لوگ شامل تھے۔ بادشاہ بالکل مطلق العنان نہیں ہوتا تھا اور وہ خود کو سلطنت کے قوانین کا پابند سمجھتا تھا۔ امور مملکت کی انجام دہی میں اپنے مشیروں سے مشورے لیتا تھا اور ان پر عمل بھی کرتا تھا۔ ان سب سے بڑھ کر عثمانی سلطنت کی ترقی و کامیابی اور پائیداری کا ضامن شاید اس کا وہ نظام تھا جس کے تحت ایک مخالف مذہب کے پیرو غلام نہ صرف یہ کہ غلامی سے آزاد کر دیے جاتے تھے، بلکہ تعلیم و تربیت کے ذریعہ انہیں اس لائق بنا دیا جاتا تھا کہ فوج کے عام سپاہی سے لے کر وزارت تک کسی بھی عہدے پر اپنی صلاحیت کے مطابق فائز ہو سکتے تھے یہاں تک کہ وہ درباری امیر اور شہزادیوں کے شوہر بھی بن سکتے تھے۔ عثمانی حکام ان کے انتخاب میں ان کی نسل، مذہب اور زبان نہیں دیکھتے تھے، بلکہ ان کی جسمانی و ذہنی صلاحیتوں کا اندازہ کرتے اور پھر تربیت دے کر انہیں کندن بنا دیتے۔

4.1 مقاصد

اس یونٹ کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ آپ کو عثمانی سلطنت کے نظام حکومت کا تعارف کرایا جائے۔ وہ کون سے ادارے تھے جن پر عثمانی سلطنت کا پورا نظام قائم تھا اور وہ کون سی خوبیاں تھیں جس نے پانچ سو برس تک عثمانی حکومت کے قائم رہنے میں مددگار ثابت ہوا۔ ان سے آگاہی حاصل ہو گی۔

4.2 عثمانیوں کا نظام حکومت آغاز وارتقا

کوئی بھی نظام حکومت ہو اچانک وجود میں نہیں آجاتا، بلکہ ماضی کے تجربات، مقامی روایات اور پیش آمدہ حالات کسی بھی نظام حکومت کے وجود اور تشکیل میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ہمیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ عثمانی ترک ایک خانہ بدوش قوم کی سطح سے

اٹھے، اپنی صلاحیت، بہادری اور بہترین تنظیم کے ذریعے اس خاندان کے ابتدائی حکمرانوں نے ایشیائے کوچک میں بازنطینی سرحد پر واقع ایک چھوٹی سی جاگیر کو ایک وسیع و عریض سلطنت میں تبدیل کر دیا۔ اس سے پہلے ہم یہ بھی پڑھ چکے ہیں کہ اس خاندان کے پہلے امیر ارطغرل کی حیثیت سلجوقی سلطنت کے ایک معمولی جاگیر دار سے کچھ زیادہ نہ تھی۔ اس کے بعد اس کے بیٹے عثمان خاں نے اسے ایک باضابطہ ریاست کی شکل دی اور اسی وجہ سے اس کی قائم کردہ حکومت عثمانی حکومت کہلاتی ہے۔ البتہ اس کی حکومت کا دائرہ بھی چونکہ بہت چھوٹا تھا اس لیے اس کے زمانے میں سابقہ سلجوقی نظام حکومت ہی عثمانی ریاست کی حدود میں بڑی حد تک جاری رہا۔ نظام کی تبدیلی کے حوالے سے اس کے زمانہ حکومت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا کہ جمعہ کے خطبے میں اس کا نام بھی شامل ہو گیا تھا بصورت دیگر اس نے تو اپنے لیے سلطان کا لقب بھی نہیں استعمال کیا وہ صرف اور صرف امیر عثمان خان تھا۔

عثمان خان کی وفات کے بعد جب اس کا چھوٹا بیٹا اورخان اس کی وصیت کے مطابق حکمراں بنا۔ اس کے زمانے میں فتوحات کا سلسلہ وسیع ہوا۔ اپنے باپ کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے اس نے بروصہ کے شہر کو اپنی حکومت کا پایہ تخت بنایا۔ اسی طرح اس نے اپنے بڑے بھائی علاء الدین خاں کو جسے حکمرانی سے کوئی خاص دل چسپی نہیں تھی، اپنا وزیر (صدر اعظم جس کا عہدہ وزیر اعظم کے برابر ہوتا تھا) بنا کر اگر ایک طرف خود کو فوجی مہمات کے لیے فارغ کر لیا تو دوسری طرف مملکت کے اندرونی امور اور انتظام وانصرام کو اپنے بھائی کے حوالے کر کے گویا اسے بھی امور مملکت میں پوری طرح شریک کر لیا۔ اورخان کے زمانے میں ہمیں پہلی بار عثمانی حکومت کے نظام حکومت کے ابتدائی خدو خال اور نقوش ابھرتے ہوئے نظر آتے ہیں جب علاء الدین نے بعض اہم اصلاحات کا آغاز کیا۔ حالانکہ اس دوران بھی عثمانی مملکت میں بنیادی طور پر سابقہ سلجوقی حکومت کا نظام ہی جاری رہا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی علاء الدین کی اصلاحات اور پھر قرا خلیل کی تجویز کے مطابق ینی چری (نئی فوج) کا قیام گویا اس بات کا اشارہ بھی تھا کہ اب ایک نئے نظام حکومت کی بنیاد پڑ رہی ہے۔ یہ ایک ایسا نظام ہو گا جو عثمانی نظام حکومت کے نام سے موسوم ہو گا اور جس پر آئندہ عثمانیوں کی عظیم الشان سلطنت کی عمارت قائم ہو گی۔

علاء الدین خان کی اصلاحات اس حوالے سے انتہائی اہمیت کی حامل ہیں کہ عثمانی حکومت کا وہ پہلا وزیر ہے جس نے اصلاحات کے توسط سے عثمانیوں کا اپنا نظام حکومت تشکیل دینے کی کوشش کی۔ اورخان کے نام کا عثمانی سکہ جاری کرنے کے علاوہ اس نے عثمانیوں کے زیر اقتدار علاقوں میں رہنے والے باشندوں کے لیے مختلف قسم کے لباس تجویز کر کے گویا ایک ممتاز مملکت اور ایک علاحدہ نظام حکومت کے خدوخال متعین کر دیے۔ اسی طرح پہلی باضابطہ، تنخواہ دار اور جنگ کے لیے ہمیشہ مستعد و تیار رہنے والی ایک پیادہ فوج تشکیل دے کر اس نے عثمانی نظام حکومت میں فوج کی اہمیت کو بھی گویا ایک طرح سے مستقل کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ قرا خلیل کی تجویز پر ینی چری (نئی فوج) کا قیام اورخان کے زمانہ حکومت کا ایک انقلابی اقدام تھا۔ لیکن اس کے ساتھ علاء الدین نے نظام حکومت کے استحکام اور فوج کی طاقت کو مزید موثر بنانے کے لیے ایک بے ضابطہ پیادہ فوج تشکیل دی جو تنخواہ دار نہ تھی۔ ایک فوج ایسی بنائی جو جاگیر کی مالک ہوتی تھی اور اس کے ذمے فوجی خدمت کے علاوہ اپنی جاگیروں سے متصل سڑکوں اور شاہراہوں کی مرمت بھی تھی۔ اسی طرح اس نے تنخواہ دار اور جاگیر دار دونوں طرح کے فوجیوں کا سوار دستہ بھی تشکیل دیا۔

اور خان کے زمانے میں ہی عثمانی حکومت میں پہلی مرتبہ پاشا کا خطاب رائج ہوا۔ سب سے پہلے اس نے یہ خطاب اپنے بھائی علاء الدین خاں کو دیا۔ پاشا کا خطاب ایک طرح سے ولی عہدی اور وزیر اعظم کے عہدے کی علامت تھا۔ علاء الدین کے بعد یہ خطاب اور خاں کے بڑے لڑکے سلیمان کو دیا گیا۔ بعد میں مراد کے زمانے سے پاشا کے خطاب سے ولی عہدی کی خصوصیت ختم ہو گئی۔ مزید آگے چل کر یہ خطاب بڑے بڑے فوجی اور ملکی عہدے داروں کو بھی دیا جانے لگا۔

اور خان کے بعد سلطان محمد فاتح ہمارے سامنے ایک ایسے عثمانی حکمراں کے طور پر آتا ہے جس نے عثمانیوں کے نظام حکومت کے لیے ایک باضابطہ آئین یا دستور مرتب کیا۔ اس کے وضع کیے ہوئے اسی 'قانون نامہ' کو سلطنت عثمانیہ کے بنیادی دستور کی حیثیت حاصل ہے۔ قانون نامہ کی رو سے سلطنت چار ستونوں پر قائم ہے۔ .1وزراء سلطنت، یہ حکومت کے سب سے بڑے عہدے دار ہوتے تھے۔ .2قضاۃ عسکر، ان کا تعلق علماء کی جماعت سے ہوتا تھا اور یہ عدالتوں کے سربراہ ہوتے تھے۔ .3دفتر دار، اس کے ذمہ خزانے کا انتظام وانصرام ہوتا تھا۔ .4نشانجی، یہ ایک طرح سے حکومت کا چیف سکریٹری ہوتا تھا۔ سلطنت کا سب سے بڑا ادارہ خود سلطان ہوتا تھا اور اسے عام طور پر باب عالی سے موسوم کیا جاتا تھا۔ سلطان کی کابینہ دیوان کے نام سے جانی جاتی تھی۔ اسی طرح صوبے کے حکام آغا اور ضلع سطح کے حکام سنجق بے کہلاتے تھے۔ محمد فاتح کے 'قانون نامہ' میں ایک خونین قانون بھی تھا جس کے تحت حکومت کا جانشین امن واستحکام کی غرض سے اپنے بھائیوں کو قتل کر سکتا تھا۔

عثمانی حکمراں سلیمان اعظم (974ھ1566/ء-926ھ1520ء) جسے سلیمان قانونی بھی کہا جاتا ہے، وہ سلطان ہے جس کے زمانے میں عثمانی سلطنت اپنی حد کمال کو پہنچ گئی۔ وہ بلاشبہ تین براعظموں کا شہنشاہ اور دو بحروں (سمندروں) کا مالک تھا۔ اس نے اپنے زمانہ حکومت میں خالص انتظامی نوعیت کی بہت سی اصلاحات کیں۔ مثلاً یہ کہ پوری سلطنت کو 21ولایتوں (صوبوں) میں تقسیم کیا اور پھر یہ ولایتیں بھی250 سنجقوں ضلعوں میں تقسیم تھیں۔ چونکہ عثمانی حکومت بنیادی طور پر ایک فوجی حکومت تھی۔ اس لیے اس نے فوج کی بہتر تنظیم کے لیے بھی متعدد اقدامات کیے۔ اسی طرح محصولات اور جاگیری نظام میں بھی اس نے اصلاحات کیں۔ قانون فوج داری قانون پولیس اور عام قوانین پر اس نے خاص توجہ دی۔ اور ایک ایسا مجموعہ قوانین تیار کروایا جس میں سلطنت عثمانیہ سے متعلق تمام ضروری قوانین کا احاطہ کر لیا گیا تھا۔ اسی طرح قانون رعایا، کے تحت غیر مسلم رعایا کے لیے بھی قوانین مرتب کرائے، غیر ملکی تاجروں کو تجارتی مراعات کے علاوہ قانونی تحفظ بھی فراہم کیا۔

سلطنت عثمانیہ کا زوال محمد فاتح کے بعد سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ البتہ دنیا کی بہت ساری سلطنتوں کے زوال کے مقابلے عثمانیوں کا زوال کافی سست رفتار تھا۔ اور دور زوال میں بھی متعدد ایسے عثمانی سلطان گزرے ہیں جنہوں نے اپنی فراست، تدبر، حسن انتظام اور اصلاحات کے ذریعے نہ صرف یہ کہ ایک عرصے کے لیے زوال کی رفتار کو روک دیا بلکہ بڑے بڑے کارنامے بھی انجام دیے۔ سلطان سلیم ثالث (1222ھ1807/ء-1203ھ1789/ء) بھی عہد زوال کے ایسے ہی عظیم المرتبت عثمانی حکمرانوں میں سے ایک ہے۔ اس نے اپنے حسن تدبر سے نہ صرف یہ کہ سلطنت عثمانیہ کے زوال پر روک لگانے میں کامیابی حاصل کی بلکہ سلطنت کے نظم ونسق پر بھی خاص توجہ

دی۔ سلطنت کی اساس عثمانی فوج میں اس کے زمانے تک بہت ساری خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں، سلطان سلیم ثالث نے اس کی اصلاح کرنی چاہی۔ ولایتوں کے حکام یا پاشاؤں کے اختیارات میں تخفیف کی۔ جاگیری نظام کو درست کرنے کے اقدامات کیے وغیرہ۔

سلطان عبد المجید خاں (1277ھ 1861 / ء-1255ھ 1839 / ء) آخری عثمانی حکمران ہے جس نے فوجی وانتظامی اصلاحات کے ذریعہ سلطنت عثمانیہ کے روبہ زوال اقتدار کو بچانے کی کوشش کی۔ اس نے خط شریف گل خانہ (1839ء) اور دستور ثانی (1856ء) کے ذریعہ عثمانی سلطنت میں جو اصلاحات نظام حکومت میں متعارف کرائیں (یہ اصلاحات عرف عام میں تنظیمات یا تنظیمات خیریہ کے نام سے مشہور ہیں) کہا جاتا ہے کہ بیرونی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا اگر شکار نہ ہو جاتیں تو ان اصلاحات کے توسط سے نہ صرف یہ کہ سلطنت عثمانیہ کا زوال رک جاتا بلکہ ان کے ساتھ ترکی بڑی آسانی کے ساتھ دور جدید میں داخل ہو جاتا اور عثمانی حکومت کا شیرازہ بھی بکھرنے نہیں پاتا۔

درج بالا سطور میں اختصار کے ساتھ اصلاحات کے حوالے سے سلطنت عثمانیہ کے نظام حکومت کے آغاز وارتقا پر گفتگو کی گئی ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ عثمانی حکمرانوں نے آغاز سلطنت سے ہی نظام حکومت کی اہمیت کو سمجھا اور اسے چست و درست رکھنے کی کوشش بھی کی۔ جب تک وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہے اور ان کا نظام حکومت وقت اور حالات کے تقاضوں کا ساتھ دیتا رہا، وہ دنیا کی سب سے عظیم الشان سلطنت کے مالک و مختار بنے رہے اور جب نظام حکومت پر ان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور اس میں مختلف سطح پر خرابیاں در آئیں تو وہ بھی روبہ زوال ہو گئے۔

4.3 عثمانی نظام حکومت

ایشیائے کوچک میں عثمانی ترکوں نے جس سلطنت کی بنیاد ڈالی وہ چھ سو سال تک قائم رہی۔ عثمانیوں کی یہ سلطنت اتنے طویل عرصے تک صرف اس وجہ سے قائم نہیں رہی کہ عثمانی ترک بہت زیادہ بہادر اور جنگ جوئی کی فطری خصوصیات سے متصف تھے، بلکہ ان کی سلطنت کی بقا کی ایک اہم اور بنیادی وجہ وہ نظام حکومت تھا جسے انہوں نے تشکیل دیا اور جو اپنے زمانے کا بہترین نظام حکومت تھا۔ اس نظام حکومت کی خاص بات یہ تھی سلطان بظاہر مختار مطلق ہونے کے باوجود بڑی حد تک سلطنت کے قانون کا پابند تھا۔ عثمانی سلطنت کا نظام حکومت بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم تھا۔ 1 ادارہ حکومت، جس کا سربراہ اعلی خود سلطان ہوتا تھا۔ شاہی خاندان کے افراد، حکومت کے انتظامی افسران، فوج کے حکام وغیرہ ادارہ حکومت کے لازمی اجزاء تھے۔ 2 ادارہ اسلامیہ، اس کا سربراہ شیخ الاسلام یا مفتی اعظم ہوتا تھا۔ اس ادارے کے ذمے سلطنت کے تمام مذہبی امور ہوتے تھے۔ عدالتوں کے قاضی، مفتی، مدرسوں کے اساتذہ، مکتبوں کے معلم اور مساجد کے ائمہ و مؤذنین کا تعلق ادارہ اسلامیہ سے ہوتا تھا۔ چونکہ عثمانی سلطنت بہت وسیع تھی اور اس کی رعایا میں ایک بڑی تعداد غیر مسلموں کی بھی شامل تھی۔ سلطنت کے ان غیر مسلموں کے لیے جو مختلف مذہبوں کے ماننے والے اور مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے مذہبی امور کی انجام دہی اور ان کے مذہبی حقوق کی حفاظت کے لیے ایک جداگانہ نظام قائم تھا اور یہ ملت سسٹم یا نظام ملت کہلاتا تھا۔ آئندہ صفحات میں ہماری کوشش ہوگی کہ عثمانی نظام حکومت کے ان مختلف شعبہ جات پر الگ الگ اور تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی جائے۔ سب سے

پہلے ہم ادارۂ حکومت سے شروع کرتے ہیں :

1. ادارہ حکومت

عثمانی نظام حکومت کا سب سے اہم ادارہ حکومت تھا۔ اس ادارے کا سربراہ اعلی خود سلطان ہوتا تھا، اور وہ موروثی طور پر منتخب ہوتا تھا۔ البتہ سلطان کے علاوہ ادارہ حکومت کے جو بھی اور جتنے بھی ذمہ داران ہوتے تھے ان کا انتخاب محض اپنی صلاحیت کی بنیاد پر ہوتا تھا اور ان عہدوں یا ذمہ داریوں تک پہنچنے کے لیے انہیں بہت ہی سخت تربیت کے مرحلے سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس ادارے میں سلطان اور اس کے اہل خاندان کے علاوہ حکومت کے انتظامی افسران، مستقل سوار اور پیدل فوج اور نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد جو فوجی خدمات، دربار اور حکومت کی ضروریات کے لیے زیر تعلیم وتربیت رہا کرتی تھی، شامل تھی۔ صدر اعظم جسے ہم وزیر اعظم سے تعبیر کر سکتے تھے اس ادارے میں سلطان کے بعد سب سے زیادہ با اختیار منتظم ہوا کرتا تھا۔ حکومت کی باگ ڈور پورے طور پر اس ادارے کے ارکان وافراد کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ پوری سلطنت کا نظم وانصرام انہیں کے ذمہ ہوتا تھا۔ مسلمانوں کے شرعی امور ادارہ اسلامیہ اور غیر مسلموں کے مذہبی امور ان کی ملتوں کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ ادارہ حکومت کی سب سے بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے ارکان چند مستثنیات کو چھوڑ کر تمام کے تمام وہ لوگ ہوتے تھے جو عیسائی والدین کی اولاد تھے اور جو چاہے جس منصب اور عہدے پر بھی فائز ہو جائیں ان کی حیثیت سلطان کے غلام کی ہوتی تھی۔

2. ادارہ حکومت میں داخلے کا طریقہ

ہمیں معلوم ہے کہ سلطان اور اس کے خاندان کے افراد موروثی طور پر ادارہ حکومت کے رکن ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ جو لوگ بھی اس ادارے میں شامل یا داخل کیے جاتے تھے وہ انتخاب کے ذریعے آتے تھے۔ ادارہ حکومت میں داخلے کے لیے انتخاب کے چار طریقے تھے۔ .1 یا تو وہ جنگ میں گرفتار کیے جاتے تھے۔ .2 یا خریدے جاتے تھے۔ .3 یا سلطان کے پاس بطور ہدیہ بھیجے جاتے تھے۔ .4 یا خراج میں حاصل کیے جاتے تھے۔ گویا ادارہ حکومت میں داخلے کا راستہ غلامی کے دروازے سے ہو کر گزرتا تھا۔ عام طور پر اس کے لیے چودہ سے اٹھارہ سال کے بچوں کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ خراج کے طریقے سے جن بچوں کو ادارہ حکومت کے لیے منتخب کیا جاتا تھا اسے ''دوشرمہ'' کہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے عموماً ہر چار سال کے بعد عہدے داروں کی ایک جماعت، جو لڑکوں کی صلاحیت و قوت کو پرکھنے میں خاص مہارت رکھتی تھی، حکومت کی طرف سے ان علاقوں میں بھیجی جاتی تھی جہاں سے خراج آتا تھا۔ جو والدین اپنے بچوں کو اس نظام میں داخل کرنا نہیں چاہتے تھے وہ بچپن میں ہی ان کی شادیاں کر دیتے تھے کیونکہ شادی شدہ بچوں کو اس کے لیے منتخب نہیں کیا جاتا تھا۔ البتہ ایسے والدین بھی بڑی تعداد میں ہوتے تھے جو خوشی خوشی اپنے بچوں کو ادارہ حکومت میں داخل کرنا چاہتے تھے کیونکہ اس طرح انہیں نہ صرف غربت و افلاس سے نجات مل جاتی تھی بلکہ وہ اپنی صلاحیت کے مطابق اعلی سے اعلی مرتبہ بھی حاصل کر سکتے تھے۔ انہیں معلوم ہوتا تھا کہ ان کے بچے اپنی استعداد و اہلیت کے مطابق اعلی درجہ کی تربیت حاصل کریں گے اور پھر ترقی کر کے اعلی سے اعلی عہدوں پر فائز ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ بہت سے ترک ان پر رشک کیا کرتے تھے کیونکہ ادارہ حکومت میں مسلمانوں کے بچوں کی شمولیت کی اجازت نہیں تھی، ان میں سے

بعض تو اپنے عیسائی پڑوسیوں کو رشوت دے کر کئی مرتبہ اس بات پر راضی کر لیتے تھے کہ وہ ان کے لڑکوں کو اپنا لڑکا بنا کر ادارہ حکومت میں بھرتی کروادیں۔ عثمانی سلطنت کے دور زوال میں بھرتی کے اس طریقے میں بعض تبدیلیاں ہوئیں اور زوال میں معاون بنیں۔

3. ادارہ حکومت کا تعلیمی نظام

ادارہ حکومت اپنے وسیع تر مفہوم میں ایک تعلیمی و تربیتی ادارہ تھا جس میں بچوں کو تمام عمر کے لیے داخل کیا جاتا تھا۔ اس تعلیمی ادارے میں بچوں کی شخصیت کے تمام پہلوؤں پر توجہ دی جاتی تھی۔ ان کی جسمانی و ذہنی دونوں طرح کی تربیت کا یکساں طور پر خیال رکھا جاتا تھا۔ ادارہ حکومت میں بچوں کی فوجی اور انتظامی امور کے لیے تربیت خاص طور پر پیش نظر ہوا کرتی تھی۔ انہیں سخت اصولوں اور ضابطوں کا پابند بنایا جاتا تھا بتدریج انہیں ترقی دی جاتی تھی اور لیاقت کے مطابق انعامات و اعزازات بھی ملتے تھے۔ ادارے کے قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی پر بچوں کو سخت سزائیں بھی دی جاتی تھیں۔ ایک خاص سطح تک تمام بچوں کو ذہنی و جسمانی تربیت کے مرحلے سے گزرنا ہوتا تھا۔ البتہ اس کے بعد ان کی ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے ادارہ حکومت سے وابستہ ماہرین ان کا امتحان لیتے اور استعداد کے لحاظ سے انہیں دو مختلف گروپوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ جو بچے جسمانی اور ذہنی دونوں سطحوں پر اعلی معیار اور کارکردگی کا مظاہرہ کرتے انہیں اعلی تربیت کے لیے منتخب کر لیا جاتا۔ باقی بچوں کو جسمانی تربیت کے لیے فارغ کر دیا جاتا تھا تاکہ وہ سلطنت کے دفاع کے لیے بہترین فوجی بن سکیں۔

ادارہ حکومت کے تعلیمی ادارے میں جو امیدوار اعلی تربیت کے لیے منتخب کیے جاتے تھے، ان کی ایک بڑی تعداد کو ادرنہ، غلطہ اور استنبول کے شاہی محلوں میں سلطان کے زیر سایہ اور نگرانی میں اعلی تربیت کے حصول کے لیے بھیج دیا جاتا تھا۔ یہاں انہیں تعلیم و تربیت کا ایک بہت ہی جامع اور سخت نصاب پورا کرنا پڑتا تھا۔ انہیں عربی و فارسی کی اعلی معیاری تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ ورزش، فنون حرب، شہسواری اور کوئی دست کاری بھی سکھائی جاتی تھی۔ تعلیم و تربیت کے اس مرحلے کی مدت بارہ سال میں ختم ہوتی تھی۔ آگے چل کر انہیں میں سے کچھ کو انتظامی امور کی تربیت کے لیے منتخب کر لیا جاتا تھا اور ان کی عملی تعلیم کے مقصد سے انہیں قصر سلطانی کی مختلف چھوٹی چھوٹی خدمتوں پر مقرر کر دیا جاتا تھا۔ اس دوران اپنی لیاقت و صلاحیت کے اعتبار سے وہ جتنا زیادہ سلطان کی ذات سے قریب ہو جاتے تھے، مدت تعلیم کی تکمیل کے بعد انہیں اتنی ہی اہم ذمہ داریاں دی جاتی تھیں۔ پچیس سال کی عمر ہونے کے بعد ہی یہ مرحلہ مکمل ہو پاتا تھا۔ اعلی تربیت کے لیے منتخب ہونے والے نوعمروں کی ایک اور تعداد کو تعلیم و تربیت کے لیے صوبوں کے گورنروں اور سلطنت کے اعلی عہدے داروں کے پاس بھی بھیجا جاتا تھا۔ وہاں بھی ان کی تعلیم و تربیت اسی انداز اور طریقے پر ہوتی تھی جیسے کہ سلطان کی نگرانی میں۔ انتظامی خدمات کے لیے منتخب ہونے والے امیدواروں کے بعد طلبہ کی جو تعداد بچ رہتی تھی ان کی اکثریت باضابطہ سوار فوج میں "جسے باب عالی کے سپاہی کہتے تھے" داخل کر دی جاتی تھی۔ ان کے رخصت کرنے کی باضابطہ تقریب منعقد کی جاتی تھی اور سلطان اس میں بہ نفس نفیس شریک ہو کر ان کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔

ادارہ حکومت کے تعلیمی نظام میں ماہرین کے ذریعہ تعلیم و تربیت کا ایک خاص مرحلہ مکمل کر لینے کے بعد طلبہ کے جو دو گروپ بنتے تھے ان میں سے پہلے کا ذکر اوپر کی سطروں میں ہو چکا۔ ان کے دوسرے گروپ کی تربیت زیادہ تر جسمانی، صنعتی اور فوجی نوعیت کی ہوتی

تھی۔ ان امیدواروں کو ترکی زبان اور اسلامی اصول زبانی سکھائے جاتے تھے۔ ان کا جو منتخب حصہ ہوتا تھا انہیں ینی چری نئی فوج کی شکل دے دی جاتی تھی۔ پہلے ان امیدواروں کو اناطولیہ کے اندرونی علاقوں میں بھیج دیا جاتا تھا تاکہ وہاں رہ کر یہ لوگ ترکی زبان، ترکی معاشرت اور ترکی ثقافت سے واقفیت حاصل کر لیں۔ یہاں ان کی جسمانی مضبوطی کے لیے ان سے کھیتی کا کام بھی لیا جاتا تھا۔ دو تین سال کے بعد ان کے معاینے کے لیے دارالحکومت سے افسر آتے تھے۔ ان میں سے جو اپنی تعلیم و تربیت میں کامیاب قرار پاتے تھے انہیں ترقی دے کر دارالحکومت بھیج دیا جاتا۔ وہاں ان میں سے کچھ کو بحری بیڑوں پر کام کرنے اور خدمات انجام دینے کے لیے بھیج دیا جاتا اور کچھ شاہی محلوں اور پبلک عمارتوں میں کام پر لگا دیے جاتے۔ اس دوسرے درجہ میں کام کرنے کے بعد ان کو انفرادی انتخاب کے ذریعے ینی چری کے دستوں میں بغرض تعلیم و تربیت بھیجا جاتا تھا اور جب انہیں فن سپہ گری میں مہارت حاصل ہو جاتی تو پھر انہیں باضابطہ ینی چری کا حصہ بنا دیا جاتا۔

4. ادارہ حکومت کے بنیادی اصول

سلطنت عثمانیہ کی قوت کا راز اس کے ادارہ حکومت کے زبردست نظام میں تھا۔ اس ادارے کے مخصوص اصول و ضوابط تھے جن کی سختی کے ساتھ پابندی کی جاتی تھی۔ اور جب تک ادارہ حکومت کی تنظیم میں ان اصولوں کی پابندی کی جاتی رہی۔ عثمانی دنیا کی عظیم ترین طاقت کے مرتبے پر فائز رہے۔ جب سے ان اصولوں میں نرمی برتی جانے لگی، ادارہ حکومت کی تنظیم کمزور پڑنے لگی اور عثمانیوں کا زوال شروع ہو گیا۔ ادارہ حکومت کے نظام کے بنیادی اصول یہ تھے۔

1. امیدواروں کا انتخاب بہت عمدہ طریقے پر ہوتا تھا۔
2. امیدواروں کی تعلیم و تربیت کی سخت نگرانی کی جاتی تھی۔
3. پرجوش مقابلے کے ساتھ ساتھ شدید ضبط و تادیب۔
4. کسی بھی امیدوار کو اپنی کوشش اور محنت کے ذریعے ترقی کرنے اور اونچے سے اونچا مرتبہ حاصل کرنے کے مواقع حاصل تھے۔ یہاں تک کہ وہ صدر اعظم بھی بن سکتا تھا۔
5. امیدوار کا سلطنت کی عیسائی رعایا کی اولاد میں سے ہونا ضروری تھی۔

ادارہ حکومت کے نظام میں داخلے کے ان اصولوں سے اگر کوئی مستثنیٰ تھا تو وہ صرف اور صرف عثمانی شاہی خاندان تھا یعنی شاہی خاندان کے افراد بغیر کسی انتخاب کے ادارہ حکومت میں شامل ہو سکتے تھے اور بلا مقابلہ وہ کوئی بھی عہدہ و منصب حاصل کر سکتے تھے۔ ادارہ حکومت میں داخلے کے لیے یہ سخت شرطیں اور اصول شاید اس لیے تھے کہ شاہی خاندان کے علاوہ کوئی بھی دوسرا موروثی حکمراں طبقہ وجود میں نہ آ سکے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ جب تک ادارہ حکومت میں داخلے کے ان اصولوں پر سختی کے ساتھ عمل درآمد جاری رہا۔ ادارہ حکومت پوری طرح مستحکم رہا لیکن سلیمان قانونی کے بعد جب ان اصولوں پر حکومت کی بندش ڈھیلی پڑ گئی اور ارکان حکومت نے سلطان پر دباؤ ڈال کر اس سے یہ اجازت حاصل کر لی کہ ان کی اولاد کا ان کی جگہوں پر تقرر ہو سکتا ہے تو اس کے ساتھ ہی عثمانی نظام حکومت کا زوال شروع ہو گیا اور ان کی حکومت دھیرے دھیرے کمزور پڑتی چلی گئی۔

4.3.1 ادارہ حکومت کے ارکان کے حقوق

ادارہ حکومت کا ہر رکن، خواہ وہ کتنے ہی بڑے منصب اور عہدے پر فائز کیوں نہ ہو، سلطان کا غلام ہوتا تھا۔ قلی (غلام) کا لقب ان کے لیے اعزاز و امتیاز کا نشان ہوتا تھا اور ہر جگہ سلطان کے ان غلاموں کا احترام کیا جاتا تھا۔ ادارہ حکومت کے ان ارکان کو جو مراعات اور حقوق حاصل تھے وہ درج ذیل ہیں :

1. ادارہ حکومت کے تمام ارکان ٹیکس سے بری ہوتے تھے۔ یعنی ان سے کسی قسم کا ٹیکس نہیں لیا جاتا تھا۔
2. وہ سلطان کے علاوہ اپنے اعلیٰ افسروں اور اپنے لیے مخصوص عدالتوں کے سامنے ہی جواب دہ ہوتے تھے۔
3. سلطان انہیں ضروریات زندگی کی تمام فکروں سے بے نیاز کر دیتا تھا اور اس کی جانب سے انہیں اتنا نوازا جاتا تھا کہ وہ عیش و عشرت کی زندگی گزارتے تھے۔
4. انہیں شاہی خزانے سے بھاری تنخواہیں ملتی تھیں۔
5. ادارہ حکومت کے وہ ارکان جو اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے تھے سلطان کی جانب سے انہیں بڑی بڑی جاگیریں بھی دی جاتی تھیں۔

ان حقوق و مراعات کے ساتھ ادارہ حکومت کے ارکان بہت ہی خوش حال اور عیش و عشرت کی زندگی گزارتے تھے۔ شروع میں ان کے معاملات بھی ادارہ اسلامیہ کی عدالتوں سے تعلق رکھنے والے قاضیوں کی عدالتوں میں جاتے تھے لیکن بعد میں انہوں نے سلطان سے یہ خاص رعایت حاصل کر لی کہ ان سے متعلق مقدمات صرف ان کے اپنے افسروں کی عدالتوں میں پیش ہوا کریں اور اس کے لیے ان کی الگ عدالتیں قائم کر دی گئیں۔

1. سلطان

ادارہ حکومت کا سب سے بڑا عہدے دار سلطان ہوتا تھا۔ اس کے اختیارات کی کوئی حد نہیں تھی، وہ اس ادارے کے تمام ارکان کے جان و مال کا مالک ہوتا تھا۔ ادارہ حکومت کے دیگر عہدے داروں کی طرح سلطان کا انتخاب اہلیت کی بنیاد پر نہیں بلکہ موروثی طور پر ہوتا تھا اور صرف عثمانی شاہی خاندان کا کوئی فرد ہی سلطان بن سکتا تھا۔ سلطنت کے قیام کی ابتدائی صدیوں میں قانون وراثت یہ تھا کہ بیٹا باپ کا جانشین ہوتا تھا، بھائی اسی وقت تخت نشین ہوتا تھا جب سابق سلطان کا کوئی بیٹا اس کی وفات کے وقت موجود نہ ہوتا۔ تخت کے حصول کے لیے عثمانی شہزادوں میں جنگیں بھی ہوئیں۔ اور تخت نشین ہونے کے بعد بھائیوں کو قتل کرانا عام بات تھی۔ سلطان محمد فاتح نے تو قانون ہی بنا دیا تھا کہ جو بیٹا تخت نشین ہو وہ اپنے بھائیوں کو قتل کرا دے۔ سلیمان اعظم کے زمانے سے شہزادوں کو قتل کرانا تو بند کرا دیا گیا لیکن انہیں محل میں نظر بند رکھا جاتا تھا۔ 1617ء میں سلطان احمد کے انتقال کے بعد اس کے تمام لڑکے نو عمر تھے۔ اس لیے دیوان نے یہ فیصلہ کیا کہ تخت کا وارث آل عثمان کا وہ شہزادہ ہوگا جو عمر میں سب سے بڑا ہو۔ اس کے بعد سے عثمانی سلطنت کے خاتمے تک یہی قانون جاری رہا۔ صرف

دو سلطان محمد رابع (1099ھ 1687/ء-1058ھ 1648/ء) اور عبد المجید (1277ھ 1861/ء-1255ھ 1839/ء) ایسے ہوئے جو اپنے باپ کی جگہ تخت نشین ہوئے۔

چونکہ عثمانی سلطنت میں ادارہ حکومت ہی سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ادارہ تھا اور سلطان کی شخصیت کو اس میں مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ اس لیے ضروری تھا کہ سلطان میں فہم و فراست، تدبیر و سیاست، عدل و انصاف اور رعایا پروری کے اوصاف اعلی پیمانے پر موجود ہوں۔ عثمان خاں سے لے کر سلیمان اعظم تک عثمانی حکمرانوں میں یہ اوصاف بدرجہ اتم موجود تھے۔ اس زمانے تک یہ رواج بھی تھا کہ حکمرانی کی تربیت کے لیے عثمانی شہزادوں کو مختلف صوبوں کا گورنر بھی بنایا جاتا تھا۔ سلیمان اعظم کے زمانے میں اس طریقے کی منسوخی کے بعد شہزادوں کو محل میں بند رکھنے کی روایت پڑ گئی۔ اس لیے بعد کے حکمران نہ صرف یہ کہ حکمرانی کی تربیت سے محروم ہو گئے بلکہ محل کی رنگ رلیوں اور عیش و عشرت تک محدود ہو کر انہوں نے خود کو نکما کر لیا۔

اس میں شک نہیں کہ ادارہ حکومت کے سربراہ اعلی کے طور پر سلطان کو لامحدود اختیارات حاصل تھے، لیکن مطلق العنان فرماں روا ہونے کے باوجود ادارہ حکومت کے باہر وہ شریعت، ملکی قوانین اور ترکوں کے قومی رسم و رواج کا پابند ہوتا تھا۔ عثمانی سلطنت میں چار طرح کے قوانین جاری تھے۔ 1۔ شریعت، 2۔ قانون یعنی عثمانی حکمرانوں کے تحریری فرامین، 3۔ عادت یا قومی و ملکی رسم و رواج جو قدیم زمانے سے چلا آتا تھا، 4۔ عرف یعنی موجودہ سلطان کا جاری کردہ قانون یا فرمان۔ ان میں شریعت کے قوانین سلطان سے بالاتر تھے۔ وہ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی پابندی اس کے لیے لازمی تھی۔ حالانکہ اپنے پیش رووں کے بنائے ہوئے آئین و قانون کی پابندی سلطان کے لیے ضروری نہیں تھی تاہم وہ اتنے مفید اور کارآمد تھے کہ کوئی بھی سلطان انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ سلیمان اعظم جو "قانونی" کے لقب سے مشہور ہے۔ اس نے بھی اپنے قانون نامہ میں پرانے آئین و قوانین کو مرتب اور منضبط زیادہ کیا ہے، اس میں نئے قوانین بہت کم ہیں، ترکوں میں قدیم رواجوں کی پابندی بہت شدت سے کی جاتی ہے۔ ان میں وہ کسی طرح کی مداخلت بھی گوارا نہیں کرتے۔ اس لیے سلطان بالعموم ترک رسوم و رواج کی پابندی کرتا تھا۔

2. دیوان

عثمانی سلطان کی مجلس شوری (جسے ہم کابینہ بھی کہہ سکتے ہیں) کو دیوان کہا جاتا تھا۔ یہ سلطان کے بعد سب سے زیادہ بااختیار مجلس تھی اور اس کے فیصلوں کو عام طور پر سلطان بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس مجلس شوری یا دیوان کے ارکان مندرجہ ذیل ہوتے تھے:

1. صدر اعظم، اس کا مرتبہ وزیر اعظم کے برابر ہوتا تھا، اور اس کے ماتحت وزراء جن کی تعداد بالعموم تین ہوتی تھی۔
2. شیخ الاسلام، یہ ادارہ اسلامیہ کا سربراہ ہوتا تھا اور اسی حیثیت میں دیوان کا رکن بھی ہوتا تھا۔
3. قاضی عسکر اناطولیہ، یہ علماء کی جماعت سے ہوتا تھا اور عثمانی سلطنت کے ایشیائی مقبوضات کے عدالتی امور کا ذمہ دار ہوتا تھا۔
4. قاضی عسکر رومیلیا، یہ بھی علماء کی جماعت سے ہوتا تھا اور سلطنت عثمانیہ کے یورپی مقبوضات کے عدالتی امور اس کے حوالے

ہوتے تھے۔

5. بیلر بے اناطولیہ۔ یہ اناطولیہ کے علاقوں کے صوبہ دار اعلیٰ ہوتا تھا۔

6. بیلر بے رومیلیا۔ یہ عثمانی سلطنت کے یورپی مقبوضات کا اعلیٰ صوبے دار ہوتا تھا۔

7. آغائے ینی چری، یہ ینی چری فوج کا سپہ سالار اعلیٰ ہوتا تھا۔

8. قپودان (کپتان) پاشا، عثمانی سلطنت کا امیر البحر ہوتا تھا۔

9. دفتر دار، عثمانی سلطنت کا وزیر مالیات ہوتا تھا۔

10. نشانجی، عثمانی سلطنت کا چیف سکریٹری ہوتا تھا اور سلطان کی مہر اس کے پاس ہوتی تھی۔

اسی طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ عثمانی سلطنت کا دیوان ایک طرح سے حکومت کے مختلف شعبوں کے اعلیٰ افسروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ دیوان کو سلطنت کی سب سے بڑی مشاورتی مجلس کی حیثیت حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ عدالت عالیہ کا مرتبہ بھی حاصل تھا۔ اس میں شیخ الاسلام اور قضاۃ عسکر کی شمولیت اسی حیثیت سے ہوتی تھی۔ دیوان کا اجلاس رمضان کے مہینے کے علاوہ تمام سال ہفتے میں چار دن ہوا کرتا تھا۔ شروع کے عثمانی سلطان خود ہی مجلس دیوان کی صدارت کیا کرتے تھے، البتہ سلیمان اعظم نے اس طریقے کو ترک کر دیا۔ وہ خود مجلس میں شریک ہونے کے بجائے اس کی کاروائی کی نگرانی دیوان خانے سے متصل ایک کمرے کی جالی دار کھڑکی کے پاس بیٹھ کر کیا کرتا تھا۔ اس کے بعد کے حکمرانوں نے اس نگرانی کو بھی چھوڑ دیا اور اب دیوان کا سارا کام صدر اعظم کے سپرد تھا۔ دیوان کی مجلسوں کی صدارت مستقل طور پر وہی کرنے لگا اور سلطان کے نمایندے کے طور پر اسے تمام ملکی، فوجی اور انتظامی اختیارات حاصل ہو گئے۔

3. صدر اعظم

یہ عثمانی سلطنت کا وزیر اعظم یا سب سے بڑا انتظامی عہدے دار ہوتا تھا۔ سلطان کے بعد سب سے زیادہ اختیارات صدر اعظم کو ہی حاصل ہوتے تھے۔ دیوان کی مجلس میں سلطان کے دائیں جانب اس کی نشست ہوتی تھی۔ سلطان سلیمان کے زمانے سے جب سلطان نے دیوان کی مجلس میں شرکت ترک کر دی تو سلطان کے نائب کی حیثیت سے صدر اعظم ہی دیوان کی مجالس کی صدارت کرتا تھا۔ ضرورت کے وقت صدر اعظم دیوان کے اجلاس اپنے گھر پر بھی طلب کر سکتا تھا۔ صدر اعظم کا عہدہ سلطان کے عہدے کی طرح موروثی نہیں تھا بلکہ اس کا انتخاب ادارہ حکومت کے ارکان میں سے اہلیت کی بنیاد پر ہوتا تھا۔

4. دیگر وزراء

ادارہ حکومت کو چلانے کے لیے صدر اعظم کے ماتحت تین دیگر وزیر ہوتے تھے۔

1. کحیا بے: اس کے ذمہ وزیر جنگ اور وزیر داخلہ کی انجام دہی تھی۔ کحیا بے ہی صدر اعظم کی غیر موجودگی میں اس کا قائم مقام ہوتا تھا۔ یعنی صدر اعظم کے بعد وزراء میں سے سب سے زیادہ بااختیار وزیر کحیا بے ہوا کرتا تھا۔

2. رئیس آفندی: اس کا پورالقب رئیس الکتاب تھا۔ اسے عثمانی سلطنت کے وزیر خارجہ کی حیثیت حاصل تھی۔ بعد میں نشانجی کے اختیارات بھی رئیس آفندی کے پاس آجانے کی وجہ سے یہی اصل چیف سکریٹری قرار پایا۔ نشانجی کا عہدہ محض تعظیمی رہ گیا۔

3. چاوش باشی: اس وزیر کے ذمہ دربار کے انتظامات ہوتے تھے اور سلطنت کے وزیر پولس کے اختیارات بھی اسی کو حاصل تھے۔

دفتر دار اور نشانجی

دفتر دار اور نشانجی سلطنت عثمانیہ کی مالیات کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ درجے میں یہ وزراء کے برابر ہوتے تھے۔ دفتر دار وزیر مالیات کے فرائض انجام دیتا تھا۔ نشانجی کا کام تمام سرکاری کاغذات اور دستاویزات تیار کرنا تھا، جس دستاویز پر ضرورت ہوتی سلطان کا طغرا (یعنی مہر) بھی وہی ثبت کرتا تھا۔ حکومت کی کاروائی کی روداد مرتب کرنے کے لیے اس کے ماتحت مستقل عملہ ہوتا تھا۔ بعد میں رئیس آفندی کے اختیارات میں اضافے کے ساتھ نشانجی کی اہمیت کم ہوتی گئی اور یہ صرف ایک تعظیمی عہدہ رہ گیا اس کے تمام متعلقہ فرائض رئیس آفندی کو منتقل ہو گئے۔

5. بیلر بے:

بیلر بے کا عہدہ صوبے دار کے برابر ہوتا تھا۔ شروع میں عثمانی سلطنت کے تمام مقبوضات صرف دو حصوں میں تقسیم تھے۔ عثمانی مقبوضات کا ایشیائی حصہ اناطولیہ کہلاتا تھا اور اس کا یورپی حصہ رومیلیا کہلاتا تھا۔ شروع میں عثمانی سلطنت میں صرف دو بیلر بے ہوتے تھے۔ ایک ایشیائی مقبوضات کے لیے جو بیلر بے اناطولیہ کہلاتا تھا اور دوسرا یورپی مقبوضات کے لیے جو بیلر بے رومیلیا کہلاتا تھا۔ بعد کے ادوار میں ان کی تعداد بڑھا دی گئی اور یہ سلطنت کے مختلف صوبوں کے والی یا گورنر جنرل مقرر کر دیے گئے۔ بیلر بے ایک طرح سے صوبوں میں سلطان کا نمائندہ ہوتا تھا اور صوبوں میں اسے وہ تمام ملکی اور فوجی اختیارات حاصل ہوتے تھے جو مرکز میں سلطان کو حاصل ہوتے تھے۔ گویا وہ صوبے کے تمام انتظامی و فوجی عہدے داروں کا افسر اعلی ہوتا تھا۔ عثمانی سلطنت میں صوبوں کو پہلے ایالت کہا جاتا تھا۔ بعد میں انہیں ولایت کا نام دے دیا گیا۔ ایالتیں ضلعوں میں تقسیم ہوتی تھیں جن کو سنجق یا لوا کہتے تھے، دونوں کے معنی پرچم کے ہیں، ان ضلعوں کے حاکم سنجق بے یا میر لوا کہلاتے تھے۔ ہر صوبے کی ایک مجلس شوری مرکزی دیوان کے طرز پر ہوتی تھی، جس کا صدر وہاں کا والی یا گورنر (بیلر بے) ہوتا تھا۔ اس مجلس شوری میں تمام ضلعوں کی عوامی نمائندگی ہوتی تھی اور اس کے ارکان صوبے کی حکومت کے مختلف شعبوں کے اعلی افسران ہوتے تھے۔

4.4 عثمانی فوج

عثمانی سلطنت ایک فوجی سلطنت تھی یعنی اس کے قیام سے لے کر استحکام اور عروج تک پہنچنے کے تمام مراحل میں فوج نے انتہائی اہم اور کلیدی رول ادا کیا تھا۔ عثمانیوں کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے اپنی سلطنت کے ابتدائی تشکیلی مرحلے میں ہی ایک باضابطہ اور

مستقل فوج تیار کر لی تھی۔ عثمانیوں کی اس فوج کو نہ صرف یہ کہ باقاعدہ تنخواہ ملتی تھی بلکہ یہ ایک ایسی فوج تھی جو ہمہ (ہر) وقت جنگ کے لیے مستعد اور تیار رہتی تھی۔ اس فوج کی ایک دوسری نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں سلطان اور فوج کے درمیان براہ راست تعلق ہوتا تھا۔ ان کا فوجی جاسوسی کا نظام بھی بہت عمدہ تھا جس کی وجہ سے ان کی کامیابی کے امکانات بڑھ جاتے تھے۔ اسی طرح عثمانی فوج اپنے زمانے کی دوسری فوجوں کے مقابلے نسبتاً ہلکے (کم وزن کے) اسلحے استعمال کرتی تھی جس کی وجہ سے اس کی نقل و حمل اور سفر کی رفتار بہت تیز ہو جاتی تھی۔ عثمانی فوج کی یہ بعض وہ نمایاں خصوصیات تھیں جن کے سبب وہ اپنے زمانے کی سب سے زیادہ منظم اور باقاعدہ فوج باور کی جاتی تھی اور جب تک وہ ان خصوصیات کی حامل رہی، اس وقت تک ناقابل تسخیر رہی۔ عثمانی نظام حکومت میں فوج کو ہمیشہ اہم کردار حاصل رہا۔ اس لیے اس نظام حکومت کو سمجھنے کے لیے فوج اور اس کی تنظیم کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔

1. ینی چری (نئی فوج)

عثمانی سلطنت کی طاقت اور قوت کا اصل دار و مدار اگر غور سے دیکھا جائے، تو اس کے فوجی نظام پر تھا۔ ینی چری عثمانیوں کی مستقل پیدل فوج تھی جس کا آغاز اور خاں کے زمانے میں ہوا اور جس کی حیرت انگیز شجاعت اور نظم و ضبط نے تین سو برس تک یورپ کی بڑی بڑی حکومتوں کو لرزہ بر اندام رکھا۔ یہ وہ فوج تھی جس کا نام سنتے ہی ان کے ہوش اڑ جاتے تھے۔ عثمانی حکمرانوں نے جو بھی فتوحات حاصل کیں ان میں سے زیادہ تر اسی فوج کے زور بازو کا نتیجہ تھیں۔ سولہویں صدی تک ادارہ حکومت کے دیگر ارکان کی طرح ینی چری میں بھی صرف نوعمر عیسائی لڑکے بھرتی کیے جاتے تھے۔ چوں کہ کمسنی میں ہی انہیں اپنے گھروں سے الگ کر دیا جاتا تھا اس لیے ان کے دل والدین یا وطن کی محبت سے ناآشنا رہتے تھے۔ اور ان کی تمام تر توقعات سلطان کی ذات سے وابستہ رہتی تھیں۔ وہ سلطان کے غلام ہوتے تھے اور سلطان کی بے چون و چرا اطاعت کرنے سے ان کے لیے ترقی کے راستے کھلتے تھے۔ انہیں شادی کرنے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن سلیمان اعظم کے آخری زمانے میں ینی چری کے لڑکے بھی اس فوج میں داخل کیے جانے لگے تھے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ینی چری کے لیے تجرد کا لازمی قانون پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا۔ یہ ایک ایسی بدعت تھی جو فوج کے اس نظام کے لیے خطرناک ثابت ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ سلیمان کے زمانے میں ہی کچھ مسلمان لڑکے بھی ینی چری میں داخل کیے جانے لگے تھے یہاں تک کہ کئی بار فوج کا اعلیٰ افسر بھی کوئی ایسا شخص ہو جاتا جس کے والدین عیسائی کے بجائے مسلمان ہوتے تھے۔

سلیمان اعظم کے بعد ینی چری کا نظام بکھرنے لگا۔ 1574ء میں سلطان مراد ثالث سے ینی چری دستوں نے یہ رعایت حاصل کر لی کہ ان کے لڑکے بھی ینی چری فوج میں داخل کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے دس سال بعد 1584ء میں جب ایران کے ساتھ جنگ کا موقع پیش آیا تو اس جنگ کے لیے کافی سپاہی فراہم نہیں ہو سکے۔ لہٰذا عثمان پاشا نے مجبوراً مسلمانوں کو بھی ینی چری میں بھرتی کرنا شروع کیا۔ ینی چری کی بھرتی کے طریقے میں جیسے جیسے بے قاعدگیاں بڑھتی گئیں اس فوج میں عیسائی لڑکوں کی بھرتی میں کمی آتی گئی۔ دوسری طرف سلطان قلی (سلطان کے غلام) کو جو مراعات حاصل تھیں ان کو دیکھ کر ترک کسان بھی اپنے عیسائی ہمسایوں کو راضی کر کے اپنے لڑکوں کو عیسائی بتا کر فوج میں بھرتی کرا دیتے۔ کئی بار بھرتی کرنے والے افسران بھی دھوکا کھا جاتے تھے، چشم پوشی سے کام لیتے تھے یا پھر رشوت لے کر بھرتی کر

لیتے تھے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سترہویں صدی عیسوی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے ینی چری کی ابتدائی نوعیت اور شکل بالکل بدل گئی۔ اس کی تعداد میں تو اضافہ ضرور ہوا لیکن اس کی قوت و دبدبہ کم ہو گیا۔ سلیمان اعظم کے زمانے میں ینی چری فوجیوں کی تعداد بارہ سے پندرہ ہزار تک تھی لیکن سترہویں صدی کے آخر میں جنگ ویانا (1683ء) میں یہ تعداد ستر ہزار تھی۔ ینی چری فوجیوں کی تعداد میں اضافے نے جہاں اور مسائل پیدا کیے وہیں ایک بہت بڑا مسئلہ یہ تھا کہ طاقت کے احساس نے ان کے اندر سرکشی پیدا کر دی۔ وقت بے وقت ان کی جانب سے مراعات میں اضافے کے مطالبے ہونے لگے۔ یہاں تک کہ یہ فوج خود سلطنت عثمانیہ کے لیے خطرہ بن گئی۔ بعد کے عثمانی سلاطین میں سے کئی نے وقت اور حالات کے تقاضوں کے تحت ینی چری کو از سر نو منظم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ان کے خود سر رویے کی وجہ سے انہیں اس میں کامیابی نہیں ملی۔ یہاں تک کہ سلطان محمود نے 1826ء میں اپنے وزراء اور علماء کے متفقہ فیصلے سے ایک بار پھر ان کی تنظیم نو پر توجہ دی لیکن جب یہ اس پر آمادہ نہ ہوئے بلکہ الٹا بغاوت کر دی تو پھر سلطان محمود کے حکم سے انہیں ختم کر دیا گیا۔ اس طرح اپنے قیام کے تقریباً ساڑھے چار سو برس بعد ینی چری کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔ اور وہ فوج جس نے کسی زمانے میں اپنی بہادری اور شجاعت و تنظیم سے فتوحات کے علم گاڑے تھے، جب اس کی تنظیم بکھری تو خود قصہ پارینہ بن گئی۔

2. باب عالی کے سپاہی

باب عالی کنایہ ہے عثمانی حکومت و سلطنت کا جس کا سربراہ اعلی سلطان ہوتا تھا۔ جس طرح ینی چری (نئی فوج) عثمانی سلطنت کی مستقل پیدل فوج تھی اسی طرح باب عالی کے سپاہی، عثمانی سلطنت کی مستقل سوار فوج تھی۔ پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ ادارہ حکومت میں تعلیم و تربیت کے لیے جو عیسائی لڑکے داخل کیے جاتے تھے، ان کی بنیادی تعلیم کے بعد اہلیت کو دیکھتے ہوئے ان میں سے کچھ کو اعلی تربیت کے لیے منتخب کر لیا جاتا تھا۔ ان منتخب نوجوانوں میں تربیت کے دوران جو اپنی ذہنی و دماغی قابلیت کے لحاظ سے خود کو بہترین صلاحیت کا حامل ثابت کرتے انہیں حکومت کے انتظامی شعبوں کے لیے چن لیا جاتا۔ جو امیدوار باقی رہ جاتے تھے ان کا بڑا حصہ سلطنت کی باضابطہ سوار فوج میں داخل کر لیا جاتا۔ سلطنت کے یہی سوار دستے باب عالی کے سپاہی کہلاتے تھے۔ اس سوار فوجی دستے میں صرف انہیں تربیت یافتہ امیدواروں کو شامل کیا جاتا تھا جن پر کہ سلطان کو پورا پورا اعتماد ہوتا تھا۔ باب عالی کے سپاہی، نام سے موسوم اس مستقل سوار فوجی دستے کا نظم وضبط بھی ینی چری کی طرح بہت سخت تھا بلکہ اس دستے کے سپاہی عام حالات میں ینی چری سے زیادہ باصلاحیت ہوتے تھے۔ البتہ ینی چری کی طرح ہی اس سوار فوجی دستے میں بھی سلیمان اعظم کے بعد خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ جس طرح کی بدعنوانیاں ینی چری کے نظام میں ہونے لگی تھیں اسی طرح کی بدعنوانیاں باب عالی کے سپاہی میں بھی شروع ہو گئیں۔ ینی چری کے ساتھ ہی اس فوجی دستے کا شیرازہ بھی منتشر ہو گیا۔ ینی چری کی طرح باب عالی کے سپاہی کا افسر اعلی بھی آغا کہلاتا تھا۔

3. جاگیری سپاہی

عثمانی فوج کا سب سے بڑا حصہ جاگیری سپاہیوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ فوج ینی چری اور باب عالی کے سپاہی سے بھی قدیم تھی اور اس کو 'سپاہی' کہتے تھے۔ مختلف عثمانی صوبوں میں قدیم موروثی جاگیریں قائم تھیں۔ یہ جاگیریں ان لوگوں کی تھیں جن کے باپ دادا نے عثمانی پر

چم تلے فتوحات حاصل کی تھیں اور ان کے صلے میں انہیں مفتوحہ علاقوں میں جاگیریں دی گئی تھیں۔ ان میں کچھ جاگیریں بڑی اور ان کی آمدنی زیادہ ہوتی تھی، ان کو زعامت کہا جاتا تھا۔ چھوٹی اور کم آمدنی والی جاگیریں تیمار کہلاتی تھیں۔ جاگیر دار صوبوں میں ہوتے ہوئے بھی اپنی جاگیر میں عملاً خود مختار ہوتے تھے۔ البتہ فوجی معاملات میں حکومت کے عہدے داروں کی اطاعت ان کے لیے ضروری ہوتی تھی۔ ضرورت پڑنے پر ہر جاگیر دار سوار سپاہیوں کی ایک متعین تعداد جنگ میں حصہ لینے کے لیے فراہم کرتا تھا۔ ان کے مصارف وہ جاگیر کی آمدنی سے ادا کرتا تھا۔ سلطان پر ان کی کوئی مالی ذمہ داری نہیں ہوتی تھی۔ عثمانی فوج کا بڑا حصہ انہیں جاگیری سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ سلطنت عثمانیہ کے عروج کے زمانے میں جاگیری سپاہی سواروں کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ تھی۔ جاگیری سپاہی مسلمان ہوتے تھے اور ان کا استعمال بیرونی جنگوں کے علاوہ صوبوں کی بغاوتوں کو ختم کرنے کے لیے بھی ہوتا تھا۔ مسلمان ہونے کی وجہ سے جاگیری سپاہی ادارہ حکومت سے خارج تھے اور ان کا تعلق ادارہ اسلامیہ سے تھا۔ لیکن چونکہ اس فوج کے تمام افسر ادارہ حکومت میں شامل تھے، یہ عیسائی والدین کی اولاد ہوتے تھے اور سلطان کے غلام کی حیثیت سے اس ادارے میں داخل کیے جاتے تھے۔ اور وہیں فوجی تربیت پانے کے بعد انہیں سپاہیوں کا افسر بنا کر بھیجا جاتا تھا۔ اس لیے ہم نے اس فوج کا تذکرہ ادارہ حکومت کے تحت کیا ہے۔ ینی چری کی طرح سولہویں صدی عیسوی کے بعد جاگیری سپاہی فوج کا نظام بھی منتشر ہونے لگا۔ قصر شاہی کے مقربین نے بڑی بڑی جاگیریں حاصل کر لیں لیکن ان میں سپاہیوں کو منضبط کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ بالآخر سلطان محمود ثانی کے ہاتھوں ہی ینی چری کی طرح اس فوج کا خاتمہ بھی ہوا۔

4. عثمانی بحری فوج اور قپودان (کپتان) پاشا

جس طرح عثمانی اپنے دور عروج میں دنیا کی سب سے بڑی برّی (زمینی) طاقت تھے اور ان کی فوجی قوت کا مقابلہ ایشیا اور یورپ کی کوئی دوسری سلطنت نہیں کر سکتی تھی۔ اسی طرح بحری طاقت کے اعتبار سے بھی انہیں تمام دیگر طاقتوں پر برتری حاصل تھی۔ اسپین اور وینس کے بحری بیڑے یورپ کے بہترین بحری بیڑے باور کیے جاتے تھے لیکن عثمانی بحری بیڑے نے متعدد معرکوں میں انہیں شکست دی تھی۔ عثمانیوں نے متعدد جزیرے اور ساحلی علاقے اپنی مضبوط بحریہ کی وجہ سے فتح کیے۔ عروج کے زمانے میں عثمانی بحری بیڑہ تین سو جہازوں پر مشتمل تھا۔ یہ جہاز اپنے قد و قامت اور خصوصیات کے لحاظ سے قالیون، قادرغہ، قالین، باشتردہ اور چیکتیری کہلاتے تھے۔ قالیون ان میں سب سے بڑا ہوتا تھا اور بادبان سے چلتا تھا۔ اس کے دونوں کناروں پر توپیں نصب ہوتی تھیں اور ہر جہاز میں دو ہزار سپاہی اور ملاح ہوتے تھے۔ عثمانی بحریہ کے افسر اعلیٰ یا امیر البحر کو قپودان دریا (کپتان دریا) یا قپودان پاشا (کپتان پاشا) کہتے تھے۔ اس سے چھوٹے افسر کو رئیس کہتے تھے۔ یہ سلطنت عثمانیہ کے مستقل بحری بیڑے کے علاوہ متعدد جاگیری بحری بیڑوں کا بھی امیر ہوا کرتا تھا۔ سلطنت کے ساحلی علاقوں میں قپودان پاشا کو وہی اختیارات حاصل ہوتے تھے جو صوبوں میں بیلر بے کو حاصل ہوتے تھے۔ عثمانی بحریہ کے تمام افسران اور جہاز رانوں کا تعلق ادارہ حکومت سے ہوتا تھا جو عیسائی والدین کی اولاد اور سلطان کے غلام (قلی) ہوتے تھے۔ ادارہ حکومت کی حیرت انگیز تربیت کے سبب ان کی ہیبت سولہویں صدی عیسوی کے پورے یورپ پر طاری تھی۔ فتوحات کے علاوہ بحریہ کے افسران و حکام نے بعض علمی کارنامے بھی انجام دیے جو بحری اسفار کے لیے نہایت مفید تھے۔ البتہ بری فوجوں کی طرح سولہویں صدی کے بعد عثمانی سلطنت کی بحریہ میں

بھی زوال شروع ہو گیا۔ ادارہ حکومت کے بنیادی اصولوں کی جس خلاف ورزی کے سبب عثمانی بری فوجیں اپنا معیار و کردار برقرار نہ رکھ سکیں وہی خرابیاں عثمانی بحریہ میں بھی در آئیں۔ تین سو برس بعد سلطان عبد العزیز خاں نے اپنی شاہانہ توجہ اور شوق سے عثمانی بحری بیڑے کو اتنا طاقتور بنا دیا کہ اس کا شمار یورپ کے بہترین بحری بیڑوں میں ہونے لگا لیکن مہم جوئی کی صفت جو اب عثمانی حکمراں میں عنقا ہوتی جا رہی تھی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلطان عبد الحمید خاں کے زمانے میں اس بحری بیڑے کے جہازوں کو شاخ زریں سے بھی باہر نکلنے کی نوبت نہیں آئی اور وہیں پڑے پڑے وہ زنگ آلود ہو گئے۔

4.5 ادارہ اسلامیہ

سلطنت عثمانیہ کا نظام حکومت بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم تھا۔ ایک ادارہ حکومت اور دوسرا ادارہ اسلامیہ۔ ادارہ حکومت کے بارے میں ضروری تفصیلات سے گزشتہ صفحات میں ہم واقفیت حاصل کر چکے ہیں۔ یہاں ہم ادارہ اسلامیہ پر گفتگو کریں گے۔

ادارہ اسلامیہ میں سلطنت عثمانیہ کے وہ تمام مسلمان شامل تھے جو ادارہ حکومت کا حصہ نہیں تھے یا اس سے باہر تھے اور جو کسی نہ کسی حیثیت سے عام سطح سے بلند تھے۔ ادارہ اسلامیہ کا سربراہ اعلیٰ بھی سلطان ہوتا تھا۔ ادارہ حکومت اور ادارہ اسلامیہ کے درمیان بنیادی فرق یہ تھا کہ ادارہ حکومت کے تمام ارکان تقریباً بغیر کسی استثنا کے، عیسائی خاندانوں سے لیے جاتے تھے (صرف سلطان اور اس کا خاندان اس سے بری تھا) جب کہ اس کے بالمقابل ادارہ اسلامیہ کے ارکان تمام تر مسلمان خاندانوں کے افراد ہوتے تھے۔ ادارہ اسلامیہ بنیادی طور پر علماء کے طبقے پر مشتمل تھا۔ ادارہ حکومت کی طرح ہی ادارہ اسلامیہ کا بھی اپنا الگ تعلیمی و تربیتی نظام تھا اور اس ادارے میں داخلے کے لیے ضروری تھا کہ اس کے تدریجی نظام تعلیم و تربیت سے گزرا جائے۔ چونکہ اس ادارے میں کلیدی اہمیت علماء کی جماعت کو حاصل تھی۔ اس لیے انہیں میں سے ادارے کی خاص خدمات: افتاء، قضا، مذہبی علوم وغیرہ۔ کے لیے افراد تیار کیے جاتے تھے جو مخصوص سطح کی تعلیمی و تربیتی اہلیت حاصل کرنے کے بعد مدرس، مفتی یا قاضی بن سکتے تھے۔ علماء کی اسی جماعت کے ہاتھ میں سلطنت عثمانیہ کے علوم، مذہب اور قانون کا نظام تھا۔

1. ادارہ اسلامیہ کا تعلیمی نظام

عثمانی حکمرانوں کو تعلیم اور اس کے فروغ سے دلچسپی شروع سے ہی تھی، چنانچہ دوسرے عثمانی فرماں روا اور خاں نے بڑے پیمانے پر مکاتب اور مدارس قائم کیے تھے اور ان میں بہتر تعلیم کا انتظام کیا تھا۔ اور خاں کے بعد بھی عثمانی سلاطین نے تعلیم کے فروغ کے تسلسل کو جاری رکھا۔ البتہ سلطان محمد فاتح کو ان میں خاص اہمیت اس لیے حاصل ہے کہ سلطنت میں تعلیم کی ترقی، اور اسے منضبط کرنے کے حوالے سے اس کی خدمات اپنے پیش رووں سے بہت زیادہ ہیں۔ سلطان محمد فاتح نے سلطنت کے تمام علاقوں میں خواہ وہ دیہی ہوں یا شہری بڑی تعداد میں مکاتب (ابتدائی تعلیم کے مدارس) کھولے۔ یہ مکاتب تمام قصبوں اور شہروں کے محلوں کے علاوہ بڑے بڑے دیہاتوں میں بھی کھولے گئے۔ عام طور پر مکاتب مسجدوں سے وابستہ ہوتے تھے اور ان کے اخراجات وقف کی آمدنی سے پورے کیے جاتے تھے۔ مکاتب میں تعلیم

مفت تھی اور اکثر طلبہ کے طعام و قیام کا انتظام بھی وقف کی آمدنی سے ہوتا تھا۔ ابتدائی تعلیم کے اسکولوں کے علاوہ محمد فاتح کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اعلیٰ تعلیم کے مدارس (ادارے) بھی بڑی تعداد میں سلطنت کے مختلف شہروں اور علاقوں میں قائم کیے۔ ان کے اخراجات کی تکمیل کے لیے بھی جائدادیں وقف تھیں۔ عثمانی دور کے یہ مدرسے آج کے زمانے کے کالجوں کی طرز پر تھے اور ان میں سائنسی، تکنیکی اور مذہبی ہر طرح کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اعلیٰ تعلیم کے ان مدارس میں بھی طلبہ کو جزوی طور پر مالی امداد دی جاتی تھی۔

وہ تمام لوگ جو ادارہ اسلامیہ میں کوئی سرکاری عہدہ حاصل کرنا چاہتے تھے ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ سرکاری تعلیمی مدارس میں داخلہ لے کر ان کے نصاب کی تکمیل کریں۔ ان مدارس میں زیر تعلیم طلبہ کو 'سوفتہ' کہا جاتا تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہیں دانش مند کی سند دی جاتی تھی۔ وہ طلبہ جو مکاتب کی مدرسی یا مساجد کی امامت کے خواہاں ہوتے تھے، ان کے لیے دانش مند کی سند کافی ہوتی تھی۔ البتہ وہ طلبہ جو مفتی یا قاضی بننا چاہتے تھے انہیں پہلے مرحلے کی تعلیم کی تکمیل کے بعد قانون (فقہ اور اصول فقہ) کا ایک اعلیٰ اور طویل نصاب مکمل کرنا ہوتا تھا۔ سلطنت کا مفتی اعظم خود ان طلبہ کا امتحان لیتا تھا پھر انہیں اعلیٰ تعلیم کے مدرسوں سے لے کر عدالتوں تک مختلف سرکاری نوکریوں میں ملازمت کی سند دی جاتی تھی۔

2. نظام افتاء

سلطنت عثمانیہ میں افتاء (فتویٰ جاری کرنا) کا شعبہ خاص اہمیت کا حامل تھا۔ علماء میں مفتی حضرات بہت اہم ہوتے تھے۔ ہر بڑے شہر کے قاضی کے ساتھ ایک مفتی بھی مقرر ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ بیلر بے اور سنجق بے کے ساتھ بھی مفتی ہوا کرتے تھے۔ مفتی کا تقرر تمام عمر کے لیے ہوتا تھا۔ البتہ انہیں خود معاملات میں دخل دینے کا حق حاصل نہ تھا بلکہ جب کوئی قاضی، بے یا عام آدمی ان سے فتویٰ معلوم کرتا تو ان کا فرض تھا کہ مذہب حنفی کے مطابق فتویٰ دیں۔ عام طور پر مفتی کا درجہ قاضی کے بعد ہوتا تھا لیکن عثمانی دارالحکومت قسطنطنیہ میں صورت حال اس کے برعکس تھی۔ چونکہ وہاں سلطان اور حکومت کے اعلیٰ حکام و افسران رہتے تھے اور انہیں اکثر اہم معاملات میں فتویٰ لینے کی ضرورت پیش آتی تھی اس لیے قسطنطنیہ کے مفتی کا درجہ قاضیوں سے بڑھا ہوا تھا اور یہ مفتی اعظم کہلاتا تھا۔

3. مفتی اعظم یا شیخ الاسلام

قسطنطنیہ کا مفتی دارالحکومت میں اپنے قیام اور سلطان و حکام کے ساتھ مسلسل ربط میں رہنے کی وجہ سے بہت ہی اہم ہوتا تھا کیونکہ سلطان اور حکام کو اکثر اس سے اہم امور میں فتویٰ لینے کی ضرورت پیش آتی رہتی تھی۔ اپنی اس حیثیت کی وجہ سے قسطنطنیہ کا مفتی، مفتی اعظم کہلاتا تھا۔ سلطان محمد ثانی (فاتح) نے مفتی اعظم کو شیخ الاسلام کا لقب عطا کیا جو بعد میں اس کا عام لقب بن گیا۔ مفتی اعظم یا شیخ الاسلام اپنی جماعت سے منتخب نہیں کیا جاتا تھا بلکہ سلطان اسے عموماً قاضیوں کی جماعت میں سے مقرر کرتا تھا۔ مفتی اعظم کے طور پر اسے سلطنت کے دوسرے تمام مفتیوں کو مقرر کرنے اور انہیں ترقی دینے کا حق حاصل تھا۔ سلطان سلیمان اعظم نے اپنے زمانے میں مفتی اعظم کو علماء کی جماعت کا سربراہ مقرر کر دیا اور اس حیثیت میں اس کا مرتبہ حکومت کے تمام عہدے داروں سے اونچا ہو گیا۔ سوائے اس کے کہ دیوان میں مفتی اعظم کی جگہ صدر اعظم کے بعد تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اپنے منصب کی اہمیت کے لحاظ سے مفتی اعظم قریب قریب سلطان کا ہمسر

ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس حیثیت میں وہ قانون شریعت کا شارح، وکیل اور محافظ تھا اور سلطان شریعت کے دائرے سے باہر نہیں تھا۔ عثمانی دور میں شیخ الاسلام کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ کئی بار حکمرانوں کو محض شیخ الاسلام کی مخالفت کی وجہ سے اپنے فیصلے تک بدلنے پڑے۔

4.6 نظام عدالت

عثمانی نظام حکومت میں ادارہ اسلامیہ کے تحت جو دوسرا بڑا شعبہ کام کرتا تھا وہ عدالت کا شعبہ تھا۔ عدالت کے قاضی اور جج ادارہ اسلامیہ کے تعلیمی و تربیتی نظام سے گزر کر آتے تھے اور مختلف حالات میں ان کا دائرکار یا حلقہ اختیار ادارہ حکومت سے بھی زیادہ وسیع ہو جاتا تھا۔ مثال کے طور پر سلطنت عثمانیہ سے وابستہ وہ ریاستیں (کریمیا اور شمالی افریقہ وغیرہ کی) جو براہ راست مرکزی عثمانی حکومت کے انتظام میں نہیں ہوتی تھیں بلکہ محض وابستہ حکومتیں تھیں، مگر یہ ریاستیں بھی عثمانی نظام عدالت کے ماتحت تھیں۔ عثمانی سلطنت کے قاضیوں کی عدالت میں دیوانی اور فوجداری ہر طرح کے مقدمات کے فیصلے کیے جاتے تھے۔ البتہ بعض جماعتیں اور گروپ ایسے تھے جو ان کے دائرہ اختیار سے باہر تھے مثلاً سلطان قلی (ادارہ حکومت کے افراد)، سادات اور وہ غیر ملکی باشندے جنہوں نے اپنی نو آبادیاں عثمانی سلطنت میں قائم کر لی تھیں۔ ان کی اپنی عدالتیں الگ ہوا کرتی تھیں۔ اسی طرح سلطنت کی عیسائی رعایا کے مقدمات جن میں دونوں فریق عیسائی ہوا کرتے تھے، ان کی اپنی کلیسائی عدالتوں کے سپرد تھے۔ ادارہ اسلامیہ کے قاضی ان تمام مقدمات کی سماعت کرتے تھے جو قانون شریعت سے متعلق ہوتے تھے اور جن میں دونوں فریق مسلمان یا ایک فریق مسلمان ہوتا۔ جو شخص کہ کسی شہر کا قاضی ہوتا تھا اس کے دائرہ اختیار میں اس کے آس پاس کے علاقے بھی شامل ہوتے تھے۔ عثمانی نظام عدالت میں ججوں (قاضیوں) کے پانچ خاص طبقے تھے: 1.بڑے درجے کے قاضی (مُلا)۔ 2.چھوٹے درجے کے قاضی (ملا)۔ 3.مفتش۔ 4.قاضی۔ 5.نائب۔ قاضیوں کے لیے عام نام قاضی تھا مگر لوگ احتراماً انہیں ملا کے لقب سے پکارتے تھے۔

1. قضاۃ عسکر

ادارہ حکومت کے باب میں ہم یہ پڑھ چکے ہیں کہ عثمانی حکومت کے مختلف شعبوں کے حکام میں قضاۃ عسکر بھی شامل تھے اور اس حوالے سے وہ ادارہ حکومت کی سب سے اہم مجلس دیوان کے رکن بھی ہوتے تھے۔ لیکن بایں ہمہ ان کا تعلق ادارہ حکومت سے نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ وہ ادارہ اسلامیہ کے رکن ہوا کرتے تھے۔ عثمانی سلطنت میں قاضی عسکر سب سے بڑا عدالتی منصب ہوتا تھا۔ لیکن جس طرح انتظامی مقصد کے تحت بیلر بے کی جغرافیائی تقسیم تھی یعنی ایک بیلر بے ایشیائی عثمانی مقبوضات کے لیے اور دوسرا بیلر بے یورپی عثمانی مقبوضات کے لیے، اسی طرح عثمانی سلطنت میں قاضی عسکر بھی دو ہوتے تھے۔

1.ایک قاضی عسکر اناطولیہ جو سلطنت کے ایشیائی مقبوضات کا چیف قاضی ہوتا تھا۔ 2.دوسرا قاضی عسکر رومیلیا جو سلطنت کے یورپی مقبوضات کا چیف قاضی ہوتا تھا۔ ہر قاضی عسکر کے نام سے ظاہر ہے ان قاضیوں کی اصلی حیثیت فوجوں کے ججوں کی تھی مگر بعد میں

ان کے اختیارات وسیع کر دیے گئے یہاں تک کہ یہ اپنے حلقے کے تمام ججوں (قاضیوں) کے افسر اعلی بن گئے۔ سلطان سلیمان اعظم کے زمانے تک قضاۃ عسکر کو اپنے اپنے علاقوں میں علماء کی جماعت پر وہ تمام اختیارات حاصل تھے جو سلیمان نے اپنے زمانے میں مفتی اعظم (شیخ الاسلام) کو تفویض کر دیے۔

سلطان کے نمائندے کی حیثیت سے صدر اعظم ادارہ اسلامیہ کا بھی حقیقی سربراہ ہوتا تھا اور اس کی عدالت دیوانی کے تمام مقدمات کے لیے سب سے بڑی عدالت عالیہ تھی۔ صدر اعظم کی عدالت عدالت عالیہ ہونے کے ساتھ ساتھ ابتدائی عدالت بھی تھی جس کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا رہتا تھا۔ صدر اعظم یا تو فیصلے خود کرتا تھا یا اگر اسے فرصت نہ ہوتی تو کسی قاضی عسکر یا دوسرے قاضی کے سپرد ان مقدمات کو کر دیتا تھا تاکہ ان کا جلد فیصلہ کیا جاسکے۔ عثمانی عدالتوں میں فیصلے کرنے کے لیے حنفی فقہ پر عمل درآمد ہوتا تھا۔

4.6.1 ملت سسٹم یا نظام ملت

عثمانی سلطنت میں مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مذاہب اور قوموں کے افراد بھی بڑی تعداد میں رہتے تھے اور وہ باضابطہ طور پر سلطنت کا حصہ تھے۔ ان کو مختلف حلقوں کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ادارہ اسلامیہ کی طرز پر ان حلقوں کا بھی الگ نظام تھا جو نظام ملت کہلاتا تھا۔ یہ ملتیں نہ صرف یہ کہ اپنے عائلی قوانین میں پوری طرح بااختیار اور خود مختار تھیں بلکہ اگر مقدمہ کے دونوں فریق ایک ہی ملت سے ہوتے تو ان کے دیوانی مقدمات کا فیصلہ بھی ان کی اپنی عدالتوں میں ہوتا تھا۔ عثمانی سلطنت کی یہ ملتیں اپنے مذہب کے افراد کے مذہبی فرائض انجام دینے کے علاوہ ان کی پیدائش، موت، نکاح اور وصیت ناموں وغیرہ کا ریکارڈ بھی رکھتی تھیں۔ اسی طرح یہ اپنے ہم مذہب افراد کے شخصی قوانین سے متعلق معاملات کے فیصلے بھی خود ہی کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ ان ملتوں کو اپنے اپنے حلقوں میں ٹیکس وصول کرنے کے اختیارات بھی حاصل تھے۔ حالانکہ یہ وہ فرائض ہیں جو حکومتیں خود انجام دیتی ہیں لیکن عثمانی حکمرانوں نے نہ صرف یہ کہ ان اختیارات کو صراحت کے ساتھ ملتوں کو دے دیا تھا بلکہ ان کی بحسن وخوبی انجام دہی کے لیے اپنی فوجوں سے ان ملتوں کی مدد بھی کرتے تھے۔

عثمانی سلطنت میں جو ملتیں قائم تھیں ان میں سب سے بڑی اور اہم ملت، ملت روم تھی۔ ملت روم کے حلقے میں سلطنت کی وہ تمام عیسائی رعایا شامل تھی جو مشرقی یونانی کلیسا کی پیرو تھی۔ اس عیسائی فرقے کے لوگ خواہ سلطنت کے کسی بھی حصے میں آباد ہوں اور خواہ ان کی مادری زبان کچھ بھی ہو ملت روم کا حصہ تھے۔ اس ملت کا سب سے بڑا راہنما قسطنطنیہ کا بطریق ہوتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ملت روم کے بطریق کو سلطنت عثمانیہ کے عروج کے زمانے میں اس سے زیادہ اقتدار حاصل تھا جتنا کہ بازنطینی عہد میں وہ چرچ کے ایک عہدے دار کی حیثیت سے رکھتا تھا۔ سلطنت عثمانیہ میں ملت روم کے علاوہ کچھ دوسری ملتیں بھی موجود تھیں جن کو کہ ملت روم جیسے ہی اختیارات حاصل تھے۔ مثلاً ملت ارمنی جو قسطنطنیہ کے گریگوری بطریق کے ماتحت تھی۔ ملت یہود، جس کا افسر اعلیٰ ربی اعظم ہوتا تھا۔ اسی طرح رومن کیتھولک عیسائیوں کی ملت بھی تھی جو پوپ کے ایک نمائندے کی نگرانی میں اپنے فرائض انجام دیتی تھی۔

سلطنت عثمانیہ میں ایسے بہت سے رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ آباد تھے جو سلطنت کی رعایا تو نہ تھے لیکن تجارت وغیرہ مقاصد کے تحت ایک طول عرصے سے عثمانی حدود میں مقیم تھے۔ ان لوگوں کو بھی عثمانی حکومت کی جانب سے ان کے ملکوں کے سفیروں اور

کونسلروں کے توسط سے اسی قسم کے اختیارات دیے گئے تھے جو کہ ملتوں کے افراد کو حاصل تھے۔

4.6.2 نئے نظام کی طرف

عثمانی حکمراں جب تک طاقتور رہے اور جب تک ان کے قائم کردہ ادارہ حکومت کے بنیادی نظام میں کمزوریاں پیدا نہیں ہوئیں۔ انہوں نے جس طرح کے حقوق و اختیارات مختلف ملتوں کو دیے تھے ان کی وجہ سے ان کی حکومت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ البتہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب ان کے نظام میں اصولوں کو نظر انداز کیا جانے لگا اور حکومت کے مختلف شعبوں میں کمزوریاں پیدا ہوئیں تو نہ صرف یہ کہ عثمانی حکومت زوال سے دوچار ہوئی بلکہ بیرونی سازشوں اور دباؤ کا شکار بھی ہوتی رہی۔ چنانچہ جب سلطنت عثمانیہ کو یورپ کی مغربی طاقتوں کے مقابلے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا تو سلطنت کی عیسائی رعایا نے بھی زیادہ خود مختاری کے مطالبے شروع کر دیے اور مغربی ملکوں نے عثمانی حکمرانوں پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ عیسائی آبادی والے صوبوں میں اصلاحات نافذ کریں۔ چنانچہ 1839ء کا خط گل خانہ شریف ہو یا 1854ء کا خط ہمایوں شریف۔ ان میں ان تمام اصلاحات کا اعلان کیا گیا جن کا مطالبہ مغربی ممالک کر رہے تھے۔ حالانکہ ان کے مطالبے تسلیم کر لیے گئے۔ اس کے باجود انہوں نے عیسائیوں کی خفیہ مدد کر کے عثمانی سلطنت کو منتشر کرنے کا کام بھی کیا۔

غرض انیسویں صدی کے وسط میں تنظیمات کے نام سے عثمانی نظام حکومت میں اصلاحات کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا۔ تنظیماتی اصلاحات کے نتیجے میں قدیم عثمانی نظام حکومت بالکل بدل دیا گیا اور اس کی جگہ سلطنت عثمانیہ میں مغربی طرز کا جدید نظام حکومت قائم کیا گیا۔ اس جدید نظام حکومت کے تحت حکومت کے مختلف شعبوں کے لیے الگ الگ وزارتیں قائم ہوئیں اور ہر وزارت کے لیے ذمہ دار ایک وزیر بنایا گیا۔ جو اپنے شعبے کے امور کی نگرانی کرتا تھا۔ ان اصلاحات کے نتیجے میں حکومت کے تمام شعبے مسلمانوں اور عیسائیوں کے لیے یکساں طور پر کھول دیے گئے، بڑے بڑے عہدوں یہاں تک کہ وزارتوں اور سفارتی ذمہ داریوں تک پر عیسائیوں کا تقرر ہونے لگا۔ نئی اصلاحات کے تحت حکومت کے عدالتی نظام میں بھی تبدیلی لائی گئی۔ پہلے ادارۂ اسلامیہ کے تحت صرف شرعی عدالتیں ہوتی تھیں جن میں قاضی شریعت کے قانون کے مطابق مقدمات کے فیصلے کرتے تھے۔ یہ عدالتیں شیخ الاسلام کے ماتحت ہوتی تھیں اور ان میں صرف ایک ہی قاضی یا جج ہوا کرتا تھا۔ تنظیماتی اصلاحات کے تحت عثمانی سلطنت کے طول و عرض میں مغربی طرز کی جدید عدالتیں قائم کی گئیں اور اب یہ وزیر انصاف کی نگرانی میں ہوتی تھیں اور ان عدالتوں میں اب مختلف فرقوں کے کئی جج ایک ساتھ کام کرتے تھے۔ حالانکہ شرعی عدالتوں کو بیک قلم موقوف نہیں کیا گیا لیکن اب ان میں مسلمانوں کے صرف عائلی قوانین کے مطابق وراثت اور نکاح و طلاق جیسے شخصی مقدمات کے فیصلے ہی ہوتے تھے۔ دیوانی کی جدید مغربی طرز کی عدالتوں کے ساتھ ساتھ تنظیماتی اصلاحات کے تحت مغربی طرز کی جدید فوجداری عدالتیں بھی قائم کی گئیں جن میں جرائم کی روک تھام اور سزاؤں کے لیے شریعت کے تعزیری احکام کے بجائے مغربی طرز کے تعزیری قوانین اپنائے گئے۔ اسی طرح ابتدائی عدالتیں اور مرافعہ کی عدالتیں الگ الگ قائم کی گئیں۔ اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ترکی میں بیرونی طاقتوں کے دباؤ، غیر مسلم رعایا کی تحریک اور مسلمانوں میں جدید رجحانات کے فروغ کے نتیجے میں انیسویں صدی کے وسط میں ہی نظام حکومت میں غیر معمولی مغربی طرز کی اصلاحات کا آغاز ہو چکا تھا۔ حالاں کہ ان اصلاحات کے باوجود بھی ترکی کے عیسائی مقبوضات ایک ایک کر کے اس

سے آزاد ہو گئے۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ اگر بیرونی ریشہ دوانیاں نہ ہوئی ہوتیں تو ترکی میں جس طرح اصلاحات کا عمل جاری تھا، اگر اسے جاری رہنے دیا جاتا، عثمانی سلطنت بکھرنے کے بجائے شاید متحد رہ جاتی۔

4.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- علاء الدین خان کی اصلاحات اس حوالے سے انتہائی اہمیت کی حامل ہیں کہ عثمانی حکومت کا وہ پہلا وزیر ہے جس نے اصلاحات کے توسط سے عثمانیوں کا اپنا نظام حکومت تشکیل دینے کی کوشش کی۔ اورخان کے نام کا عثمانی سکہ جاری کرنے کے علاوہ اس نے عثمانیوں کے زیر اقتدار علاقوں میں رہنے والے باشندوں کے لیے مختلف قسم کے لباس تجویز کر کے گویا ایک ممتاز مملکت اور ایک علاحدہ نظام حکومت کے خدوخال متعین کر دیے۔ اسی طرح پہلی باضابطہ، تنخواہ دار اور جنگ کے لیے ہمیشہ مستعد و تیار رہنے والی ایک پیادہ فوج تشکیل دے کر اس نے عثمانی نظام حکومت میں فوج کی اہمیت کو بھی گویا ایک طرح سے مستقل کر دیا۔
- عثمانی نظام حکومت بنیادی طور پر دو اداروں میں تقسیم تھا۔ ایک ادارہ حکومت، جس کے افراد عثمانی سلطنت کی عیسائی رعایا سے لیے جاتے تھے اور دوسرا ادارہ اسلامیہ، جو کہ سلطنت کے مذہبی، تعلیمی اور عدالتی امور دیکھتا تھا اور اس کے ارکان مسلمان رعایا میں سے لیے جاتے تھے سلطان ان دونوں مرکزی اداروں کا سربراہ اعلی ہوتا تھا۔

4.8 نمونہ امتحانی سوالات

4.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. عثمانی حکومت میں کس کے عہد میں پہلی بار پاشا کا خطاب رائج ہوا؟

(a). اورخاں (b). عثمان خاں (c). سلیمان اعظم (d). محمد فاتح

2. ادارہ حکومت کا سب سے بڑا عہدے دار کون تھا؟

(a). سلطان (b). وزیر (c). فوج (d). سب غلط

3. عثمانیوں کے نظام حکومت کے لیے باضابطہ آئین یا دستور کس نے مرتب کروایا؟

(a). محمد فاتح (b). سلیمان اعظم (c). مراد اول (d). بایزاول

4. دستور ثانی کے ذریعہ عثمانی سلطنت میں اصلاحات نظام حکومت کا تعارف کس نے کروایا؟

(a). عبدالمجید خاں (b). مراد اول (c). مراد ثانی (d). سب صحیح

5. عثمانی سلطنت کے امیر البحر کو کیا کہا جاتا تھا؟

(a). قپودان (b). قاضی عسکر اناطولیہ (c). دفتر دار (d). نشانجی

4.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. ادارہ حکومت کے بنیادی اصول کا جائزہ لیجیے۔
2. عثمانی حکومت میں سلطان کی حیثیت واضح کیجیے۔
3. عدالت کے نظام پر روشنی ڈالیے۔
4. ینی چری فوج کے آغاز وارتقا پر نوٹ لکھیے۔
5. ملت سسٹم یا ملت سسٹم پر اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

4.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. عثمانی حکومت کے نظام پر ایک جامع نوٹ لکھیے۔
2. عثمانی نظام حکومت میں فوج کی اہمیت کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
3. ادارہ اسلامیہ کے نظام پر جامع مضمون قلم بند کیجیے۔

4.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

---

1. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ (جلد دوم) : ثروت صولت، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی
2. آل عثمان : مولانا اسلم جیراج پوری، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی
3. دولت عثمانیہ (جلد اول، دوم) : ڈاکٹر محمد عزیر، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
4. تاریخ ملت (جلد سوم) : مفتی زین العابدین سجاد میرٹھی و مفتی انتظام اللہ شہابی، ادارہ اسلامیات، کراچی، پاکستان
5. مسلمانوں کا عروج اور زوال : مولانا سعید احمد ایم اے۔ فینس بکس، لاہور
6. ترکی میں مشرق و مغرب کی کش مکش خالدہ ادیب خانم (اردو ترجمہ، ڈاکٹر عابد حسین)
7. 6. دائرہ معارف اسلامیہ، (متعلقہ ابواب) دانش گاہ پنجاب، لاہور

اکائی 5: عثمانی دور میں سماجی و معاشی حالات

اکائی کے اجزا:

5.0 تمہید

5.1 مقاصد

5.2 عثمانی ترک معاشرت کا ارتقاء

5.3 عثمانی ترکوں کے سماجی حالات

5.3.1 مسلمان

5.3.2 حکمراں طبقہ

5.3.3 مسلمان جاگیر دار اور امراء

5.3.4 عام مسلمانوں کا طبقہ

5.3.5 عیسائی

5.3.6 یہودی اور تاتاری

5.4 عثمانی ترکوں کی معاشرت

5.4.1 معاشرت کی سادگی

5.4.2 مکان

5.4.3 غذا اور خوراک

5.4.4 حمام

5.4.5 قہوہ خانے

5.4.6 امن و امان کی صورت حال

5.4.7 عورتوں کے حالات

5.4.8 غلام اور کنیزیں
5.5 عام ترکوں کے اخلاق وعادات
5.6 عثمانی حکومت کے معاشی حالات
5.7 اکتسابی نتائج
5.8 نمونہ امتحانی سوالات
5.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
5.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
5.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
5.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

5.0 تمہید

عثمانی حکومت کے بارے میں یہ بات ہم پہلے ہی جان چکے ہیں کہ یہ بہت ہی وسیع رقبے اور طویل عرصے پر پھیلی ہوئی حکومت تھی۔ ایشیائے کوچک کی بازنطینی سرحد پر ایک معمولی سی جاگیر سے شروع ہونے والی یہ حکومت اپنے حوصلہ مند اور بہادر حکمرانوں کے ذریعہ بہت جلد دنیا کی وسیع ترین سلطنتوں میں سے ایک بن گئی جو دنیا کے تین براعظموں (افریقہ، ایشیا اور یوروپ) میں پھیلی ہوئی تھی۔ اسی طرح 1288ء میں اپنے قیام سے لے کر 1924ء میں خلافت کے خاتمے تک عثمانیوں کی حکومت چھ سو سال سے زائد عرصے کو محیط ہے۔ اتنے وسیع رقبے پر پھیلی اور اتنے طویل عرصے پر محیط کسی حکومت کے سماجی و معاشی حالات کو ایک مختصر سی اکائی میں بیان کر پانا بہت ہی مشکل امر ہے۔

عثمانیوں کی ابتدائی معاشرت اور معیشت کا اگر ہم ذکر کریں تو اس میں قبیلہ جاتی رنگ بہت ہی گہرا نظر آتا ہے۔ جیسے جیسے عثمانیوں کی سلطنت وسعت اختیار کرتی گئی اور ان کے روابط بازنطینی و دیگر اقوام سے استوار ہوئے ان میں ان اقوام کی معاشرتوں کے تکلفات شامل ہوتے چلے گئے۔ خاص طور پر حکمرانوں اور امیروں کے طبقے میں مفتوحہ اقوام کے تمدن کے اثرات صاف محسوس کیے جانے لگے۔ البتہ ترک عوام کا طبقہ وسیع فتوحات اور خوش حالی کے باوجود ایک طویل عرصے تک اپنی روایتی سادگی پر قائم رہا۔ اسی طرح عثمانی فتوحات کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ بڑے پیمانے پر حاصل ہونے والے مال غنیمت سے عثمانی سماج میں خوش حالی آئی بلکہ نئی نئی فتوحات کے نتیجے میں ان کے معاشی وسائل بھی روز بروز بڑھتے گئے۔ اس کے باوجود ترکوں میں وہ رذائل اخلاقیہ نہیں پیدا ہوئے جو معاشی خوش حالی کا اکثر نتیجہ ہوتے ہیں۔

ترک صرف بہادر ہی نہیں محنتی قوم بھی تھی، ان کی حکومت جس علاقے میں قائم ہوئی وہ بنیادی طور پر زرعی علاقہ تھا، وہاں زیادہ تر کھیتی باڑی کا کام ہوتا تھا۔ ترکوں نے اپنی محنت سے حکومت کی زرعی پیداوار میں بے پناہ اضافہ کیا اور اس کی خوش حالی کا سبب بنے۔ جب تک زراعت میں نئی ٹکنالوجی نہیں آئی تھی عثمانی ترک اس میں آگے رہے۔ البتہ نئی ٹکنالوجی کے سبب جب یورپی ممالک کی زرعی پیداوار کئی گنا بڑھ گئی اور ترک علاقوں میں یہ ٹکنالوجی نہیں اپنائی گئی تو ترکوں کی معیشت کو بھاری نقصان پہنچا۔ اسی طرح عثمانی حکومت کے آخری دور میں جو اصلاحات کی گئیں ان کے سبب حکومت کے اخراجات میں اضافہ ہوا۔ اسی طرح سلطنت کے مختلف علاقوں میں ہونے والی بغاوتوں کے فرو کرنے میں بھی کافی اخراجات ہوئے۔ جس کے لیے اسے بیرونی قرضے لینے پڑے۔ ان سب نے مل کر بیسویں صدی کے آغاز تک عثمانی ترکوں کی معیشت کو بدحال کر دیا تھا۔

5.1 مقاصد

اس یونٹ کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہو سکے کہ عثمانی دور کی سماجی و معاشی زندگی کیسی تھی۔ یہ جاننے کی کوشش کی جائے گی کہ عثمانی سماج میں مختلف طبقات کا رہن سہن کیسا تھا۔ لوگ کس طرح کی زندگی گزارتے تھے، لوگوں کے عادات و اخلاق کیسے تھے، عثمانی سماج کے مختلف ادوار میں عورتوں کی کیا پوزیشن تھی۔ اس کے علاوہ عثمانی دور کے معاشی حالات کیا تھے، معیشت کس طریقے سے چلتی تھی، حکومت کی آمدنی اور اخراجات کا انتظام کیسا تھا، زراعتی، تجارتی و صنعتی سرگرمیاں کس طرح تھی۔ ان سب معاملات سے آپ کو واقفیت حاصل ہوگی۔

5.2 عثمانی ترک معاشرت کا ارتقاء

ہمیں یہ معلوم ہے کہ عثمانی ترک بنیادی طور پر وسطی ایشیا کے رہنے والے تھے جنہیں تیرہویں صدی عیسوی کے سیاسی حالات نے مغربی ایشیا میں اناطولیہ (ایشیائے کوچک) کے علاقے تک پہنچا دیا۔ یہاں ان کے ایک بہادر سردار ارطغرل نے ایک جاگیر قائم کی جسے اس کے ہونہار بیٹے امیر عثمان خاں نے ایک چھوٹی سی ریاست میں تبدیل کر دیا اور پھر بعد کے اولوالعزم حکمرانوں نے اس میں اضافہ کر کے اپنے وقت کی بڑی سلطنتوں میں سے ایک بنا دیا۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو عثمانی ترکوں کی ابتدائی معاشرت نہ صرف یہ کہ بہت ہی سادہ تھی بلکہ اس میں قبائلی معاشرت کے تمام اوصاف موجود تھے۔ اگر ہم ابتدائی عثمانی حکمرانوں عثمان خاں اور اُورخاں کی معاشرت اور طرز زندگی کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ شروع کے زمانے میں دیہاتی قبائلی سرداروں کی جیسی سادہ زندگی گزارتے تھے پھر جیسے جیسے ان کے حوصلوں اور عزائم میں اضافہ ہوتا گیا، ان کی مہم جوئیاں بڑھتی گئیں اور ان کی ریاست بھی وسیع سے وسیع تر ہوتی رہی۔ نتیجے میں ان کی معاشرت میں بھی بدلاؤ آنا شروع ہوا۔ شروع میں قبائلی جاگیر کے تمام باشندے ایک ہی قبیلے کے تھے، بعد میں ان کے ساتھ اس کے شہریوں میں یونانی اور سلافی باشندوں کا بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ان کی بڑی تعداد بہ خوشی اسلام میں داخل ہو گئی۔ ان کے اور ترکوں کے باہمی میل جول سے ایک نئی معاشرت اور سماج نے جنم لینا شروع کیا جو ماضی کے بازنطینی ایشیائی مقبوضات کے معاشرے سے بھی الگ تھا اور

ترکوں کے معاشرے سے بھی۔ اس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ ایک نئی معاشرت نے جنم لیا بلکہ ایک نئی قوم بھی وجود میں آئی جو اپنے پہلے حکمراں عثمان خاں کے نام پر عثمانی کہلاتی ہے اور پھر اسی مناسبت سے اس نئی قوم کی معاشرت بھی عثمانی معاشرت کہلائی۔

چوں کہ عثمانی معاشرت اپنے آغاز میں ایک قبائلی معاشرت تھی۔ اس لیے شروع کے عثمانیوں میں نمود و نمائش کے بجائے سادگی ملتی ہے۔ امیر اور رعایا سب ایک ساتھ ایک ہی جگہ رہتے تھے۔ امیر و مامور کے کام بھی یکساں تھے یعنی کھیتی باڑی کرنے کے ساتھ بھیڑوں کے غلّے پالتے تھے۔ امیر عثمان خاں کے بارے میں آتا ہے کہ اس کی نظر میں ترک، تاتاری، عیسائی اور مسلمان سب برابر تھے۔ ابتدائی عثمانی سماج کے شاہی خاندان کے مکانات بھی عام لوگوں کے مکانوں جیسے ہی ہوتے تھے۔ ان کے گھروں میں عام برتن ہی استعمال ہوتے تھے ۔ سونے چاندی یا جواہرات یہ لوگ اکھٹا نہیں کرتے تھے۔ پہلا عثمانی امیر عثمان خاں بھی ایک معمولی کسان جیسی سادہ زندگی گزارتا تھا۔ ایک مورخ کے الفاظ میں:

''اس کی شہر میں اس کے رہنے کا جو مکان تھا، اس میں سونے چاندی کے جواہرات کی قسم سے کوئی چیز بھی اس کے مرنے کے بعد نہیں ملی، صرف ایک کفتان، ایک سوتی عمامہ، لکڑی کا ایک چمچہ، ایک نمک دان، چند خالص عربی گھوڑے، زراعت کے لیے چند جوڑ بیل اور بھیڑوں کے کچھ گلّے، علم اور اسلحہ کے علاوہ بس یہی اس کی ساری کائنات تھی۔'' (دولت عثمانیہ، اول، ص24)

اس سے ابتدائی عثمانی معاشرت کی سادگی کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ شروع کے عثمانی سماج میں عورتوں کو وہ تمام آزادیاں حاصل تھیں جو کسی بھی قبائلی معاشرے میں انہیں حاصل ہوتی ہیں۔ وہ آزادی کے ساتھ سڑکوں پر نکلتی تھیں اور بازاروں میں خرید و فروخت بھی کرتی تھیں۔ البتہ جیسے جیسے عثمانیوں کی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور مختلف قومیں ان کی سلطنت کی حدود میں شامل ہوتی گئیں۔ ان کے اثرات عثمانی ترکوں نے بھی قبول کرنے شروع کر دیے یہاں تک کہ 1453ء میں استنبول (اُس وقت قسطنطنیہ) کی فتح کے ساتھ ترکی کا سماج بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ عام اور متوسط طبقے کا عثمانی سماج تو اپنی پرانی قدروں پر آئندہ کافی دنوں تک قائم رہا۔ البتہ حکمراں طبقے میں مفتوحہ اقوام کے طور طریقوں نے بہت جلد اپنے لیے جگہ بنالی۔ مثال کے طور پر عورتوں کے لیے علاحدہ مکان، خواجہ سرا کی روایت یا تعدد ازدواج کا رواج اس وقت تک عام عثمانی سماج میں نہیں تھا لیکن بازنطینی اثرات کے تحت نہ صرف یہ کہ یہ چیزیں حکمرانوں کی معاشرت میں شامل ہوئیں بلکہ ان میں داشتہ رکھنے کا چلن بھی عام ہو گیا۔

حالانکہ بعد کے دنوں میں ترکوں کے اندر مفتوحہ اقوام کے تمدنی اثرات نے کافی جگہ بنالی اس کے باوجود ان کی عام معاشرت کی روایتی سادگی اس وقت بھی برقرار رہی۔ وہ عالی شان مکان تعمیر کرنے کے بجائے اس کی وسعت، روشنی اور ہوا کے گزر کا خاص خیال رکھتے تھے۔ کھانے پینے میں بھی تکلفات سے زیادہ صحت مند اور زود ہضم کھانوں کو ترجیح دی جاتی تھی۔ دودھ اور مختلف قسم کے پھلوں کو صاف پانی میں ابال کر روٹی کے ساتھ کھاتے تھے۔ وہ اپنے مکانوں اور مکانوں کے باہر بھی صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھتے تھے۔ عہد زوال میں بھی عثمانی ترکوں کی معاشرت وضع و ترتیب اور سادگی کا بہترین نمونہ تھی۔ علامہ شبلی نعمانی نے انیسویں صدی کی آخری دہائی میں ترکی کا سفر کیا تھا۔ ترکوں کی معاشرت کے حوالے سے ان کا مشاہدہ یہاں نقل کرنے کے لائق ہے:

’’ترکوں کی معاشرت کا طریقہ نہایت پسندیدہ اور قابل تقلید ہے۔ امراء اور معزز عہدے دار ایک طرف معمولی حیثیت کا آدمی بھی جس صفائی اور خوش سلیقگی سے بسر کرتا ہے، ہمارے ملک میں بڑے بڑے امیروں کو وہ بات نصیب نہیں۔ میں نے دس ہزار کی تنخواہ سے لے کر بیس روپیہ کی آمدنی والوں تک کے مکانات دیکھے ہیں، اگرچہ دونوں حالتوں میں نہایت تفاوت تھا اور ہونا چاہیے تھا، تاہم خوش سلیقگی اور ترتیب وصفائی میں برابر تھے۔‘‘

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ شروع سے لے کر آخری زمانے تک عثمانی سماج میں رہن سہن کی سادگی، صفائی وستھرائی، کھانے پینے میں نفاست وغیرہ خصوصیات برقرار رہیں۔ فتوحات اور دیگر اقوام سے میل جول کے نتیجے میں عثمانی سماج میں اچھائیوں کے ساتھ ساتھ بعض برائیاں بھی ضرور در آئیں۔ البتہ ان برائیوں کے اثرات عام طور پر حکمراں طبقات تک محدود رہے۔

5.3 عثمانی ترکوں کے سماجی حالات

عثمانی ترکوں کے نظام حکومت سے متعلق اکائی میں ہم یہ پڑھ چکے ہیں کہ بظاہر ایک معمولی سی جاگیر سے شروع ہونے والی عثمانی ریاست بہت جلد اپنے اولوالعزم حکمرانوں کے سبب ایک وسیع وعریض سلطنت میں تبدیل ہوگئی اور اس کے تحت ایک ایسا سماج اور معاشرہ وجود میں آیا جس میں مختلف رنگ ونسل اور زبان ومذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ رہتے اور بستے تھے۔ حالانکہ سلطنت کی سب سے بڑی آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی لیکن اس میں بڑی تعداد میں عیسائی، یہودی اور بت پرست تاتاری بھی موجود تھے، خاص طور پر سلطنت کے یورپی مقبوضات میں بڑی تعداد عیسائیوں کی تھی۔ اسی طرح عیسائیوں کی ایک تعداد اناطولیہ کے سابقہ بازنطینی مقبوضات میں بھی آباد تھی۔

5.3.1 مسلمان

سلطنت عثمانیہ کی بڑی آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی اور وہ پوری سلطنت میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں ایک تو حکمراں طبقہ تھا جو بنیادی طور پر عثمانی خاندان اور ادارۂ حکومت کے اعلیٰ حکام پر مشتمل تھا۔ دوسرا طبقہ مسلمان جاگیرداروں اور امراء کا تھا جن کے پاس بڑی بڑی جاگیریں سلطنت کے اطراف وجوانب میں موجود تھیں، جو ان کے آباء واجداد کو جنگی فتوحات یا دیگر بڑے کارناموں کے انجام دینے پر ملی تھیں۔ تیسرا طبقہ عام مسلمانوں کا تھا اور یہی اکثریت میں تھا۔ اسی طبقے میں عام ترک، عرب، یونانی، سلافی ودیگر سبھی مسلمان شامل تھے۔

5.3.2 حکمراں طبقہ

حکمراں طبقے میں سب سے زیادہ اہمیت عثمانی خاندان کے افراد کو حاصل تھی۔ یہ سلطنت کا سب سے زیادہ مراعات یافتہ طبقہ تھا۔ سلطنت کے کسی بھی فرد کے لیے کسی عہدے یا ذمہ داری پر فائز ہونے کے لیے ایک مخصوص صلاحیت کا حامل ہونا ضروری تھا لیکن عثمانی خاندان کے افراد اس کلیے سے مستثنیٰ تھے۔ سلطان سے لے کر حکومت کے کسی بھی انتظامی عہدے پر فائز ہونے کے لیے عثمانی خاندان سے تعلق کو کافی سمجھا جاتا تھا۔ شروع میں حکمراں عثمانی خاندان کے افراد بھی عام لوگوں کی سی ہی زندگی گزارتے تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ جیسے جیسے فتوحات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور مختلف تمدنوں کے افراد واقوام عثمانی سلطنت کا حصہ بنتے گئے حکمراں طبقے کے رہن سہن میں

بھی تبدیلی آتی گئی یہاں تک کہ دھیرے دھیرے وہ عام عثمانی سماج سے بالکل الگ ہو گئے۔ خاص طور پر قسطنطنیہ کی فتح کے بعد حکمراں طبقے میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان میں سخت پردے کا رواج عام ہوا۔ عورتوں کی رہائش کے لیے علاحدہ مکان تعمیر ہونے لگے، گھروں کے اندر کام کرنے کے لیے خواجہ سرا رکھے جانے لگے۔ نہ صرف یہ کہ تعدد ازدواج کو فروغ ملا بلکہ داشتہ رکھنے کی رسم کو بھی رواج ملا۔ عورتوں کو صرف عیش و آرام کا ذریعہ سمجھا جانے لگا۔ سماج سے ان کا تعلق ختم ہو گیا۔ حکمراں خاندان کے ساتھ ساتھ معاشرت کی یہ تبدیلیاں حکمراں طبقے سے تعلق رکھنے والے اعلیٰ حکام کے گھروں میں بھی وقوع پذیر ہوئیں اور وہ بھی اسی رنگ میں رنگتا چلا گیا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ عثمانی سلطنت میں اعلیٰ حکام زیادہ تر ادارہ حکومت کے توسط سے آتے تھے اور یہ وہ نوجوان ہوتے تھے جنہیں تعلیم و تربیت اور اعلی سرکاری خدمات کے لیے سلطنت کی غیر مسلم (عیسائی) رعایا سے بھرتی کیا جاتا تھا۔

5.3.3 مسلمان جاگیر دار اور امراء

سلطنت عثمانیہ میں رہنے والے مسلمانوں کا یہ وہ طبقہ تھا جس کی جاگیریں اور کاروبار وغیرہ پوری سلطنت میں پھیلا ہوا تھا۔ عام طور پر یہ بڑے جاگیر دار اور امیر دارالحکومت استنبول یا صوبائی دارالحکومتوں اور بڑے شہروں میں مقیم رہتے تھے اور وہیں سے اپنی جاگیروں کا انتظام وغیرہ کرتے تھے۔ چونکہ یہ جاگیریں انہیں یا ان کے باپ دادا کو فوجی خدمات کے صلے میں ملی ہوئی ہوتی تھیں اس لیے مرکزی یا صوبائی حکومت ان سے کوئی محصول یا ٹیکس وغیرہ نہیں لیتی تھی۔ البتہ انہیں اپنی جاگیر میں رہنے والے کاشتکاروں یا آس پاس کے راستوں وغیرہ کا خود خیال رکھنا ہوتا تھا اور ضرورت پڑنے پر یہ جاگیر دار عثمانی حکومت کو جنگ کے لیے فوج مہیا کرتے تھے۔ جاگیر داروں اور امراء کا طبقہ خوش حال ہوتا تھا اور اس کے سماجی حالات متوسط یا حکمراں طبقے سے قریب ہوتے تھے۔ حکمراں طبقے کے زیر اثر پردے کا کسی حد تک رواج ان میں بھی آ گیا تھا۔ کچھ خاص صورتوں کے علاوہ عورتیں خاندان کے باہر کے لوگوں سے نہیں مل سکتی تھیں۔ حالانکہ ان میں تعدد ازدواج عام نہیں ہوا تھا۔ البتہ لونڈیاں رکھنے کی روایت موجود تھی۔ لوگوں میں پائی جانے والی عام سادگی کے سبب ان کے مکانات عالی شان تو نہ ہوتے تھے لیکن وسیع ہوتے تھے اور اکثر باغوں کے بیچ میں ہوتے تھے۔ امراء اور جاگیر داروں میں باغوں اور حماموں کا خاص شوق پایا جاتا تھا۔

5.3.4 عام مسلمانوں کا طبقہ

اس طبقے میں نچلے متوسط درجے کے اور ادنیٰ درجے کے سبھی مسلمان شامل تھے۔ سلطنت کے مسلمانوں کی اکثریت انہیں پر مشتمل تھی۔ سلطنت کے زوال تک عام طور پر اس طبقے کے افراد بھی خوشحال تھے ان میں چھوٹے جاگیر دار، کاشتکار، کاروباری اور پیشہ ور سبھی مسلمان شامل تھے۔ یہ عام طور پر کھیتی باڑی، گلہ بانی، مختلف پیشوں اور چھوٹے کاروباروں سے وابستہ تھے۔ ان کی سماجی زندگی بالعموم تکلفات سے خالی ہوتی تھی۔ خوشحالی کے باوجود فضول خرچی سے گریز پایا جاتا تھا اور عام طور پر لوگ کفایت شعار ہوتے تھے۔ عام مسلمانوں کا یہ طبقہ شہروں اور دیہاتوں میں یکساں طور پر بکھرا ہوا تھا۔ اس میں نظم و ضبط کی پابندی پائی جاتی تھی۔ چوری، ڈکیتی یا لوٹ مار جیسی سماجی برائیوں سے عام طور پر یہ طبقہ محفوظ تھا۔ عورتوں کو عموماً آزادی حاصل تھی وہ چہرے پر نقاب ڈال کر نہ صرف یہ کہ ضرورت کے تحت

بازاروں میں جاتی تھیں بلکہ سیر و تفریح کے لیے بھی باہر نکلتی تھیں۔ بلکہ ادنیٰ درجے کی خواتین کو عام حالات میں تو امور خانہ داری کی ذمہ داری ہی انجام دینی ہوتی تھی لیکن جب ان کے گھر کے مرد سرکاری حکم پر جنگوں میں شرکت کے لیے باہر چلے جاتے تھے تو انہیں کھیتوں وغیرہ کی دیکھ بھال بھی کرنی پڑتی تھی۔

5.3.5 عیسائی

عثمانی سلطنت میں سب سے بڑی آبادی مسلمانوں کے بعد عیسائیوں کی تھی۔ ان کی اکثریت یوں تو سلطنت کے یورپی مقبوضات میں آباد تھی لیکن ایک بہت بڑی تعداد اناطولیہ یا ایشیائے کوچک کے ان علاقوں میں بھی رہتی تھی جو کبھی بازنطینی سلطنت کا حصہ رہ چکے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں نے کبھی بھی غیر مسلموں کو جبراً مسلمان نہیں بنایا۔ عثمانی سلطنت میں عیسائیوں کی بڑی تعداد کاشتکاروں پر مشتمل تھی۔ یہ کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے اور ایک متعینہ رقم خراج کے طور پر عثمانی حکومت کو ادا کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ مسلمان کوئی علاقہ فتح کر لیتے اور مفتوحہ زمینوں میں سے حکمراں کی زمینوں کو چھوڑ کر بقیہ زمینیں ان کے اصل عیسائی مالکوں کے پاس ہی رہنے دیتے تھے اور بدلے میں ان سے خراج کے طور پر معمولی محصول وصول کرتے تھے جو بالعموم اس محصول سے کم ہوا کرتی تھی جو وہ اپنے سابقہ عیسائی حکمرانوں یا جاگیرداروں کو دیا کرتے تھے۔ جیسا کہ اوپر گزرا عثمانی سلطنت کے عیسائی دو حصوں میں تقسیم تھے۔ اناطولیہ کے علاقے میں آباد عیسائی عام طور پر مہذب اور شائستہ ہوتے تھے۔ ترکوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ان کی خوبیاں ان میں در آئی تھیں اور گو صفائی ستھرائی اور رہن سہن میں وہ ترکوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے لیکن عثمانی سلطنت کے یورپی علاقوں میں رہنے والے اپنے عیسائی بھائیوں کے مقابلے وہ کہیں زیادہ بہتر تھے۔

5.3.6 یہودی اور تاتاری

سلطنت عثمانیہ میں یہودیوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ ان میں زیادہ تر وہ یہودی تھے جنہیں اسپین سے عیسائی حکومتوں نے نکال دیا تھا اور عثمانیوں نے انہیں پناہ دی تھی۔ استنبول کا ربّی اعظم سلطنت کے یہودیوں کے امور کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ عثمانی سلطنت کے یہودی زیادہ تر تجارت اور کاروبار سے وابستہ تھے۔ یہ عام طور پر بڑے شہروں میں آباد تھے اور تجارت کرنے کی وجہ سے ان میں خوشحالی بھی تھی۔ البتہ تمدنی سطح پر یہ مسلمانوں سے کافی پیچھے تھے۔ رہن سہن اور صفائی ستھرائی میں یہ مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

ایشیائے کوچک کے سرحدی علاقوں میں تاتاریوں کی بھی مختلف آبادیاں تھیں۔ ان کی ایک تعداد تو مسلمان ہو گئی تھی لیکن بعد کے زمانے تک بھی کچھ تاتاری اپنے آبائی مذہب (بت پرستی) پر قائم تھے۔ تاتاری عام طور پر کاشتکار یا کسان تھے۔

5.4 عثمانی ترکوں کی معاشرت

عثمانی سلطنت میں رہنے والے مختلف طبقات کے سماجی حالات جان لینے کے بعد اس عنوان کے تحت ہماری کوشش ہو گی کہ ہم عثمانی ترکوں کی معاشرت یا رہن سہن، کھانا پینا، خواتین وغیرہ سے متعلق امور پر روشنی ڈالیں تاکہ ان کے سماجی حالات اور بھی نکھر کر

ہمارے سامنے آجائیں اور عثمانی ترکوں کے سماج کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

5.4.1 معاشرت کی سادگی

حالاں کہ عثمانی ترکوں کے اعلیٰ طبقے نے سابقہ بازنطینی تکلفات کسی حد تک اختیار کر لیے تھے اس کے باوجود عام ترکوں میں معاشرت کی سادگی کئی سو سالوں تک برقرار رہی۔ خواہ ان کے مکان ہوں یا لباس و غذا ہو ہر جگہ اس سادگی کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

5.4.2 مکان

عثمانی ترکوں کی عمارتوں میں شان و شوکت سے پرہیز پایا جاتا ہے۔ ان کے مکان اگر چوروں سے محفوظ ہیں، گرمی، سردی اور بارش سے ان کی حفاظت کرتے ہیں تو پھر وہ زیادہ تکلفات میں نہیں پڑتے۔ البتہ وہ مکان بنانے کے لیے فطری طور پر خوبصورت جگہوں کو پسند کرتے تھے جہاں ان کو درختوں کا سایہ فراہم ہو سکے، ٹھنڈے اور میٹھے چشموں کا پانی میسر ہو اور آس پاس وسیع میدان ہوں۔ ان کے مکانوں کے ساتھ باغ، چمن یا صحن ضرور ہوتے تھے، ان میں شہتوت اور چنار کے درخت لگے ہوتے اور ہر مکان دوسرے مکان سے بالکل الگ ہوتا۔ متوسط طبقے کے ترکوں کے نہ صرف مکان وسیع ہوتے تھے بلکہ ان کے تین طرف صحن اور چمن کا ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ دیواریں گہرے سرخ رنگ کی ہوتی تھیں۔ چمن میں چنار اور شہتوت کے بلند درختوں کے علاوہ مختلف قسم کے پھل دار درخت بھی لگائے جاتے اور ایک حصے میں پھولوں اور سبزیوں (ترکاریوں) کی کاشت بھی ہوتی تھی۔ بیرونی حصے میں نیچے کے دو کمرے مردوں کے لیے مخصوص ہوتے تھے انہیں سلاملق کہا جاتا تھا۔ صاحب خانہ یہاں اپنے ملاقاتیوں سے ملتا تھا۔ مکان کا بالائی حصہ عورتوں کے لیے مخصوص ہوتا تھا اور اس حصے میں کوئی مرد داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ ترک اسے حرملق یا حرم کہتے ہیں۔ متمول عثمانیوں کے مکانوں میں حرم کا حصہ مردانہ حصہ سے الگ ہوتا تھا اور دونوں کو ایک غلام گردش ملاتی تھی جسے مقامی زبان میں مابین کہا جاتا تھا۔ ملاقات کا کمرہ یا ڈرائنگ روم اس طرح بنایا جاتا کہ اس میں پوری دیوار کے طول کے برابر دو ڈھائی فٹ چوڑے چبوترے بنے ہوتے تھے اور ان پر نرم روئی کے گدّے بچھے ہوتے تھے۔ فرش پر خوبصورت ترکی قالین بچھائے جاتے تھے۔ البتہ لوگوں کی آمد کی کثرت کے سبب قالین گندے نہ ہو جائیں قالینوں کے اوپر ڈیڑھ دو فٹ چوری کارپیٹ کی پٹیاں ڈال دی جاتی تھیں تاکہ آنے والے انہیں پر چل کر آئیں اور جائیں اور بقیہ قالین محفوظ رہے۔

5.4.3 غذا اور خوراک

عثمانی ترک جس طرح رہن سہن کے معاملے میں سادہ مزاج واقع ہوئے تھے ان کی غذا بھی تکلفات سے عاری تھی۔ مزے دار چیزوں اور چٹخارے کھانوں کا عام طور پر ترکوں کو شوق نہیں ہوتا تھا۔ عام طور پر وہ روٹی کو نمک لہسن یا پیاز ملا کر کھا لیا کرتے تھے اور اگر انہیں ایک طرح کا ترش دودھ جسے وہ برغورت کہتے ہیں مل جاتا تو پھر وہ کسی دوسری چیز کی ضرورت کم ہی محسوس کیا کرتے۔ ترک اس ترش دودھ کو بہت ٹھنڈے پانی میں ملا کر اس میں روٹی کے ٹکڑے ڈال دیتے۔ وہ اس کا استعمال بہت زیادہ گرمی اور پیاس کی حالت میں بھی کرتے تھے کیوں کہ یہ خوش ذائقہ اور زود ہضم ہونے کے ساتھ ساتھ پیاس بجھانے کی بھی غیر معمولی خاصیت رکھتا ہے۔ عام طور پر عثمانی ترکوں میں ذائقے (Taste) کے لیے جو چیزیں استعمال ہوتی تھیں ان میں ترش دودھ کے علاوہ خشک آلو بخارا، شفتالو، سفر جل، انجیر، منقی اور شاہ دانہ

عام تھیں۔ ان چیزوں کو وہ صاف پانی میں ابال کر مٹی کی بڑی بڑی کشتیوں میں رکھ لیتے اور حسب ضرورت ان پھلوں کو روٹی کے ساتھ چٹنی یا چاٹ کے طور پر استعمال کرتے۔ البتہ ان کی پر تکلف دعوتوں میں مختلف قسم کے عمدہ چاولوں اور بھیڑ، بکری اور چوزے کے گوشت کے علاوہ میٹھا کلچا اور بعض دوسری قسم کی مٹھائیاں بھی ہوتی تھیں۔

5.4.4 حمام

عثمانی ترک فطری طور پر نفاست پسند واقع ہوئے تھے - اسلام کی تعلیمات نے انہیں اور بھی زیادہ پاک باز بنا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہر مکان کے ساتھ (اگر اس کے پاس تھوڑی بہت وسعت ہوتی تو بھی) ایک حمام کا ہونا ضروری تھا۔ سلطنت کے تمام بڑے شہروں میں عام حمام بھی بڑی تعداد میں موجود تھے جن میں ہر طبقے کے لوگ جاتے تھے۔ عام حمام عورتوں اور مردوں کے لیے الگ الگ ہوتے تھے۔ یہ حمام ایک طرح کے کلب کی حیثیت رکھتے تھے جہاں لوگ نہانے اور غسل کرنے کے علاوہ Indoor تفریحات اور ملاقاتوں کے لیے بھی اکٹھا ہوتے تھے اور ان کی مناسب فیس بھی ہوتی تھی۔ غریبوں کے لیے مسجدوں اور دوسری رفاہی عمارتوں میں حمام بنے ہوتے تھے اور ان جگہوں پر وہ مفت غسل کر سکتے تھے۔ چونکہ حمام کلب کی طرح کام کرتے تھے اس لیے مردانہ حمام دن کے علاوہ شام میں بھی کھلے رہتے تھے۔ البتہ زنانہ حماموں کو شام میں بند کر دیا جاتا تھا لیکن دن کے وقت عورتوں کو ان حماموں میں جانے اور آپس میں ملاقاتیں کرنے کی آزادی تھی۔

5.4.5 قہوہ خانے

قہوہ خانے عثمانی ترکی معاشرت کا لازمی حصہ تھے جس طرح ہمارے یہاں برصغیر پاک وہند میں چائے خانوں کو سماجی زندگی میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسی طرح عثمانی دور حکومت میں سلطنت کے ہر شہر، قصبے اور گاؤں میں قہوہ خانے عام تھے اور کثرت کے ساتھ ہر جگہ موجود تھے۔ جس طرح ہمارے ہاں چائے خانے عموماً جائے ملاقات کا کام کرتے ہیں اسی طرح عثمانی ترکوں کے لیے بھی قہوہ خانے ملاقات کی جگہیں ہوتی تھیں جہاں وہ باہم ملتے ہی نہیں تھے بلکہ مقامی، ملکی اور غیر ملکی سیاست سے لے کر خانگی معاملات تک ہر موضوع پر باتیں اور مباحثے ہوتے تھے۔ عام لوگوں کے لیے اپنے خیالات کے اظہار کا ایک طرح یہاں بہترین موقع فراہم ہو جاتا تھا۔ جس طرح ہمارے یہاں کسی بھی ملاقاتی کے لیے ضیافت کے طور پر چائے پیش کی جاتی ہے اسی طرح عثمانی ترکوں میں بھی ملاقاتیوں کو قہوہ اور سگریٹ پیش کرنے کا رواج عام تھا۔ دوکان دار بھی اکثر اپنے گاہکوں کو اخلاقاً قہوہ کی پیالی پیش کرتے تھے۔ سماجی اور سرکاری ملاقاتوں کے علاوہ خالص کاروباری ملاقاتوں کے دوران بھی قہوہ اور سگریٹ کا پیش کیا جانا لازمی آداب میں سے خیال کیا جاتا تھا۔ اور اگر کوئی ایسا نہیں کرتا تو اسے انتہائی بداخلاق اور غیر مہذب سمجھا جاتا تھا۔

5.4.6 امن وامان کی صورت حال

عثمانی ترک معاشرے میں امن و قانون کی صورتحال بہت اچھی تھی۔ بہت کم ہی ایسے مواقع آتے تھے جب تنازعات کے تصفیے کے لیے پولیس کی ضرورت پیش آتی ہو۔ سڑکوں یا بازاروں میں عام طور پر جھگڑا اور فساد نہیں ہوتا تھا اور کبھی ہوتا بھی تو اس میں ترکوں کے

بجائے زیادہ تر یونانی عیسائی، یہودی یا غیر ملکی ملاح وغیرہ شامل ہوتے تھے۔ گزرگاہوں پر لوگوں کو راستہ دینا اخلاق کا حصہ تھا اور شراب کا استعمال ترکوں میں نہیں کے برابر تھا۔ مقامی کے علاوہ غیر ملکی خواتین بھی دن میں شہروں کے اندر آزادانہ اطمینان کے ساتھ گھوم پھر سکتی تھیں اور انہیں کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا تھا۔ رات کے وقت امن عامہ کا تحفظ بیگ چی (چوکیدار) کے سپرد ہوتا تھا وہ سورج ڈوبنے کے بعد سے لالٹین ہاتھ میں لیے صبح تک شہر میں گشت کرتا رہتا اور لوہے کی شام لگے ہوئے ڈنڈے کو وقفے وقفے سے سڑک پر کھٹکھٹاتا جاتا۔ غروب آفتاب کے بعد باہر نکلنے کے لیے شریف آدمی کے لیے ضروری ہوتا کہ وہ لالٹین ہاتھ میں لے کر نکلے، اس علامت کے بغیر نکلنے پر اسے قانون کے محافظوں کے سامنے جواب دہ ہونا پڑ سکتا تھا۔ امن و قانون ایسا تھا کہ چوری، نقب زنی اور ڈاکہ جیسے واقعات عثمانی ترکی سماج میں نہیں کے برابر پیش آتے تھے۔

5.4.7 عورتوں کے حالات

ترکی ہی نہیں پوری مسلم دنیا کے حوالے سے عورتوں کے بارے میں اہل یورپ کے خیالات اچھے نہیں ہیں۔ خاص طور پر حرم اور اس کی زندگی کو لے کر ان میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ حرم مکان کا وہ حصہ ہوتا تھا جس میں بے شمار عورتیں رہتی تھیں اور وہ سب یا تو صاحب خانہ کی بیویاں ہوتی تھیں یا لونڈیوں اور داشتاؤں کی شکل میں اس کے تصرف میں رہتی تھیں۔ انہیں گھر کی چہار دیواری سے نکلنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ اور ان کا کام صرف اپنے مالک (صاحب خانہ) کو خوش رکھنا ہوتا تھا۔ حالانکہ جیسا کہ عرض ہوا یہ خیال صرف اور صرف غلط فہمی کی بنا پر ہے حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ بلاشبہ ترکی میں عورتوں کے رہنے کے حصے کو حرم کہتے تھے اور اس میں صاحب خانہ کی والدہ، بیوی، بہنیں، بیٹیاں اور دیگر محرمات (جو صاحب خانہ کے سامنے بلا پردہ آسکتی ہیں) داخل تھیں۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ گھر کے اس حصے میں صاحب خانہ کے علاوہ کسی اور مرد کو داخلے کی اجازت نہ ہو بلکہ والد، خسر اور نسبتی بھائی وغیرہ گھر کے اس حصے کے اندر آتے جاتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ عثمانی دور کے امراءسے متعلق ترک سماج میں سخت پردہ تھا البتہ عورتوں کو گھروں کے اندر بالکل قید کر کے نہیں رکھا جاتا تھا۔ عورتیں تعلیم و تدریس کے لیے زنانہ مدرسوں میں جاتی تھیں۔ اسی طرح عورتوں کا ایک حرم سرا سے دوسری حرم سرا تک آنا جانا بھی رہتا تھا۔ خوشی و دیگر تقریبات کے موقعے پر گھر کے اندر گانا بجانا بھی ہوتا تھا۔ عورتوں میں مذہبی داستان گوئی کی روایت بھی موجود تھی اور اسے توجہ سے سنا جاتا تھا۔

عثمانی دور کی ترک عورتوں سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنے مرتبے اور مقام کے مطابق گھر کے انتظامات اور امور خانہ داری کی نگرانی کریں گی یا انہیں انجام دیں گی۔ خوش حال گھروں میں نوعمر لڑکیوں کو گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ سلائی کڑھائی کا ڈھنگ بھی سیکھنا ہوتا تھا اور اس کے لیے خاص معلمات اور استانیاں ہوتی تھیں۔ اسی طرح دور دراز دیہی علاقوں میں رہنے والی دہقانی عورتوں کو کئی بار گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ کھیتوں پر کام بھی کرنا پڑتا تھا، خاص طور پر اس وقت جب ان کے مرد کسی فوجی مہم پر ہوتے تھے۔ دور آخر کے عثمانی سماج میں ہمیں یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ عورتیں بیرونی تفریحات کے لیے بھی نکلتی تھیں خاص طور پر زنانہ حمام محض غسل کرنے کے لیے نہیں بلکہ پوار کلب ہوتے تھے۔ عورتیں یہاں گروپ کی شکل میں آتی تھیں دوستوں اور سہیلیوں سے ملتیں اور نئی ملاقاتیوں سے رسم و راہ

پیدا کرتیں اکثر پھل اور ناشتہ کی چیزیں بھی ان کے ساتھ ہوتی تھیں اور دن کا زیادہ تر حصہ وہ یہاں ہنسی مذاق، باتوں اور خبروں کو سننے میں گزار دیتیں۔ یہی نہیں عثمانی دور کی خواتین کھلی ہوا میں بھی تفریح کے لیے جاتی تھیں۔ خوب صورت پارک تقریباً ہر بڑے عثمانی شہر میں موجود تھے جہاں عورتوں کی ٹولیاں تفریح کے لیے جایا کرتی تھیں۔ البتہ غروب آفتاب کے ساتھ ان کا اپنے گھروں کو لوٹ جانا ضروری تھا۔

عثمانی ترکوں میں تعدد ازدواج کی روایت نہیں تھی۔ عام عثمانی سماج میں لوگوں کے یہاں ایک ہی بیوی ہوتی تھی۔ جو لوگ دولت مند اور خوش حال ہوتے ان کے یہاں بھی ایک سے زیادہ بیویوں کی مثال شاذ ونادر ہی ملتی تھی۔ اول تو یہ کہ عام سماج میں ہی ایک سے زیادہ شادی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ دوسری شادی کی صورت میں اخراجات بھی بہت زیادہ بڑھ جاتے تھے کیوں کہ نئی بیوی کے لیے ایک علاحدہ مکان کے علاوہ دیگر ضروریات کی چیزیں بھی الگ سے فراہم کرنی پڑتی تھیں۔ ترک سماج میں دوسری شادی کی ضرورت عام طور پر اسی وقت پیش آتی تھی جب پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ ہو لیکن ایسا کرنے کی صورت میں بھی بالعموم گھر کا ماحول خراب ہونے کا خطرہ رہتا تھا۔ لہٰذا زیادہ تر لوگ گریز ہی اختیار کرتے تھے۔ ایک انگریز خاتون لوسی گارنٹ انیسویں صدی کے اواخر میں ترکی کا سفر کیا تھا اور وہاں طویل عرصے تک قیام پذیر بھی رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے مشاہدات میں لکھا ہے کہ ترکی میں اپنے طویل قیام کے دوران میں ملک کے مختلف حصوں میں گئی اور وہاں اپنا وقت گزارا لیکن اس پورے عرصے میں صرف ایک بار مجھے ایک ایسے حرم (گھر) میں جانے کا اتفاق ہوا جس میں ایک سے زیادہ بیویاں تھیں۔ اس سے یہ معلوم کرنا مشکل نہیں کہ ترکوں میں تعدد ازدواج کا رواج عام طور پر نہیں تھا۔

5.4.8 غلام اور کنیزیں

اسلام نے غلامی کی حوصلہ افزائی نہیں کی ہے بلکہ ایسے اقدامات کیے ہیں جن سے بتدریج یہ ادارہ ختم ہو جائے۔ اسلام اور پیغمبر اسلام نے ایسا کیوں کیا اس پر طویل بحثیں ہوئی ہیں یہاں تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ عثمانی ترکوں کی سلطنت میں بھی غلاموں اور کنیزوں کا رواج تھا۔ بلکہ ان کے نظام حکومت میں ادارہ حکومت کے ارکان تقریباً سبھی غلاموں میں سے لیے جاتے تھے اور قلی سلطان (سلطان کا غلام) کہلانا ایک طرح سے فخر کی بات ہوتی تھی۔ لیکن سلطنت کے زوال کے آغاز کے ساتھ ہی جب عثمانی فتوحات کا سلسلہ رکا تو پھر غلاموں اور کنیزوں کی تعداد میں بھی کمی آئی کیوں کہ زیادہ تر غلام اور کنیزیں میدان جنگ سے ہی حاصل ہوتے تھے۔ بعد میں عثمانی سماج میں غلاموں اور کنیزوں کی اس کمی کو بردہ فروشی کے بازاروں سے پورا کیا جانے لگا۔ لیکن انیسویں صدی میں ہی عثمانی حکومت نے بردہ فروشی کو باضابطہ ممنوع قرار دے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت میں غلاموں اور کنیزوں کی شدید قلت ہو گئی کیوں کہ گھر اور گھر سے باہر کے بہت سارے کام یہی لوگ انجام دیا کرتے تھے۔ غلاموں کی خرید و فروخت تو تقریباً بالکل ہی ختم ہو گئی اور ان کی جگہ تنخواہ دار ملازم یا مزدوری پر کام کرنے والے نوکر کام کرنے لگے۔ البتہ کنیزوں کا رواج بیسویں صدی کے آغاز تک کسی نہ کسی شکل میں جاری رہا اور ان کی خرید و فروخت بھی ہوتی رہی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عثمانی ترک جس طرز زندگی کے عادی ہو چکے تھے اس میں حرم کی خدمت کے لیے کنیزوں کا ہونا بہت ضروری تھا۔ آزاد عثمانی عورت بغیر نقاب کے گھر سے باہر یا غیر مردوں کے سامنے نہیں جا سکتی تھی، کنیزیں اس پابندی سے آزاد تھیں۔ حالانکہ کنیزوں کی خرید و فروخت خلاف قانون تھی اس کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ خفیہ طور پر کنیزوں کی خرید و فروخت ہوتی تھی، چھ

سے دس برس تک کی لڑکیوں کی مانگ زیادہ رہتی تھی کیوں کہ تعلیم و تربیت دینے کے بعد جب وہ سولہ سترہ برس کی ہو جاتی تو اس کی قیمت دس گنا تک زیادہ ملتی تھی۔ کنیزوں کو ستار اور دف بجانے، رقص کرنے اور کشیدہ کاری کی تعلیم دی جاتی تھی، اسی طرح انہیں عثمانی سماج کے آدب ورسوم بھی سکھائے جاتے تھے اور جب وہ بڑی ہو جاتیں تو گھر کے چھوٹے بڑے سبھی کام ان کے سپرد کر دیے جاتے تھے۔ انہیں کھانا وہی کھلایا جاتا تھا جو مالکہ خود کھاتی تھی، غلطیوں پر سزا کے طور پر گھروں سے باہر نہیں نکالا جاتا تھا۔ ان کی تمام ضروریات زندگی کی ذمہ دار مالکہ ہوتی تھی اور سات سال کی مدت (خدمت) کے بعد کنیز آزادی کی مستحق ہو جاتی تھی اور عام طور پر مالکہ اسے اس وقت آزاد کر کے کسی بھلے آدمی سے اس کی شادی کر کے رخصت کر دیتی تھی۔ کئی بار آزاد ترک بھی اپنے حالات کے سبب آزاد عورتوں کے بجائے ان عورتوں سے شادی کو ترجیح دیتے تھے جو کنیز رہ چکی ہوں۔ کیوں کہ اس طرح وہ شادی کے اخراجات سے بچ جاتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں ترکی کنیزوں کے حالات مغربی ملازماؤں سے بہتر تھے۔ عثمانی ترک سماج میں غلاموں اور کنیزوں کو آزاد کرنا بہت ہی نیک کام سمجھا جاتا تھا۔ اکثر ترک مرد اور عورتیں بستر مرگ پر اپنے غلاموں اور کنیزوں کو آزاد کر دیا کرتے تھے۔ بہت سے لاولد افراد اور بیوائیں اکثر اپنے خریدے ہوئے غلاموں اور کنیزوں کو آزاد کر کے متبنیٰ (بیٹا یا بیٹی) بنالیتی تھیں اور انہیں اپنا وارث قرار دے دیتی تھیں۔ آزاد ہونے کے بعد ترکی سماج میں غلاموں اور کنیزوں کو وہ تمام حقوق و اختیارات حاصل ہو جاتے تھے جو عام آزاد عثمانی ترکوں کو حاصل ہوتے تھے۔

5.5 عام ترکوں کے اخلاق و عادات

عثمانی تاریخ کے مؤرخین اور وقائع نگاروں نے عام طور پر عثمانی ترکوں کے اخلاق و عادات کی تعریف کی ہے۔ بلاشبہ وسطی ایشیا سے کوچ کر کے ایشیائے کوچک کو اپنا وطن اور مسکن بنانے والے ترک بہادری اور راست بازی جیسی صفات عالیہ سے متصف تھے۔ لیکن ایشیائے کوچک میں داخلے کے بعد جب وہ اسلام کی دولت سے مالا مال ہوئے تو اسلامی تعلیمات نے ان کی ان صفات میں فرماں برداری اور پرہیز گاری کے ذریعہ چار چاند لگا دیے۔ شجاعت و بہادری، راست گوئی و راست روی، اطاعت شعاری و فرماں برداری اور پھر تقویٰ و پرہیز گاری نے مل کر ان کے اخلاق و کردار میں ایسی سلامت روی پیدا کی کہ ان کے دشمن بھی اہم معاملات میں انہیں پر بھروسہ کرتے تھے۔ عہد زوال کے عثمانی ترکی معاشرے میں بھی ترکوں کی ایمانداری اور راست روی کی ایسی چھاپ موجود تھی کہ عیسائی و دیگر مذاہب کے تاجر اور کاروباری بھی ان کی ایمان داری کی نہ صرف داد دیتے تھے بلکہ جب انہیں کوئی ایسا معاملہ کرنا پڑتا جس میں کامل ایمان داری کی ضرورت ہوتی تو وہ اپنے ہم مذہب آرمینی و یونانی عیسائیوں یا یہودیوں پر ترک مسلمانوں کو ترجیح دیتے تھے اور انہیں کے ساتھ معاملہ کرتے تھے۔ ترکوں کے اخلاق کے بارے میں علامہ شبلی نعمانی اپنے سفر نامہ مصر و شام و روم میں لکھتے ہیں:

''کچھ شبہ نہیں کہ ترکوں کے اخلاق نہایت وسیع اور فیاضانہ ہیں غرور و نخوت، ترفع اور کم بینی، ان میں نام کو نہیں۔ امیر و غریب، مزدور و عہدے دار، وضیع و شریف، جاہل و عالم ہر درجہ کے لوگوں سے مجھ کو سابقہ پڑا، لیکن خوش اخلاقی اور فیاض طبعی میں گویا سب ایک ہی مکتب کے شاگرد اور ایک ہی سانچے کے ڈھلے تھے۔ غازی عثمان پاشا جن کو پلونا کے واقعہ نے تمام دنیا میں روشناس کر دیا ہے اور درویش پاشا جن کا پوتا سلطان کی دامادی کا شرف رکھتا ہے، اس مرتبہ کے لوگ ہیں جیسے ہندوستان میں گورنر جنرل یا کمانڈر اِن چیف، میں

دونوں سے ملا ہوں اور وہ جس تواضع اور خوش اخلاقی سے پیش آئے، اس کا اثر اب تک میرے دل میں ہے۔

ایک عام بات ہے کہ بازار میں چلتے چلتے تم جس شخص سے، گو وہ کسی رتبہ کا آدمی ہو، راستہ پوچھو وہ نہایت مہربانی سے تمہاری طرف متوجہ ہو گا اور تم کو راستہ بتائے گا، بعض موقعوں پر مجھ کو نہایت تنگ اور پیچ دار گلیوں سے گزرنے کا اتفاق ہوا اور راستہ کے بھول جانے کی وجہ سے دیر تک حیران رہا، اتفاقاً کوئی ترک آنکلا تو اس نے راستہ بتانے پر اکتفا نہیں کی بلکہ ساتھ ہو لیا اور جہاں مجھ کو جانا تھا وہاں تک پہنچا کر واپس آیا۔

فیاضی اور مہمان نوازی ترکوں کی عام صفت ہے اور نہایت ادنیٰ درجہ کے لوگ بھی نہایت سیر چشم اور فیاض ہیں، یہ عام طریقہ ہے کہ دو چار چشم آشنا کسی ہوٹل یا قہوہ خانہ میں اتفاق سے مل گئے تو قہوہ وغیرہ میں جو کچھ خرچ ہو گا ایک شخص سب کی طرف سے دے دے گا، گویا تمام لوگ اس شخص کے مہمان ہوتے ہیں اور وہ میزبان ہوتا ہے۔"

بلاشبہ عثمانی ترکوں نے دنیا کے ایک بہت بڑے رقبے پر طویل ترین حکمرانی کی لیکن اس کے باوجود ان کے اخلاق وعادات میں اس طرح کی خرابیاں نہیں پیدا ہوئیں جو عام طور پر حکمراں قوموں میں بہت جلد پیدا ہو جاتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ چھ سو برس تک حکومت کرنے کے باوجود بحیثیت مجموعی ان کے اندر سے سپاہیانہ خوبیاں ختم نہیں ہوئیں اور اسی وجہ سے دور زوال میں بھی بار بار وہ سنبھالا لیتے رہے اور اس میں تقریباً تین سو برس کا عرصہ لگ گیا۔ عثمانی ترک شراب اور جوئے جیسی قبیح سماجی برائیوں سے عام طور پر محفوظ تھے اور صفائی ستھرائی میں بھی ہم سایہ قومیں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ یہاں تک کہ جب ایک دیہاتی قہوہ خانے میں ایک عیسائی کسان سے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے ہاتھ منہ دھو لینے کو کہا گیا تو اس کا جواب تھا کہ میں کوئی ترک ہوں کہ ہمیشہ خود کو دھوتا رہوں۔ غیر عورتوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ تو دور کی بات رہی عثمانی ترک اپنی عورتوں سے بھی سڑک پر کھڑے ہو کر بات نہیں کرتے تھے۔ وہ عورتوں اور بچوں پر ہی نہیں جانوروں پر بھی مہربان ہوتے تھے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ عثمانی ترکوں کی زندگی پر اسلام کی تعلیمات نے گہرا اثر ڈالا تھا اور اسلامی اخلاقیات ان کی روزمرہ کی زندگی میں رچی بسی ہوئی تھی۔

5.6 عثمانی حکومت کے معاشی حالات

ہمیں یہ معلوم ہے کہ عثمانی حکومت کا آغاز ایشیائے کوچک میں جسے اناطولیہ بھی کہا جاتا ہے ایک چھوٹی سی جاگیر سے ہوا تھا۔ تیرہویں صدی عیسوی اور چودھویں صدی عیسوی کی دنیا پر اگر ہم نظر دوڑائیں، اور اس کے بعد بھی یورپ کے صنعتی انقلاب تک، تو ہمیں معلوم ہو گا کہ اس زمانے کی دنیا میں معیشت کی بنیاد زراعت یا کھیتی باڑی پر قائم تھی۔ عثمانی سلطنت کی معیشت بھی بنیادی طور پر زراعت سے وابستہ تھی۔ یہاں تک کہ عثمانی سلطنت کے تقریباً سبھی حکمراں زرعی زمینوں کے مالک ہوتے تھے اور اس کے ذریعہ انہیں خاصی آمدنی بھی حاصل ہوتی تھی۔ چنانچہ پہلا عثمانی حکمراں امیر عثمان خاں نہ صرف یہ کہ زرعی زمینوں کا مالک تھا بلکہ انتقال کے بعد جو مختصر اثاثہ اس نے اپنے جانشین کے لیے چھوڑا اس میں کھیتی باڑی کے کام کے لیے چند جوڑے بیل بھی تھے۔

کسی بھی دوسرے ملک کی معیشت کی طرح عثمانی سلطنت کی معیشت کی بنیاد بھی آمدنی کے تین ذرائع پر تھی یعنی زراعت، تجارت اور صنعت۔ البتہ عثمانی سلطنت کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ وہ فتوحات بھی تھیں جو اس خاندان کے حوصلہ مند حکمرانوں کی قیادت میں تین سو برس سے بھی زیادہ عرصے تک جاری رہیں۔ جب تک فوجی مہمات اور ان کے نتیجے میں فتوحات کا سلسلہ جاری رہا، عثمانی حکومت کی آمدنی کا یہ سب سے بڑا ذریعہ رہیں۔ بعد میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں جب فتوحات کا سلسلہ رک گیا تو پھر اس کے ساتھ ہی آمدنی کا یہ بڑا ذریعہ بھی بند ہو گیا۔ ساتھ ہی حالات کے بدلنے اور فوج و حکومت میں نئی اصلاحات کے سبب حکومت کے اخراجات میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا جو عثمانی معیشت کے دوسرے شعبوں سے پورے نہیں کیے جاسکتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عثمانی حکومت دھیرے دھیرے قرضوں کے بوجھ میں دبتی چلی گئی اور آخری ایام میں حکومت کی معاشی بدحالی نے بھی اس کے زوال میں اہم رول ادا کیا۔

جنگی فتوحات سے حاصل ہونے والی آمدنی کے علاوہ عثمانی حکومت کا معاشی نظام بنیادی طور پر زراعت اور اس سے وابستہ گلہ بانی وغیرہ کاموں پر قائم تھا۔ نظام حکومت کے تحت ہم یہ پڑھ چکے ہیں کہ سلطنت میں دو طرح کی جاگیریں تھیں۔ بڑی جاگیروں کو زعامت کہا جاتا تھا اور چھوٹی جاگیروں کو تیار کہا جاتا تھا۔ یہ جاگیریں لوگوں کو جنگی فتوحات میں نمایاں کارناموں کے انجام دینے کی وجہ سے ملی ہوتی تھیں۔ ان کی آمدنی زیادہ تر جاگیر دار خود استعمال کرتے تھے۔ البتہ اس کے بدلے میں وہ وقت ضرورت سلطنت کو جنگ کے لیے اپنی جاگیر کی وسعت کے اعتبار سے فوجی فراہم کرتے تھے، جنہیں کہ جاگیری فوجی کہا جاتا تھا۔ ان کی کوئی بھی ذمہ داری عثمانی حکومت پر نہیں ہوتی تھی جاگیر دار ان کی فراہمی کا ذمہ دار ہوا کرتا تھا۔ البتہ امن کے دنوں میں ان جاگیرداروں کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہوتی تھی کہ وہ اپنی جاگیروں اور آس پاس کے علاقوں سے گزرنے والی سڑکوں کی مرمت، دیکھ بھال اور حفاظت کا انتظام بھی کریں گے۔ ان سے عشر کے علاوہ عام طور پر کوئی دوسرا ٹیکس نہیں لیا جاتا تھا۔

شمالی افریقہ، مغربی ایشیا اور مشرقی یورپ کے علاقوں پر پھیلی ہوئی وسیع عثمانی سلطنت کے علاقوں پر اگر ہم نظر دوڑائیں تو پائیں گے کہ ان میں بہت بڑا زرخیز علاقہ شامل تھا اور ان کی پیداوار سلطنت کی غذائی ضروریات سے زیادہ تھی۔ حالانکہ فتوحات کے ذریعہ جو علاقے عثمانی حکومت کے زیر قبضہ آتے تھے ان میں زیادہ تر زمینیں ان کے اصل مالکوں کے پاس ہی چھوڑ دی جاتی تھیں اور بدلے میں ان سے خراج لیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ بہت زیادہ زمینیں وہ بھی ہوتی تھیں جو امراء اور حکام سے حاصل ہوتی تھیں۔ ان کا مالک عثمانی سلطان ہوتا تھا جو ان میں سے کچھ علاقے فوجی خدمات کے بدلے میں بطور جاگیر لوگوں کو عطا کر دیتا تھا، اس کے بعد بھی جو علاقے رہ جاتے تھے وہ سلطان کی ملکیت ہوتے تھے۔ انہیں عام طور پر بٹائی (مشارکت) پر دے دیا جاتا تھا اس سے بھی سلطان اور حکومت کو کافی آمدنی ہوتی تھی--- یہ بات ہمیں یہاں یاد رکھنی چاہیے کہ عثمانی سلطنت کی آمدنی دو حصوں میں تقسیم تھی۔ ایک حصہ سلطان کی ذاتی ملکیت ہوتا تھا اور اس کے اہل خاندان کے زیر تصرف رہتا تھا جب کہ بڑا حصہ حکومت کا ہوتا تھا اور وہ حکومت کے ملازموں اور رفاہی و دیگر کاموں پر خرچ ہوتا تھا--- ہم نے ینی چری کے باب میں یہ پڑھا ہے کہ ینی چری فوجیوں کی ایک تعداد کو انتخاب کے بعد تربیت کے لیے دیہی علاقوں میں بھیج دیا جاتا تھا۔ جہاں وہ فوجی تربیت کے ساتھ کھیتی باڑی کے کام بھی کرتے تھے۔ تربیت کے دوران مستقبل کے فوجی نوجوانوں کی زراعتی کاموں میں

مشغولیت انہیں سلطانی زمینوں پر ہوتی تھی۔

سلطنت کی زیادہ تر زمینیں چھوٹے کسانوں کے زیر تصرف تھیں اس میں سلطنت کی مسلمان اور غیر مسلم دونوں طرح کی رعایا شامل تھی۔ کسان ترک ہوں یا عیسائی دونوں بہت زیادہ محنتی ہوتے تھے۔ یہ لوگ کھیتی کی پیداوار بڑھانے کے لیے ان تھک کوشش کرنے کے ساتھ ساتھ گلہ بانی اور مویشی پروری کا کام بھی کرتے تھے جس سے نہ صرف یہ کہ ان کی آمدنی میں اضافہ ہوتا تھا بلکہ اکثر یہ کافی خوش حال بھی ہوا کرتے تھے۔ عثمانی سلطنت ان کسانوں میں سے مسلمان کسانوں سے عشر اور نصف عشر کے علاوہ بہت معمولی ٹیکس لیا کرتی تھی اور غیر مسلم جو عام طور پر عیسائی کسان ہوا کرتے تھے ان سے خراج کی شکل میں ایک معمولی رقم لی جاتی تھی جو عام طور پر مسلمانوں سے لیے جانے والے عشر اور ٹیکس سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ سلطنت کا بیشتر مالیہ (آمدنی) ٹیکس کے اسی نظام کے ذریعہ فراہم ہوتا تھا اور عام طور پر دور عروج میں یہ حکومت کی انتظامی اور رفاہی کاموں سے متعلق ضروریات کے لیے کافی ہوتا تھا سلطنت عثمانیہ کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ وہ حرمین کے باشندوں سے کوئی ٹیکس وغیرہ نہیں لیتی تھی بلکہ اس کے برعکس مصر کے صوبے سے اسے جو آمدنی ہوتی تھی اس کا بڑا حصہ وہ حرمین اور وہاں کے باشندوں کی ضروریات کے لیے وقف رکھتی تھی۔

سلطنت عثمانیہ کی معیشت کا ایک اہم عنصر صنعت بھی تھی، دور عروج میں اس حکومت کی سب سے بڑی صنعت شاید فوجی ساز و سامان کی مصنوعات سے متعلق تھی۔ چوں کہ عثمانی حکومت ایک فوجی حکومت تھی اور دور عروج میں اس نے بڑی بڑی فوجی مہمات سر کی تھیں۔ نیز سلطنت کے وسیع علاقوں کو قابو میں رکھنے کے لیے بھی بہت بڑی فوج کی ضرورت تھی اس لیے یہاں پر فوجی ساز و سامان کی صنعت کو بہت زیادہ فروغ ملا اور یہاں کی فوجی استعمال کے لیے تیار کی جانے والی مصنوعات نہ صرف مملکت کے اندر ان کی مانگ ہوتی تھی بلکہ بیرون سلطنت بھی ان کی سپلائی (فراہمی) ہوتی تھی۔ سلطنت کے بعض علاقوں خاص طور پر بلقان کے علاقے میں مویشی پروری، وہاں کی اون اور کھال کی صنعت سے وابستہ تھی۔ اس علاقے میں اون اور چمڑے سے بنے ہوئے ملبوسات اور دیگر مصنوعات بڑے پیمانے پر تیار ہوتی تھیں۔ البتہ یہ کہا جائے گا کہ صنعت کی ترقی کے معاملے میں عثمانی حکومت کی دلچسپی کچھ زیادہ نہیں تھی یہی وجہ ہے کہ یورپ میں صنعتی انقلاب آجانے کے بعد یورپی ممالک تو ترقی کے راستے پر کافی آگے نکل گئے اور عثمانی حکومت اپنی روایتی صنعتوں میں ہی الجھی رہ گئی اور نتیجے میں بہت پیچھے رہ گئی۔ اور یہ بھی اس کے زوال کا ایک سبب قرار پایا۔

استنبول یا قسطنطنیہ کی فتح کے بعد عثمانی سلطنت نہ صرف یہ کہ دنیا کی سب سے بڑی فوجی طاقت بن گئی بلکہ اس کے ساتھ ہی عالمی تجارت کی شہ رگ بھی اس کے ہاتھ میں آگئی۔ استنبول کا شہر مشرق اور مغرب کے درمیان ہونے والی تجارت کی سب سے بڑی اور اہم گزرگاہ تھا۔ نہ صرف یہ کہ دنیا کی بحری تجارت کے بیشتر سامان اس کے ساحلوں سے ہو کر گزرتے تھے بلکہ زمینی تجارت کے بھی اکثر کارواں اور قافلے استنبول سے ہو کر گزرتے تھے۔ استنبول کی اس اہمیت اور عثمانی تجارت کی اس ترقی کا راز یہ تھا کہ سمندر میں تجارتی جہازوں کی حفاظت کے لیے اس کا مضبوط بحری بیڑہ موجود رہتا تھا جس کے سبب بحری قزاق ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے تو دوسری طرف زمینی تجارت کے راستے پر پوری عثمانی سلطنت میں کارواں سرایوں کا ایک جال بچھا ہوا تھا۔ یہ کارواں سرائیں مسافروں اور تاجروں کے

ٹھہرنے اور آرام کا انتظام ہی نہیں کرتی تھیں بلکہ ان کی حفاظت اور راستوں کے امن و امان کی بھی ذمہ دار تھیں۔ پوری عثمانی سلطنت میں جس طرح کا امن قائم تھا اس کے سبب زمینی تجارت کو بڑے پیمانے پر فروغ حاصل ہوا۔ سلطنت کے اندر اور باہر جو تجارت ہوتی تھی اس میں ریشم، چائے، مسالہ جات، چمڑا، اونی ملبوسات، اناج، دالیں، خوشبو، شیشے کی مصنوعات، دوائیں وغیرہ اشیاء خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حکومت عثمانی تجارتی سرگرمیوں کی صرف سرپرستی ہی نہیں کرتی تھی بلکہ اس نے تجارتی سامانوں کی درآمد اور برآمد سے متعلق اصول اور ضابطے بھی بنا رکھے تھے اور اس میں تاجروں کے مفادات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا تھا۔ اندرون سلطنت بیرونی تاجروں کو تجارت کے لیے لائسنس فراہم کیا جاتا تھا۔ قیمتوں کی نگرانی کے لیے سلطنت کے قاضی وقتاً فوقتاً بازاروں کا معاینہ بھی کرتے رہتے تھے تاکہ دھوکہ دہی کو روکا جاسکے۔ اسی طرح اشیاء پر منافع کو دس فی صد تک محدود رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ دوسرے ملکوں کے تاجروں کو سلطنت کے اندر تجارت کرنے کے لیے نہ صرف یہ کہ تجارتی لائسنس اور اجازت نامے جاری کیے جاتے تھے بلکہ انہیں ہر طرح کا تحفظ بھی فراہم کیا جاتا تھا۔ ان کی الگ مخصوص آبادیاں قائم کی جاتی تھیں اور ان کے مذہبی معتقدات کا بھی خیال بھی رکھا جاتا تھا اور اگر ان کے درمیان باہمی کوئی تنازع ہو جاتا تو ان کے مذہبی قانون کے تحت ان کے مذہبی رہنماؤں کے ذریعہ ہی ان کا تصفیہ ہوتا تھا۔ تجارتی سرگرمیوں میں عثمانی حکام کی دلچسپی اور ان کے ذریعہ ان سرگرمیوں کی سرپرستی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب پندرہویں صدی کے آخر میں (1492ء) یہودیوں کو اسپین سے نکال دیا گیا تو انہیں پورے تحفظ کے ساتھ عثمانی سلطنت میں پناہ دی گئی یہاں تک کہ بہت جلد وہ عثمانی تجارت کے ایک بہت بڑے حصے پر چھا گئے۔ عثمانی حکمرانوں نے تجارت کے فروغ کے لیے دوسرے ملکوں کے ساتھ اشتراک اور معاہدے کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ سب سے پہلے فرانس کو سلطنت کے اندر تجارت کرنے کے لیے 1534ء میں تجارتی حقوق عطا کیے گئے۔ بعد ازاں اسی طرح کے تجارتی حقوق 1567ء میں برطانیہ کو بھی دیے گئے۔ لیکن ایک طرف عہد زوال میں سلطنت کے علاقوں پر حکومت کا کنٹرول کم ہوا ۔نتیجے میں راستے غیر محفوظ ہوئے اور تجارتی سرگرمیاں سرد پڑنے لگیں تو دوسری طرف تجارت کی سرپرستی جیسی پہلے کے حکمراں کرتے رہے تھے وہ سلسلہ جاری نہیں رہ سکا۔ اسی دوران حالات بدلے، بھاپ کی طاقت کی دریافت نے اہل یورپ کی تقدیر ہی نہیں ان کی مہم جوئی کی نئی تاریخ بھی رقم کی۔ دخانی جہازوں کے ذریعہ انہوں نے بحری تجارتی اسفار کو ہی نہیں آسان بنایا بلکہ تجارت کے نئے بحری راستے بھی دریافت کر لیے جس کے نتیجے میں استنبول کی سابقہ حیثیت ماند پڑنے لگی اور دھیرے دھیرے اس کی تجارتی اہمیت تقریباً ختم ہو گئی۔

5.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- خلاصہ یہ کہ عثمانی عہد کا سماج ایک سادہ ترک سماج تھا۔ ابتدائی زمانے میں حکمرانوں اور عام رعایا کے طرز زندگی میں بہت زیادہ فرق نہیں تھا۔ اس کے حکمراں بھی دیہاتی قبائلی سرداروں جیسی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ جیسے جیسے ان کی سلطنت میں توسیع ہوتی گئی عثمانی سماج بھی پھیلتا چلا گیا نئے مقبوضات خاص طور پر بازنطینی سلطنت کے ایشیائی اور یورپی علاقوں میں عثمانی سلطنت کی توسیع نے ان علاقوں کے رہن سہن اور طور طریقوں کو بھی اپنی سماجی زندگی کا حصہ بنالیا۔

- سماج میں حکمراں طبقے میں بھی خواتین کو وہ تمام آزادیاں حاصل تھیں جو کسی بھی قبائلی سماج کا خاصہ ہوتی ہیں یعنی وہ آزادی کے ساتھ سڑکوں پر نکلتی تھیں، بازاروں میں خرید و فروخت کرتی تھیں لیکن قسطنطنیہ کی فتح کے بعد معاملہ ایسا نہیں رہا اب عورتوں کے لیے سخت پردے کا اہتمام ہونے لگا، ان کے لیے علاحدہ مکان بنائے جانے لگے، خواجہ سرا کی روایت عام ہوئی اور تعدد ازدواج کی مثالیں بھی ملنے لگیں۔ لیکن تمدنی اثرات کی قبولیت کے باوجود عثمان ترک سماج میں سادگی برقرار رہی اور اسلامی تعلیمات کے زیر اثر عثمانی سماج اپنے عروج کی انتہائی بلندیوں پر بھی ان تمدنی برائیوں سے محفوظ رہا جو اکثر اس طرح کے سماجوں میں عام ہو جاتی ہیں۔
- اسی طرح عثمانی دور میں لوگوں کی معیشت کا زیادہ انحصار زراعت پر تھا۔ محنتی ترک کسانوں کے سبب سلطنت میں خوشحالی عام تھی۔ صنعت میں شروع کے دنوں میں فوجی استعمال کی چیزوں کے علاوہ اون سے بنے ہوئے کپڑے، چمڑے کی مصنوعات وغیرہ کو اہمیت حاصل تھی۔ تجارت کے معاملے میں عثمانی تاجر مشرق و مغرب کی تجارت پر چھائے ہوئے تھے۔ تمام بحری اور بری راستے دارالخلافہ استنبول سے ہو کر گزرتے تھے۔ اس لیے سلطنت میں تجارتی سرگرمیاں زوال سے پہلے تک عروج پر تھیں۔

5.8 نمونہ امتحانی سوالات

5.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. سلطنت عثمانیہ کی بڑی آبادی کس پر مشتمل تھی؟

(a). مسلمان (b). عیسائی (c). یہودی (d). سب غلط

2. عثمانی سلطنت میں بڑی جاگیروں کو کیا کہا جاتا تھا؟

(a). زعامت (b). تیمار (c). مشارکت (d). گلہ بانی

3. عثمانی سلطنت میں چھوٹی جاگیروں کو کیا کہا جاتا تھا؟

(a). تیمار (b). زعامت (c). مشارکت (d). سب صحیح

4. قہوہ خانے عثمانی ترکی معاشرت کا لازمی حصہ تھا؟

(a). صحیح (b). غلط

5. قسطنطنیہ کی فتح کے بعد عثمانی سلطنت دنیا کی سب سے بڑی فوجی طاقت بن گئی تھی؟

(a). کمزور ہوئی (b). طاقتور ہو گئی (c). سب غلط

5.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. عثمانی سماج میں عام مسلمانوں کی صورت حال کا جائزہ لیجیے۔

2. ترکی معاشرے میں قہوہ خانے پر اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

3. عثمانی سلطنت میں عیسائیوں کے حالات پر گفتگو کیجیے۔

4. ترکوں کے اخلاق وعادات پر مختصر روشنی ڈالیے۔

5. عثمانی سماج میں عورتوں کے حالات پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

5.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. عثمانی معاشرت کے ارتقاء پر ایک مضمون لکھیے۔

2. عثمانیوں کے سماجی حالات سے بحث کیجیے۔

3. عثمانی حکومت کے معاشی حالات کا تفصیلی ذکر کیجیے۔

5.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ (جلد دوم): ثروت صولت، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی
2. آل عثمان : مولانا اسلم جیراج پوری، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی
3. دولت عثمانیہ (جلد اول، دوم) : ڈاکٹر محمد عزیر، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
4. تاریخ ملت (جلد سوم) : مفتی زین العابدین سجاد میرٹھی و مفتی انتظام اللہ شہابی، ادارہ اسلامیات، کراچی، پاکستان
5. مسلمانوں کا عروج اور زوال : مولانا سعید احمد ایم اے۔فیمس بکس، لاہور
6. ترکی میں مشرق و مغرب کی کش مکش : خالدہ ادیب خانم (اردو ترجمہ، ڈاکٹر عابد حسین)
7. اردو دائرہ معارف اسلامیہ، (متعلقہ مضامین) دانش گاہ پنجاب، لاہور

اکائی 6: عثمانی دور میں علوم کی ترقی

اکائی کے اجزا:

6.0 تمہید
6.1 مقاصد
6.2 عثمانی دور میں علوم کی ترقی
6.3 عثمانی عہد میں مدارس
6.4 دور تنظیمات مدارس
6.5 عثمانی دور میں نقلی علوم
6.6 عقلی علوم (سائنسی علوم) میں ترقی
6.7 اکتسابی نتائج
6.8 نمونہ امتحانی سوالات
6.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
6.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
6.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
6.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

6.0 تمہید

عثمانی خلافت کا زمانہ اسلامی تاریخ میں علمی اعتبار سے زوال کا زمانہ تھا، چنگیزی اور ہلاکو خاں کے فتنوں نے علوم و فنون میں مسلمانوں کی ترقی کے سنہرے دور پر قدغن لگا دیا تھا۔ چونکہ خلافت عثمانی کا آغاز اسی دور میں ہوا اور ان کی حکومت نے چودھویں اور پندرہویں صدی عیسوی میں استحکام حاصل کیا تھا یہ زمانہ عثمانیوں کے عروج کا زمانہ تھا لیکن دیگر مسلم دنیا ہر میدان عمل میں تنزلی کا شکار تھی،

ایسے حالات میں اگر عثمانیوں کے دور میں علمی کم مائیگی کا تصور ملے تو اس میں تعجب کی بات نہیں۔ بہر حال عثمانی دور میں نقلی اور عقلی علوم دونوں علوم میں خاطر خواہ ترقی ہوئی ہے جس میں زیادہ تر کام تفسیر، فقہ، علم طب، جغرافیہ، فلکیات، ریاضی، تاریخ اور فنون لطیفہ وغیرہ میں انجام پائے۔ لہٰذا اس یونٹ میں ہم عہد عثمانی میں ہوئی علمی ترقی اور اس امر کو انجام دینے والے عناصر پر گفتگو کریں گے۔

6.1 مقاصد

اس یونٹ کا مقصد یہ ہے کہ آپ عثمانی دور میں علمی ترقی میں کیا عوامل شامل ہیں اور کن حالات میں سلاطین عثمانی نے ترقی حاصل کی اس سے آگاہ ہو جائیں۔

آپ کو یہ بات بھی معلوم ہوگی کہ اس عہد میں فقہ اسلامی کے علاوہ تفسیر، تاریخ، جغرافیہ، طب، فلکیات وغیرہ میں مسلم دانشوروں نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

اس یونٹ کا مقصد یہ ہے کہ آپ عثمانی دور میں علمی ترقی میں مدارس کے کردار اور اس عہد میں حصول علم کے لئے اس کی اہمیت کا تدارک کر سکیں۔

علمی ترقی میں سلاطین کے کردار کے ساتھ ساتھ علماء کی خدمات اور علوم کے مختلف میدان میں ان کی سرگرمیوں کا حال معلوم ہو سکے۔

6.2 عثمانی دور میں علوم کی ترقی

خلافتِ عثمانیہ (خلافتِ راشدہ، خلافت بنو امیہ اور خلافتِ بنو عباسیہ کے بعد) اسلامی تاریخ کی چوتھی بڑی خلافت اور مدت کے اعتبار سے سب سے بڑی مسلم حکومت تھی۔ اس عثمانی خاندان نے تقریباً625سال از 1299ء تا 1924ء تک حکومت کی جس میں36حکمران مسند آرائے خلافت ہوئے۔

عثمانیوں نے اپنے چھ سو سالہ دور حکومت میں علوم کی ترقی میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں جس میں قرآن و حدیث اور فقہ کے ساتھ ساتھ بڑا کارنامہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ہے خاص کر علوم جغرافیہ اور فنون لطیفہ وغیرہ میں غیر معمولی خدمات ہیں۔ سلاطین عثمانی علم کے شیدائی تھے انہوں نے اپنے معاشرہ کی اصلاح اور ان کی ترقی کا دارومدار تعلیم کو بنایا تھا لہٰذا تاریخ کا مطالعہ کرنے سے ہمیں اورخان سے لیکر عبدالحمید تک سارے سلاطین کے دور میں علوم کی ترقی کی مثالیں دیکھنے کو ملتی رہتی ہیں۔ عثمانیوں نے نہ صرف علوم اسلامی کو اپنی ترقی کا محور بنایا بلکہ انہوں نے سائنسی علوم میں نت نئی اختراعات و ایجادات کیں اور ساتھ ہی فن تعمیر میں ایسا ملکہ حاصل کر لیا کہ موجودہ زمانہ تک ان کی نقلیں دنیاء کی مختلف قوموں میں پائی جاتی ہیں جو کہ عثمانی فنون لطیفہ کا طرۂ امتیاز ہے۔ عثمانیوں میں یہ سائنسی اور تعلیمی انقلاب زمانوں کی مسافت طے کرنے کے بعد آیا ہے اس لیے اس کو مختصر سے سبق میں اس طویل تاریخ کو سمو دینا نہایت مشکل امر ہے لیکن پھر بھی ان تمام تفصیلات کو پیش کرنے کی سعی کی جارہی ہے۔ عثمانی دور کی علمی ترقی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک دینی اور دوسرا تنظیمات و

اصلاحات کا دور۔

عثمانی دور کی دینی و علمی ترقی میں سب سے اہم عنصر مدارس کا ہے، عثمانی معاشرہ میں اور علوم کی ترقی میں جتنی خدمات ہوئی ہیں ان میں سب سے زیادہ حصہ ان مدارس کا ہے جو عثمانی معاشرہ کی ریڑھ کی ہڈی سمجھے جاتے رہے ہیں۔ اور جس کی اہمیت ہمیں اولین سلاطین عثمانی کے دور میں دیکھنے کو ملتی ہیں اور خان، محمد فاتح، سلیمان اعظم، سلیم اول، مراد تا عبدالمجید ان سارے خلفاء نے اپنے اپنے زمانہ میں مدارس کی سرپرستی کی جس سے عثمانی معاشرہ میں اس کی اہمیت مسلم ہوئی نیز ان ہی مدارس کو آگے چل کر یونیورسٹی کا درجہ بھی حاصل ہوا۔ اس سلسلہ میں یہاں عثمانی دور کے مدارس اور ان کی تعلیمی خدمات کا ایک مختصر سا جائزہ پیش کیا جارہا ہے تاکہ طلبہ کو عہد عثمانی میں علوم کی ترقی میں معاون عناصر کی معلومات ہو سکے۔۔

6.3 عثمانی عہد میں مدارس

عثمانی عہد میں یہ بات وسوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ترک ہمیشہ سے علم کے شیدائی رہے ہیں اور وہ دوسری اقوام کے علوم پر گہری نظر رکھتے تھے لہٰذا انہوں نے بہت جلد اسلامی علوم میں درک حاصل کر لیا تھا۔ ان علوم کو سیکھنے کے لئے سب سے بہتر جگہ مدرسوں کی تھی لہٰذا تعلیم کے اعتبار سے ترکوں کا زمانہ پچھلے تمام زمانوں سے بہتر اور تابندہ تھا اور ترکی میں مدارس الگ حیثیت رکھتے تھے چونکہ ان کا تعلق تعلیم پولیٹیکل حیثیت رکھتا تھا اور وہاں سے سلطنت کو لائق عہدیدار ملتے تھے اس لئے سلاطین ان کی خود سرپرستی کرتے اور انہیں خوب سے خوب تر بنانے میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔ ان مدارس میں تعلیم دینے والے اساتذہ کے لئے پینشن کا نظم تھا اور اسلامی تاریخ میں یہ پہلی بار تھا کہ اساتذہ کو پینشن دی گئی جو کہ 80 سے 100 قرش یومیہ ہوا کرتی تھی۔ سلاطین کی سرپرستی اور دلچسپی نے ترک عوام میں علم کا شوق پیدا کر دیا اور وہ جوق در جوق حصول علم کی طرف متوجہ ہوئے اور مختلف میدانوں میں اپنی مہارت کا ثبوت پیش کر کے علمی دنیاء میں اپنا لوہا منوایا۔

خلافت عثمانیہ میں اورخان (1323 تا1362) پہلا عثمانی فرماں روا تھا جس نے ازنیق میں پہلا مدرسہ 1331ء میں بنیاد ڈالی جو آگے چل کر بہت مشہور و معروف ہوا، اس مدرسے میں شرح فصوص الحکم کے مؤلف داؤد قیصری اور شارح وقایہ علامہ علاء الدین وغیرہ جیسی علمی شخصیت درس و تدریس کے عمل میں مصروف تھی۔ اورخان کو علوم سے گہرا لگاؤ تھا وہ جگہ جگہ مدارس کا نظم قائم کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی عمر نے وفاء نہ کی اور وہ ایک زبردست تعلیمی خاکہ اپنے جانشینوں کے لئے چھوڑ گیا جس کی بنیاد پر اس کے جانشینوں نے علوم کی ترقی کے لئے مدارس و یونیورسٹیوں کی بے شمار عمارتیں تعمیر کروادیں۔ اورخان کے بعد مراد اور پھر محمد فاتح نے یکے بعد دیگرے مدارس و یونیورسٹیاں قائم کیں اور یہ سلسلہ تعلیم اس طرح حد کمال کو پہنچ گیا کہ مدرس کی تنخواہیں 130 قرش یومیہ سے 200 قرش یومیہ تک پہنچ گئی۔

سلطان محمد فاتح (1432 تا1481) کو علم سے اس قدر تعلق تھا کہ مسند خلافت پر آنے کے بعد بھی وہ تحصیل علم سے خود کو دور نہ رکھ سکا اور ایام جنگ میں بھی کتابوں کے مطالعہ میں غرق رہتا، اس کے بارے میں یہ بات بہت مشہور ہے کہ اپنے زمانہ حکومت میں محمد فاتح

اس وقت تک نہ سوتا تھا جب تک کہ وہ کسی ایک بادشاہ یا فاتح سلطنت کی تاریخ کا مطالعہ نہ کر لے۔ اسی لئے سلطنت پر متمکن ہونے بعد بھی وہ طالب علمی کا شوق پورا کرتا رہا علامہ خواجہ زادہ اور علامہ ابن الخطیب جیسے جید علماء اس کی تدریس کے لئے مقرر تھے۔ محمد فاتح نے 1460ء میں قسطنطنیہ میں ایک یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی، جس کے ماتحت آٹھ کالجز اپنی تعلیمی سرگرمی قائم رکھتے تھے اور اہم بات یہ تھی کہ ان سب کے لئے جداگانہ بورڈنگ کا نظم تھا جس میں طلبہ قیام کرتے تھے۔ محمد نے اس کے علاوہ پورے ملک میں مکتب کا سلسلہ قائم کیا جہاں ابتدائی درجوں کی تعلیم دی جاتی تھی اور یہ مکتب اس کی قائم کی ہوئی یونیورسٹی کے لئے طالب علم طیار کرنے کا کام انجام دیتے تھے۔ اس یونیورسٹی میں علاء الدین طوسی، خواجہ زادہ، ملا عبد الکریم، محمد بن مصطفیٰ جیسے ذی وقار علماء مدرس مقرر ہوئے، محمد فاتح بھی کبھی کبھی ان شیوخ کے درس میں شامل ہوا کرتا تھا اور مدرسین و طلبا کو تحفے دیتا تھا۔ اس نے علامہ قوشجی کو مدرسہ آیا صوفیہ کا مدرس اعظم مقرر کیا اور دو سو قرش یومیہ تنخواہ مقرر کی۔ 15 ویں صدی میں اس طرح کا منظم انداز محمد فاتح کی دوررس نظر اور متحرک فکر کا ہی نتیجہ تھیں۔ ان مدارس میں دس مضامین کی تعلیم دی جاتی تھی، جن میں صرف، نحو، منطق، مابعد الطبیعیات، تاریخ، زبان، فصاحت و بلاغت، اقلیدس اور ہیئت وغیرہ۔ جو طلبہ اس نصاب تعلیم میں پوری دستگاہ کر لیتے تھے ان کو "دانشمند" کا لقب دیا جاتا تھا۔ اسی طرح محمد فاتح نے استنبول میں جامع فاتح نام سے ایک مسجد بھی تعمیر کرائی جس سے منسلک مدرسہ، شفاخانہ، مطبخ اور کتب خانہ تھے یہ عمارت مجموعی طور پر کلیہ کہلاتی تھی۔

محمد فاتح کے بعد بایزید خلیفہ بنا تو اس نے بھی اس جانب خاصی توجہ دی اور محمد فاتح کے زمانہ میں مدارس کی جو تعداد تھی اس میں خاطر خواہ اضافہ کیا، نیز علماء کی تنخواہیں دس ہزار سلانہ مقرر کر دیں اور خاص کر حرمین کے فقہا کے لئے چودہ ہزار اشرفی مقرر کی۔ سولہویں صدی میں سلیمان اعظم (1494ء تا 1566ء) کے زمانہ میں مدرسہ سلیمانیہ کے قیام کے ساتھ مدارس کی ثقافت اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ سلیمان اعظم علم دوست سلطان تھا اس نے اپنے دربار میں علماء و اسکالرز کی بھرپور حوصلہ افزائی کی اور علامہ ابو سعود کے کہنے پر حرمین شریفین کی از سر نو تعمیر کروائی نیز وہاں چاروں مسلک کے عوام کے لئے مدرسہ قائم کیا اور اساتذہ کا بھی تقرر کیا۔ سلیمان خود بھی ایک اچھا شاعر تھا لہٰذا شعرا کی بھی سرپرستی کی اس کے دربار میں علامہ باقی بڑے شاعر تھے جنہیں وہ عثمانی دور کا سب سے بڑا شاعر قرار دیتا تھا، نیز اسے فن تعمیر سے بھی دلچسپی تھی اس لئے اس کے عہد میں متعدد عمارتیں تعمیر ہوئیں جو عثمانی تہذیب و ثقافت کی آئینہ دار ہیں۔ عثمانی دور میں تعلیم کا آغاز سبیان مکتبی جسے (آج کا ایلیمنٹری اسکول) کہتے ہیں سے ہوتا ہے جس میں محلے مکتبی (ڈسٹرکٹ ایلیمنٹری اسکول)، تاس مکتب (عام ایلیمنٹری اسکول)، دار التعلیم (اسکول)، دار العلوم (اسکول آف سائنس) اور معلمین (اساتذہ کے لیے اسکول) جیسے مختلف لقب ہیں۔ یہ ابتدائی اسلامی تہذیب کے ان مکاتب فکر کا تسلسل ہے جنہیں قطاب کہا جاتا تھا۔ ان مدرسوں سے فارغ التحصیل ہونے والے افراد دوسرے سائنسی مراکز (قاہرہ، سمرقند، بخارا، بغداد اور دمشق) میں جاتے تھے اور مذہب اسلام، اسلامی ثقافت اور تہذیب سیکھ تے ہوئے ان شہروں میں اپنی تعلیم جاری رکھتے تھے، اور پھر وہ سائنس دانوں کی حیثیت سے اپنے آبائی شہر واپس آتے۔ ان مدرسوں کے علاوہ اندرون (عثمانی محل میں ایک خصوصی اسکول) نامی اسکول بھی پایا جاتا تھا جو ابتدائی عثمانی دور میں ایک تعلیمی ادارہ ہے جو کم از کم اتنا ہی اہم ہے جتنا مدرسہ۔ اندرون ایک منفرد اسکول تھا اور یہ اپنی ساخت کے لحاظ سے مدرسوں سے ملتا جلتا تھا۔ یہ ایک تعلیمی ادارہ تھا جو محل کے اندر تعلیم

فراہم کرتا تھا اور جس میں سیاست دانوں کی پرورش ہوتی تھی۔

6.4 دور تنظیمات مدارس

سلطان محمد فاتح نے اپنی زمانہ حکومت میں تعلیم کا ایک ایسا نظام قائم کیا تھا جس میں چند خاں میاں تھیں، پہلا امر یہ تھا کہ مکتب اور مدرسہ کی تعلیم کے درمیان کوئی ثانوی تعلیم نہیں دی جاتی تھی۔ مکتب میں بلکہ ابتدائی تعلیم کا نظم تھا تو مدرسہ میں بہت اعلیٰ، مدرسوں کا نصاب بہت ثقیل اور مشکل تھا۔ دوسرا امر یہ تھا کہ مکاتب اور مدارس میں زیادہ زور عربی زبان و قواعد کے سیکھنے پر تھا جس سے طلبی میں زمانہ کے حالات کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی صلاحیت نہیں پیدا ہو پاتی تھی نہ ہی وہ تاریخ اور جغرافیہ جیسے معروف مضامین ہی سے واقف ہوتے تھے۔ چونکہ تعلیم کا پورا نظم علماء کے ہاتھوں میں تھا اس لئے تعلیمی رجحان زیادہ تر مذہبی ہی رہا اور علماء اس میں کسی طرح کی تبدیلی کو پسند نہیں کرتے تھے نہ ہی وہ زمانہ کی ضروریات کو تسلیم کرتے تھے۔ لیکن جب سلطان عبد المجید تخت پر متمکن ہوئے تو نظام تعلیم میں بعض نہایت اہم اصلاحات کی گئیں جس میں ثانوی تعلیم کا نظم سب سے اہم اور مفید ثابت ہوا۔ تعلیمی اصلاحات کے ساتھ ساتھ مدارس کی تعداد میں بھی خاصہ اضافہ ہوا عبد المجید کے زمانہ سے پہلے تک مدارس کی تعداد تقریباً270 کے قریب تھی جو بڑھ کر 396 تک پہنچ گئی تھی اور سلطان عبد المجید ثانی کے زمانہ میں تو یہ تعداد 700 سے تجاوز کر گئی، نیز اس تنظیمات کے دور میں نئی یونیورسٹاں قائم ہوئیں جو اعلیٰ تعلیم کا مراکز ہوا کرتی تھیں اور مکتب و ثانوی درجات کے مدارس کو ملک کے کونے کونے میں قائم کیا گیا تا کہ شرح خواندگی زیادہ سے زیادہ بڑھایا جا سکے۔

دور تنظیمات میں تعلیم کی ترقی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1900ء تک مختلف قسم کے مدارس جو صرف قسطنطنیہ میں موجود تھے ان کی مجموعی تعداد پانچ سو کے قریب تھی جن میں تیرہ بڑے کالجز شامل ہیں جنہیں مختلف ناموں سے جانا جاتا ہے، ان میں مکتب حربیہ شاہانہ، مکتب سلطانی، مکتب ملکیہ، مکتب الحقوق، مکتب الہندسیہ، مکتب اللسان، مکتب الصناعہ، مکتب نواب، مکتب بحریہ، مکتب الزراعہ، مکتب طبیہ، مکتب فوجی انجینئر، وغیرہ شامل تھے۔

6.5 عثمانی دور میں نقلی علوم

عثمانی خلافت میں عوام و سلاطین دونوں علم کے شیدائی تھے اور زمانہ کے رواج کے مطابق ان میں فطری طور پر دینی علوم کو سیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت تھی لیکن یہ بات ناقابل تسلیم ہے کہ ہماری تاریخی کتب میں عثمانی دور میں دینی علوم کی ترقی اور خدمات کا ذکر بہت کم ملتا ہے بلکہ یوں کہیں کہ ناپید ہے۔ مزید براں چھ سو سالہ عرصہ پر محیط کسی ادب کا مطالعہ کرنا نہایت دشوار عمل ہے بحر حال اس ضمن میں عہد عثمانی میں دینی علوم کی ترقی کا ذکر پیش کیا جائے گا۔

عہد عثمانی میں ہمیں سب سے پہلی اور ممتاز علمی شخصیت ملا شمس الدین محمد بن حمزہ 1431–1350، کی تھی جو علامہ فناری کے نام سے مشہور تھے آپ ایک عثمانی منطق داں، ماہر اسلامی علوم، ماہر فقہ، فلسفی اور صوفی تھے۔ آپ نے مولانا علاؤالدین الیسوید، کمال الدین

اکسری، اور حمید الدین قیصری سے ابتدائی تعلیم حاصل کی، پھر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے مصر کا سفر کیا اور وہاں اکمل الدین البرتی سے فقہ حنفی کا علم سیکھا۔ تکمیل علم کے بعد آپ کو عثمانی سلطان بایزید اول نے 1390 میں بروصہ کا قاضی مقرر کیا۔ بایزید اول کی موت کے بعد ملک میں خانہ جنگی کی نوبت آگئی، جس کی وجہ سے علامہ فناری کو ملک چھوڑنا پڑا۔ 1421 میں جب، مراد دوم تخت نشیں ہوا تو اس نے علامہ فناری کو بروصہ میں واپس بلالیا اور 1424ء میں مراد نے انہیں فوج کا قاضی مقرر کیا یہ وہی عہدہ تھا جو اس کے کچھ عرصہ کے بعد شیخ الاسلام کے نام سے موسوم ہو گیا، علامہ فناری وہ پہلے شخص تھے جنہیں سلطنت عثمانیہ نے یہ عہدہ دیا تھا۔ آپ پروفیسر اور جج کے طور پر اپنے دیگر عہدوں کے علاوہ اس عہدے پر اپنی زندگی کے آخری ایام 1431ء تک فائز رہے۔ آپ نے اپنی علمی زندگی میں مختلف علوم پر متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں جن کو درجن میں ردج ذیل کتابیں شامل ہیں:

تصوف و عرفان

- مصباح الانس بین المعقول والمشہود
- تعلیقہ بر اصطلاحات الصوفیہ ملا عبد الرزاق کاشانی
- شرح الرباعی لابن العربی

فقہ و اصول

- فصول البدائع فی اصول الشرائع
- شرح تلخیص الجامع الکبیر
- عویصات الافکار فی اختیار اولی الابصار
- شرح فرائض سجاوندی
- مرشد المصلی
- مقدمۃ الصلوۃ

تفسیر قرآن

- عین الاعیان فی تفسیر القرآن

منطق

- الفوائد الفناریہ
- شرح کتاب ایساغوجی

ادبیات عرب

- اساس التصریف

- شرح رسالۃ الاثیریۃ
- شرح المصباح فی النحو
- شرح الفوائد الغیاثیۃ
- حواشی شرح چغمینی
- حاشیہ کتاب حرز الامانی ووجہ التھانی
- تعلیقات مفتاح العلوم
- حاشیہ بر الضوء اللامع

1. حاجی بیرم ولی

عہد عثمانیہ کی دوسری بڑی علمی شخصیت حاجی بیرم ولی کی ہے آپ کا زمانہ 1352ء سے لے کر 1430ء تک کا ہے۔ آپ کا اصل نام نعمان تھا۔ آپ نے عید الاضحی کے دوران اپنے روحانی پیشوا شیخ حمید الدین ولی سے ملاقات کی۔ انھوں نے آپ کا نام بدل کر بیرم رکھ دیا۔ (جسے ترکی میں قربان بیرامی کہتے ہیں)۔ حاجی بیرم صوبہ انقرہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے اور عام رواج کے مطابق دینی علوم کی تعلیم حاصل کی اور اپنے وقت کے بڑے عالم بنے۔ دوران قیام قیصریہ شہر میں شیخ حمید الدین ولی سے تصوف کی تعلیم حاصل کی جس نے آپ کی زندگی ہی بدل کر رکھ دی، شیخ حمید الدین ولی صفویہ طریقت کے شیخ خواجہ علاء الدین علی کے مرشدوں میں سے ایک تھے۔

شیخ حمید الدین ولی(صمونجو بابا) اور حاجی بیرم، شہر بروصہ میں قیام پزیر تھے کہ انہوں نے ایک ساتھ حج کرنے ارادہ کیا، اس مقدس سفر کے دوران حمید الدین ولی آپ کو تصوف کی تعلیم دیتے رہے یہاں تک کہ شیخ حمید الدین نے 1412ء میں حاجی بیرم ولی کو اپنا خلیفہ منتخب کر کے بیعت کا اختیار دے دیا اور خود اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ آگے چل کر آپ بیرامیہ نامی طریقت کے شیخ اور بانی کہلائے نیز آپ نے اپنی پوری زندگی اللہ اور اسکی مخلوق کی خدمت کے لئے وقف کر دی۔ آپ کا شمار ترکی کے ممتاز اولیاءاللہ میں ہوتا ہے۔ آپ نے انقرہ میں اس جگہ پر ایک درگاہ بنوائی جہاں آج آپ کا مقبرہ اور مسجد واقع ہے۔

2. آق شمس الدین(1389ء تا1459ء)

آپ سلطنت عثمانیہ کے صوفی شاعر، طبیب، عالم، فقیہ تھے اور سلطان محمد فاتح کے مشیر خاص بھی تھے۔ سلطنت عثمانیہ میں آپ کی عظمت و جلالت کا دور دورہ تھا کیونکہ آپ نے سلطان محمد فاتح کے عہد میں صحابیٔ رسول حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی گمشدہ قبر دریافت کی تھی اور فتح قسطنطنیہ 29 مئی 1453ء کی پیشگوئی بھی کی تھی۔ شیخ شمس الدین کا اصل نام محمد شمس الدین المِلّۃوالدّین تھا لیکن آق شمس الدین کے نام سے مشہور ہوئے۔ شیخ شمس الدین شیخ شہاب الدین سہروردی کی اولاد سے تھے۔ آپ کی پیدائش 792ھ مطابق 1389ء میں دمشق میں ہوئی۔ ابھی پانچ برس کے ہی تھے کہ دمشق سے اپنے والدین کے ہمراہ 799ھ

مطابق 1397ء میں ضلع قوَق میں آ گئے۔ سات سال کی عمر میں علومِ دینیہ کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اِسی دوران آپ کے والد حمزہ انتقال ہو گیا تو آپ نے بدر الدین بن قاضی سَمَاوْنَہ سے تحصیل علم کیا۔ بعد ازاں قصبہ عثمانجق میں مدرّسِ قرآن مقرر ہو گئے۔

تصوف و طریقت

علومِ ظاہریہ کی تکمیل کے بعد آپ طریقت و تصوف کی طرف مائل ہونا شروع ہو گئے جو بعد میں آپکی شہرت کی وجہ بن گیا۔ تصوف و طریقت میں کسی ایک خاص مرشد کی تلاش میں دور دراز مقامات کا سفر کرتے رہے یہاں تک کہ ایران اور ماوراالنہر کے بھی سفر کیے لیکن بالآخر 830ھ مطابق 1427ء میں کچھ تامل کے بعد علامہ حاجی بیرم ولی کی صحبت اختیار کی جو اپنے وقت کے بڑے صوفی بزرگ تھے اور پھر اطمنان قلب کے بعد ان سے بیعت کرلی۔ چند ہی دِنوں بعد حاجی بیرم ولی نے شیخ شمس الدین کو خرقہ خلافت تفویض کر دیا۔

بحیثیت طبیب

شیخ شمس الدین علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ علم طب میں بھی خاصی مہارت رکھتے تھے۔ اللہ نے آپ کے ہاتھ میں شفاء دی تھی جس کی وجہ سے عوام میں بہت جلد مقبول ہو گئے اور انقرہ کے بازار کے مغربی سمت میں واقع ایک گوشہ "بیگ بازار" میں اپنا مطب جاری رکھا۔ یہیں شیخ نے ایک چھوٹی سی مسجد بھی تعمیر کروائی اور گندم پیسنے کی ایک چکی بھی لگوائی۔ علم طب چونکہ انھوں نے حاصل کیا تھا اور اصلاً طبیبِ ظاہری تھے۔

بحیثیت مشیر

آپ کی طبابت پورے ملک میں اس قدر مشہور ہو گئی کہ 1448ء اور 1452ء کے درمیانی عرصے میں سلطان مراد ثانی کے قاضی عسکر سلیمان چلبی کے علاج کے لیے آپ کو ادرنہ طلب کیا گیا۔ جہاں آپ کی طبابت سے خوش ہو کر اور آپ کی علمی لیاقت کو جان کر سلطان نے آپ کو عثمانی لشکر میں واعظ کی حیثیت عطا کر دی اور اسی نسبت سے آپ نے فتح قسطنطنیہ میں حصہ بھی لیا۔ ایک تاریخی روایت ملتی ہے کہ آپ ہی نے صحابیٔ رسول حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا مدفن بھی دریافت کیا جو اِس سے پہلے گمشدہ سمجھا جاتا تھا۔ اس اثناء میں شیخ نے سلطان محمد فاتح کی ایک بیٹی کے مرض کا کامیاب علاج بھی کیا جس سے وہ سلطان محمد فاتح کے منظورِ نظر بن گئے۔ فتح قسطنطنیہ کے بعد شیخ واپس گوینوک آ گئے تھے اور یہیں اپنی آخری عمر بسر کی۔ تقریباً 70 سال کی عمر میں آپ 16 فروری 1459ء کو گوینوک میں وفات پا گئے۔ آپ کی تدفین گوینوک میں کی گئی جس پر آج تک مقبرہ قائم ہے۔ آپ نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں "رسالہ النوریہ"، "حل مشکلات"، "مقامات اولیاء"، "کتاب الطب" اور "مدت الحیات" وغیرہ شامل ہیں۔

3. خضر بیگ

عثمانی دور ایک اور بزرگ شخصیت خضر بیگ کی تھی، آپ سیوری حصار میں 1407ء میں پیدا ہوئے، آپ کے والد جلال الدین

قاضی کے عہدے پر فائز تھے۔ آپ نے اپنی تعلیم شہر بروصہ کے مشہور عالم مولانا یکن کے پاس مکمل کی۔ آگے چل کر آپ کی کامیابی اور اخلاقیات سے متاثر ہو کر ملا نا یکن نے اپنی بیٹی سے آپ کی شادی بھی کروادی اور پھر علوم کی تحصیل کے بعد آپ ایک استاد کے طور پر سیوری حصار واپس آئے اور یہیں درس و تدریس کی خدمت انجام دینے لگے، چند سالوں کی خدمات نے آپ کے شاگردوں کی ایسی ٹیم تیار کر دی کہ جس سے آپ کے علم اور درس و تدریس کا ہر طرف شہرا ہو گیا اور محمد اوّل کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے بروصہ کے مدرسہ میں اضافی تنخواہ کے ساتھ آپ کا تقرر کیا گیا، آپ نے یہاں بھی اسی لگن و محنت کے ساتھ درس جاری رکھا اور آگے چل کر یہاں سے بھی آپ کے کچھ شاگرد بڑے نامور عالم بنے۔ اسی طرح بایزید اوّل کے دور میں سلطان کے ذریعہ قائم مدرسہ میں آپ کا تقرر کیا گیا جہاں آپ کو مزید اضافی تنخواہ دی گئی تاکہ آپ کو کسی طرح کی کوئی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے، آپ کی شہرت اور علمی خدمات اور علوم اسلامی میں درک خاص کر فقہ میں آپ کی خدمات کی بناء پر آپ کو استنبول کا پہلا قاضی مقرر کیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ ادرنہ کی جامع مسجد سے متعلق مدرسے میں تعلیم دیتے رہے اور پھر بعد میں آپ کو بلغاریہ میں قاضی کے طور پر اپنی خدمات دینے کا موقع ملا۔ آپ نے 51 سالہ زندگی پائی اور 1458ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے، آپ کو ابو ایوب الانصاریؓ کی قبر کے پاس دفن ہونے کا شرف حاصل ہے۔

خضر بیگ کی طرف یہ بات منسوب کی جاتی ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے کروموگرافی کو متعارف کرا ہے لیکن ان کی علمی شناخت عربی ادب و فقہ میں ان کی خدمات کی بناء پر ہیں۔ ادب عربی میں ان کی تین مشہور نظمیں ہیں جنہوں نے آپ کو شہرت دوام عطاء کی ان میں سے دو قصیدہ ہیں پہلا قصیدہ بسیط اور دوسرا قصیدہ نونیہ، اور تیسری مثنوی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی کتابوں کا ذکر نہیں ملتا ہے یا وہ ناپید ہو چکی ہیں۔

4. ملا خسرو

ملا خسرو عثمانی دور کے مشہور علماء میں سے ایک تھے۔ آپ کی پیدائش کی تاریخ معلوم نہیں لیکن آپ مراد ثانی اور محمد فاتح کے دور میں تھے، بشپن میں ہی والد کا سایہ عاطفت سر سے اٹھ گیا تو آپ کے بہنوئی خسرو نے آپ کی پرورش کی۔ آپ کا اصل نام محمد تھا اور والد کا نام فراموز تھا جبکہ اصلا رومی النسل تھے لیکن بعد میں اسلام قبول کر لیا۔ ملا خسرو نے اپنا علمی سفر سواس نامی علاقے سے شروع کیا جو آپ کی جائے پیدائش تھی، آپ اپنے وقت کے بڑے کبار علماء سے کسب فیض کیا جن میں ملا فناری کی بیٹے قاضی یوسف، برہان الدین حیدر، ملا یکان، شیخ حمزہ وغیرہ کا نام شامل ہے۔

تحصیل علم کے بعد مدرسہ ملک شاہ میں درس و تدریس سے منسلک ہو گئے اور آٹھ سال تک خدمات انجام دیں، اس کے بعد فوج میں قاضی عسکر کا عہدہ عطاء ہوا کچھ سال کام کرنے کے بعد مراد ثانی نے آپ کو ادرنہ اور پھر استنبول شہر کی قضاعت کا عہدہ بھی سپرد کر دیا۔ آپ نے بڑی ہی خندہ پیشانی سے ان منصبوں کا حق ادا کیا اور عوام میں بیحد مقبول ہوئے۔ سلطان محمد فاتح نے اپنے زمانہ خلافت میں ملا خسرو کو انکی بے لوث خدمات کی وجہ سے استنبول میں شیخ الاسلام کے عہدے پر فائز کر دیا جہاں آپ اپنی زندگی کت آخری لمحات تک فائز رہے۔ محمد فاتح ملا خسرو کی فقہی خدمات کا بہت معترف تھا اس نے انہیں "عصر حاضر کا ابو حنیفہ" لالقب دیا تھا۔

ملا خسرو نے اپنی علمی زندگی میں متعدد کتابیں تصنیف کیں جن میں سے زیادہ تر کتابیں فقہ اور اصول فقہ، تفسیر، اور عربی ادبیات و لغت پر ہیں، جن میں سے بعض اہم کتابوں کا یہاں ذکر کیا جارہا ہے۔

مرآۃ الاصول فی شرح مرقات الاصول، آپ کی اس کتاب کو خلافت عثمانیہ کے مدارس میں درس کے طور پر پڑھایا جاتا تھا، اس کتاب کی اہمیت یہ ہے کہ یہ ایک صدی میں دس سے زائد بار شائع ہوئی۔

غرر الاحکام، درر الحکام شرح غرر الاحکام، حاشیہ علی التلویح، شرح اصول بزودی، حاشیہ علی حاشیہ المختصر للسید الشریف، رسالہ فی الولاء، وغیرہ اہمیت کی حامل ہیں۔

5. شمس الدین احمد بن سلیمان پاشا (کمال پاشازادہ)

خلافت عثمانیہ کی تاریخ میں شمس الدین احمد بن سلیمان پاشا (1468 تا 1534) کو علمی دنیاء میں وہ مقام حاصل ہے جو مصر میں شیخ جلال الدین سیوطی کو حاصل تھا۔ آپ ابن کمال یا کمال پاشازادہ کے نام مشہور ہوئے، تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، ادب، اور شاعری پر عبور حاصل تھا۔ آپ ایک ذی علم خانوادے سے تعلق رکھتے تھے، ابتدائی تعلیم ادرنہ میں ملا لطفی، ملا مصلح الدین مصطفیٰ، ملا محی الدین محمد ابن ابراہیم، سنان الدین یوسف سے حاصل کی پھر متعدد مدارس کی خاک چھانی اور 1515ء میں ادرنہ کے قاضی مقرر ہوئے۔ سلیمان قانونی نے اپنے دور میں آپ کو شیخ الاسلام کے عہدے پر فائز کر دیا جس پر آپ نے ساری عمر خدمات انجام دیں۔ آپ ایک جامع کمال شخصیت کے مالک تھے، عربی، فارسی، ترکی ہر زبان اور ہر فن میں آپ کی تصانیف ملتی ہیں جن کی تعداد دو سو ساٹھ سے زائد ہے، جن میں تفسیر، شرح حدیث، فقہ، فلسفہ، کلام، منطق، تصوف، اخلاقیات، تاریخ، اور متعدد کتابیں عربی ادب و شاعری وغیرہ پر ہیں۔ لیکن جس کتاب نے آپ کو شہرت دوام بخشا ہے اور جس کی وجہ سے آپ ترکی کے ان چیدہ علماء میں شمار کئے جاتے ہیں اور ترکی کے ان پانچ مؤرخوں کی فہرست میں سب سے پہلا آپ کا نام شامل کیا جاتا ہے وہ کتاب "تاریخ آل عثمان" ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی تصانیف میں طبقات الفقہا، طبقات المجتہدین، الکلمات العربیہ، رسالہ فی الجبر والقدر، ایضاح الاصلاح فی فقہ الحنفیہ، رجوع الشیخ الی صباہ، تاریخ آل عثمان، نگارستان، اور تغییر التنقیح فی اصول الفقہ وغیرہ اہم تصانیف شامل ہیں۔

6. ابو سعود آفندی

اسی طرح عثمانی خلافت میں ایک اہم اور ممتاز علمی شخصیت ابو سعود آفندی 1490ء تا 1574ء کی ہے، جو ایک حنفی عالم، قاضی، اور مفسر کی حیثیت سے سلیمان قانونی کے دور خلافت میں شیخ الاسلام کے عہدہ پر سب سے طویل مدت تقریباً 29 سالوں تک فائز رہے۔ آپ کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے بروصہ، استنبول اور رومیلیہ میں قاضی کے عہدے پر فائز رہتے ہوئے سلطنت کے نظام کو اسلامی شریعت کے مطابق بنایا۔ اسی لئے سلیمان قانونی نے آپ کو 1545ء میں شیخ الاسلام کا عہدہ عطاء کیا جس پر آپ اپنی زندگی کے آخری سانس 1574ء تک فائز رہے۔ اس دوران آپ نے خلافت عثمانیہ میں رائج سلطانی قانون کو شریعت کے نظام میں ضم کر دیا اور ایک نیا خاکہ پیش کیا جس کے تحت سلاطین عثمانی کو شریعت کے تابع لایا گیا اور قاضیوں کو شریعت کے مطابق احکامات نافذ کرنے کی کھلی اجازت مل گئی جس کی

اطباع سلطان وقت کو بھی کرنی پڑتی تھی۔ ساتھ ہی آپ نے سلطان کی خود مختاری پر جو ضرب تھی اس کو کلعدم کر دیا یعنی سلطان کو کلی اختیار تھا کہ وہ شریعت کے معاملات میں اگر کوئی فیصلہ کرتا ہے تو اسے نافذ ہونا چاہیے۔ آپ نے اپنے دور میں ہر عوامی مسائل کے حل کے لئے فتویٰ دئے جس سے اس معاشرہ کی سیاسی، معاشی، تہذیب و تمدن کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ آپ کی متعدد تصانیف عربی، فارسی اور ترکی زبان میں موجود ہیں۔ آپ نے قرآن کی تفسیر "ارشاد العقل السلیم" کے نام سے لکھی جو ایک محققانہ تفسیر مانی جاتی ہے اس کے علاوہ فقہ میں آپ نے علامہ مرغنانی کی ہدایہ کے ابواب خرید و فروخت کی تشریح لکھی اسی طرح علامہ تفطازانی کی التلویح کی شرح درسی نصاب کے لئے لکھی۔ اس کے علاوہ آپ نے جہاد کے بابت ایک کتابچہ تیار کیا جو کہ اب ناپید ہے۔

7. مصطفیٰ بن عبد اللہ حاجی خلیفہ

عثمانی ترکوں کی تعلیمی ترقی ہو یا علوم کی ترقی حاجی خلیفہ کے تذکرہ کے بنا یہ تاریخی مواد کبھی مکمل نہیں ہو سکتا، حاجی خلیفہ عثمانی دور کی علمی شخصیات میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ آپ 1606 / 1609ء میں استنبول میں پیدا ہوئے، آپکے والد عثمانی فوج میں اپنی خدمات انجام دے رہے تھے گھر کے ماحول سے متاثر ہوئے۔ آپ کی تعلیم کا آغاز پانچ سال کی عمر سے ہوا آپ نے قرآن، عربی گرامر، اور کتابت کی ابتدائی تعلیم حاصل کی اور پھر چودہ سال کی عمر میں اپنے والد کی سیادت سے فوج کے ایک صیغہ میں منشی کے عہدے پر فائز ہو گئے، آپ نے اس عہدے پر نہایت مستعدی سے کام کیا اور بہت جلد، اپنے کام کی وجہ سے "کاتب چلپی" کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ یہ وہ دور تھا جب عثمانی سلطنت جمود کے دور سے گزر رہی تھی اور ملک کو مختلف جگہوں اور شہروں میں متعدد جنگوں کا سامنا تھا، حاجی خلیفہ بھی سلحداروں کی فوج میں شامل ہو کر اپنے والد کے ہمراہ متعدد جنگوں میں شامل ہوئے اور 1622 سے 1635ء تک فوجی مہمات میں اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔

حاجی خلیفہ 1622ء سے 1645ء تک منشی کے عہدے پر فائز رہے اور 1645ء میں انہوں نے اپنے عہدے سے اس لئے استعفیٰ دے دیا کیونکہ ان کو وہاں ان کی اہمیت اور خدمات کے مقابلہ میں ترقی نہ مل سکی تھی۔ پھر 1648ء میں انہیں اسی محکمہ میں خلیفہ یعنی معاون سلطان عثمان ثانی کا عہدہ عطاء ہوا جس کی نسبت کی وجہ سے انہیں "حاجی خلیفہ" کے نام سے پکارا جانے لگا۔ حاجی خلیفہ کو انکی خدمات اور علمی شغف کی وجہ سے مراد رابع نے ایک بڑی جائداد انکے نام کر دی تھی تا کہ وہ سرکاری ملازمت کو ترک کر کے اپنے علمی سفر کو آگے بڑھا سکیں، اسی دلچسپی کے باعث 1640ء میں "فضلکہ" کے نام سے تاریخ کی اہم کتاب وجود میں آئی، اس کتاب میں 150 سے زیادہ فرمانرواء خاندانوں کی مختصر تاریخ موجود ہے۔ اپنی جامع الکمال شخصیت اور اللسان الثالث (عربی، فارسی، ترکی) پر قدرت کی وجہ سے 20 سے زیادہ کتابیں مختلف علوم میں تصنیف کیں جن میں تاریخ، تفسیر، جغرافیہ، تصوف، وغیرہ شامل ہیں جس نے علمی دنیاء میں آپ کی علمیت کا لوہا منوایا اور شہرت دوام بخشاء۔ آپ کی تصانیف میں سب سے زیادہ شہرت جس کی وجہ سے آپ علمی دنیاء میں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں "کشف الظنون" کو حاصل ہوئی۔ اس کتاب میں آپ نے ابتداء اسلام سے لیکر اپنے زمانہ تک کے تمام مصنفوں اور کتابوں کا تذکرہ کرایا ہے جو عربی، فارسی اور ترکی زبان میں لکھی گئی تھیں۔ ہم اسے عالم اسلام کی تمام کتب کا دائرۃ المعارف بھی کہہ سکتے ہیں۔ حاجی خلیفہ کی اس کتاب کو مکمل

کرنے میں تقریباً20سال کا عرصہ لگا جس میں لگ بھگ 14ہزار سے زائد کتب کا تذکرہ ہے۔

اس کے علاوہ حاجی خلیفہ کی ایک اور اہم کتاب "جہاں نما" ہے، یہ کتاب علم جغرافیہ سے متعلق ہے، اس میں آپ نے یورپ کے علاوہ امریکہ کے احوال بھی رقم کئے ہیں جس سے آپ کے زمانہ تک اسلامی دنیاء کے جغرافیہ داں واقف نہ تھے، اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی آپ کی ایک اور کتاب "تحفۃ الکبار فی اسفار البحار" ہے جس میں اپ نے ترکوں کی بحری جنگوں کا پوا حال بیان کیا ہے۔ مذہبی نقطہ نظر سے آپ کی سب سے اہم کتاب "میزان الحق" ہے اس کتاب میں آپ نے اسلام کے مختلف نظریات وعقائد جیسے خضر کی موجودگی، غنا، رقص، صلوٰۃ والسلام، وغیرہ پر اپنے خیالات کا اظہار نہایت محققانہ اور مدبرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ تاریخ میں ایک اہم کتاب "فضلکہ التواریخ" ہے جس میں 1300 سے زیادہ کتابوں سے استفادہ کیا ہے اور یہ کتاب عثمانیوں کی 1000 ہجری سے لیکر 1065 ہجری تک کے واقعات شامل ہیں۔ انہیں تاریخی کتب کی وجہ سے حاجی خلیفہ کو عثمانی دور کے پانچ مشہور مؤرخوں میں سے تیسر ومقام حاصل ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ حاجی خلیفہ نے تفسیر، فقہ اور دوسرے علوم میں متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں، "سلم الوصول الی طبقات الفحول"، "تحفۃ الاخیار"، "لوامع النور"، "تاریخ افرنگی"، رونق السلطنۃ"، "الالہام المقدس"، "نستور العمل، "رجم الرجیم"، "شرح المحمدیہ"، "تقویم التواریخ" وغیرہ شامل ہیں۔

8. گلیبولو مصطفیٰ علی چلپی

مصطفیٰ علی عثمانی دور کے بڑے مؤرخ اور نامور علمی شخصیت کے مالک تھے۔ آپ 28اپریل 1541ءمیں گلیبلو نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بھی علمی ذہنیت کے مالک اور تاجر تھے، آپ کے ایک چچا سلیمان قانونی کے دور میں ایک مسجد کے امام تھے لہٰذا آپ کی تعلیم وتربیت بھی گھر کے ماحول میں ہوئی اور آپ نے 6سال کی عمر میں ابتدائی تعلیم میں قدم رکھا اور پندرہ سال کی عمر تک شاعری میں اچھی دستگاہ پیدا کرلی۔ لیکن اپنی علمی تشنگی کو بجھانے کے لئے مزید تعلیم حاصل کرتے رہے آپ نے قرآن، منطق، فقہ، عربی وترکی ادب میں اچھی مشق بہم پہنچائی اور اپنے وقت کے معروف ماہرین تاریخ میں آپ کا شمار ہونے لگا۔ آپ نے اپنی شاعری کے ذریعہ سلطان سلیم کے دربار میں رسوخ حاصل کرلیا اور جانثاری فوج میں کاتب یا منشی کے عہدے پر فائز ہوگئے۔ اور بہت جلد ترقی کرتے ہوئے سلطان سلیمان قانونی کے دربار تک رسائی حاصل کرلی۔ کچھ سالوں بادشاہ کی خدمت کرنے کے بعد آپ کو لالہ مصطفیٰ پاشا کے خصوصی سیکریٹری کے طور پر کام کیا جہاں آپ کو دمشق، مغداد، مصر، اور حلب وغیرہ کا سفر کرنے کا موقع ملاء۔ اسی طرح جب سلیم اول مسند خلافت پر متمکن ہوا تو مصطفیٰ علی کو دیگر فوجی مہمات کے ساتھ بغداد، بوسنیا، اور دیگر جگہوں پر جانا پڑا جو کہ آپ جیسی علمی شخصیت کے لئے بہتر جگہ نہ تھی، بادشاہ کے احکامات کے سامنے آپ بے بس تھے لیکن آپ ہمیشہ اپنے لئے موزوں خدمات مانگتے رہے جو کہ نہ ملی اسی بات سے بد ظن ہو کر کئی بار آپ نے اپنا استعفیٰ بھی پیش کیا جو قبول نہ ہوا۔ آپ کی زندگی کا ایک بڑا حصہ علمی تشنگی کی جلاء بجھانے کے لئے صحیح مواقع کی تلاش میں گزر گیا لیکن آپ نے اسی گہما گہمی میں اپنی مشہور زمانہ کتاب "کنہ الاخبار" جس کی بدولت آپ کو سولھویں صدی کا سب سے بڑا مؤرخ ہونے کا خطاب ملاء قیام بغداد کے زمانہ میں لکھی گئی تھی۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ترکوں کی تاریخ کے ساتھ ساتھ تہذیب وتمدن کا پورا نقشہ

سامنے آجاتا ہے۔اس کے علاوہ آپ نے اس کتاب میں اسلامی تاریخ کے ہر دور کا مطالعہ نہایت مؤرخانہ اور نقاد کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

مصطفیٰ علی چلپیی نے کل 55 کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں سے ایک اہم کتاب "مناقب ہنرواں" کے نام سے تصنیف کی اس کتاب میں آپ نے اپنے عہد کے سو سے زائد خطاطوں، مصوروں، اور جلد سازوں کے حالات کو یکجا کر دیا ہے جس سے اس دور میں فنون لطیفہ کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اسی طرح تاریخ پر ایک اور اہم کتاب "فصول الحال" کے نام سے ملتی ہے جس میں اسلامی دنیاء کی مختصر تاریخ نہایت مؤثر اور جامع انداز میں بیان کی گئی ہے۔یہ کتاب ترکی میں تاریخ کی بہترین ترین کتابوں کی فہرست میں شامل کی جاتی ہے۔ان کتابوں کے علاوہ مصطفیٰ علی چلپیی نے "نصیحت السلاطین"، "نصرت نامہ"، "مراعت العالم"، وغیرہ کتابیں تصنیف کیں۔

6.6 عقلی علوم (سائنسی علوم) میں ترقی

عثمانی دور میں سائنسی سرگرمیاں اناطولیہ میں عثمانی دانشوروں کے ذریعہ ترقی کی راہ پر گامزن تھی اور مصر، شام، ایران اور ترکستان سے آنے والے دانشوروں کی سرگرمیوں سے اس میں مزید اضافہ ہوا۔اس دور کے سائنسی اور ثقافتی مراکز اسلامی تہذیب کے قدیم مراکز کے ساتھ ساتھ، نئے مراکز، جیسے بروصہ، ادرنہ، استنبول، اماسیہ، اور سرائیوو نے سائنسی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔عثمانیوں نے اپنے غیر مسلم برادران وطن اور یورپی ممالک کے پڑوسیوں سے بھی استفادہ کیا اور بہت سے مختلف شعبوں بشمول طب، فلکیات اور ریاضی میں سائنسدانوں کو سائنس اور سائنس کے اہم مراکز میں تعلیم و تعلم کی دعوت دے کر کام کرنے کے بہت ساز گار حالات فراہم کئے۔ثقافت مذہب یا قومیت کی پرواہ کیے بغیر ضرورت کے مطابق مغرب یا مشرق کے سائنسدانوں اور فنکاروں کی خدمات کو حاصل کرنا سلطنت عثمانیہ کا ایک اہم اور فائدہ مند عمل تھا۔

ابتدائی دور کے عثمانی سائنسدانوں اور اسکالرز نے سائنس کی ترقی میں غیر معمولی خدمات حاصل کیں،اس دور کے سائنسداں علوم کی مختلف شاخوں میں بہت سی نئی ایجادات کرنے میں کامیاب ہوئے۔یہ بات بھی تسلیم شدہ ہے کہ جس طرح کی سائنسی ترقی عہد عباسیہ، اور اندلس کی اموی حکومت کے دور میں ہوئی عثمانی عہد کی سائنسی ترقیات کو اس سے مناسبت نہیں ہے۔اس کی ایک بڑی وجہ مسلم دنیاء میں علمی زوال تھا پھر بھی ہمیں اس عہد میں سائنس کے میدان میں غیر معمولی کارنامیں دیکھنے کو ملتے ہیں جن میں طب، فلکیات، ریاضیات، جغرافیہ، اور دیگر علوم شامل ہیں۔

علم طب عثمانی حکمرانوں کے ساتھ ساتھ عوام کی دلچسپی کا بھی مرکز تھا،امراء وزراء نے بھی اس علم کی ترقی میں خاصہ اہم کردار ادا کیا، پورے ملک میں اس طرح کے شفاخانے قائم کئے گئے جن میں مثال موجودہ زمانہ کے میڈیکل کالجز سے دی جاسکتی ہے۔وہاں مریضوں کے علاج و معالجہ کے ساتھ ماہرین طب طلباء کو تعلیم بھی دیا کرتے تھے، عثمانی دور کے اطباء نے دماغی امراض اور موروثی بیماریوں کے علاج کی طرف خاطر خواہ توجہ مبذول کی اور ان میدان میں نئی نئی تحقیقات و دریافتیں پیش کیں۔عثمانی عہد کے اطباء کو آنکھوں کی بیماریوں کے علاج میں خاص مہارت رکھتے تھے، وہ امراض چشم سے متعلق بیماریوں کا نہایت کامیاب علاج کیا کرتے تھے۔اس دور کے اطباء میں جنہوں نے علم طب میں شہرت حاصل کی ان میں اہم نام حاجی پاشا کا ہے انہوں نے مذہبی علوم کے علاوہ علم طب میں عربی اور ترکی زبان میں کتابیں تصنیف کیں طب پر ان کی کتاب "شفاء الاقسام" ایک

انسائکلوپیڈک کام ہے۔اس کتاب میں آپ نے انسانوں میں پائی جانے والی بیماریوں کے اقسام اور اس کے طریقہ علاج وغیرہ پر محققانہ کام انجام دیا ہے۔ آپ نے رازی اور ابن سینا کے نظریات پر مفصل بحث کی ہے اور چیچک وخسرہ کے علاج و معالجہ میں مفید دواؤں کا تذکرہ کیا ہے نیز آپ نے جانوروں کے کاٹنے، پھنسی، کالرا، میادی بخار، خارش، طاعون وغیرہ بیماریوں میں ذکریارازی اور ابن سینا سے الگ اپنی رائے دی ہے جو موجودہ علم طب میں زیادہ موزو اور بہتر ہے۔

اس ضمن میں دوسرا اہم نام حکیم اسحٰق بن مراد کا ہے جو چودہویں صدی کے بڑے ماہر طبیب گزرے ہیں آپ نے "ادویات المفردہ" کے نام سے طب میں ایک اہم کتاب لکھی جو 1390ء میں شائع ہوئی اور 14ویں صدی میں عہد عثمانی میں علم طب پر لکھی جانے والی پہلی کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔اس کتاب میں دو ابواب ہیں پہلے باب میں دواؤں کے نام عربی، فارسی اور ترکی زبان میں ہیں اور دوسرے باب میں بیماریوں میں دواؤں کا استعمال اور ان کا طریقہ کا لکھا ہوا ہے۔اس کے علاوہ آپ نے اس میں خانے کے اقسام اور اس میں پائی جانے والے طبی عناصر کا بھی ذکر ہے جس میں، جو، انجیر، کو ئنا، جائفل، گیہوں، شہتوت، ناریئل، کھجور، شہد، کھیرا، کالی مرچ، دار چینی، سونف، لہسن اور پیاز وغیرہ کا ذکر شامل ہے۔اسی طرح عہد عثمانی کے اطباء میں ایک اور اہم نام حکیم برکت کا نام شامل ہے، آپ کی سوانح حیات کے بارے میں زیادہ کچھ مواد نہیں ملتا البتہ تاریخی روایات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ آپ محمد اول کے زمانہ سے متعلق ہیں۔ آپ نے علم طب میں ایک کتاب "لب النہایہ" کے نام سے تصنیف کی، جس کا ترجمہ فارسی اور ترکی زبان میں بھی آپ ہی نے کیا۔ حکیم برکت ابن سینا کی کتاب القانون سے بہت متاثر تھے اور اپنی کتاب میں القانون کا جابجا اقتباس نقل کیا ہے۔ آپ نے اپنی کتاب میں انسانی جسم کی ساخت اس کی حیاتیاتی سائیکل اور انسانی جسم میں ہونے والی تبدیلیوں پر زور دیا ہے۔

6.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- عثمانی دور میں علوم کی ترقی میں مدارس کا کیا کردار رہا اور اس دور میں اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔
- علمی سرپرستی میں سلاطین عثمانیہ نے کیا کردار ادا کیا اور انہوں نے اس ضمن میں خود کیا کیا کوششیں کیں۔ نیز اس سبق سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ جس طرح عباسیوں اور اندلس میں اموی سلاطین نے علوم کی ترقی میں اپنا کردار جس طرح ادا کیا تھا کیا اسی طرح عثمانیوں نے بھی علماءع فضلاء کی سرپرستی کی؟
- عہد عثمانی میں زیادہ تر کام تاریخ، جغرافیہ اور طب میں ہوئے ہیں اور ان میدانوں میں عمدہ کتابیں تصنیف کی گئی ہیں جن میں "کشف الظنون"، مراۃ العالم، مناقب الہنرواں، ارشاد العقل السلیم، کنہ الاخبار، جہاں نما وغیرہ اہمیت کی حامل ہیں۔
- عثمانی دور میں جن علماء نے علوم کی ترقی میں اہم رول ادا کیا ان میں، شمس الدین فناری، حاجی خلیفہ، ابو سعود آفندی، کمال پاشا، مصطفیٰ علی چیلی، پیری رئیس، سید علی رئیس، حکیم اسحٰق، حکیم برکت اور حاجی پاشاوغیرہ نمایاں نام ہیں۔

6.8 نمونہ امتحانی سوالات

6.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. عثمانی عہد میں سب سے پہلے شیخ الاسلام کا عہدہ کس کو عطاء ہوا؟

(a). شمس الدین محمد بن حمزہ (b). حاجی بیرم ولی (c). شیخ حمید الدین (d). سنان پاشا

2. کلیہ کسے کہتے ہیں؟ ایک لائن میں بتایئے۔

----

3. آق شمس الدین کے روحانی استاذ کا نام بتایئے؟

(a). شیخ ابو طاہر محمد کردی (b). حاجی بیرم ولی (c). علامہ فناری (d). شیخ محمد عبدہ

4. محمد فاتح نے کس عالم دین کو "عصر حاضر کا ابو حنیفہ" کا لقب دیا تھا؟

(a). شمس الدین احمد بن سلیمان پاشا (b). شیخ حمید الدین (c). خضر بیگ (d). ملا خسرو

5. تاریخ آل عثمان کے مصنف کا نام بتایئے؟

(a). شمس الدین احمد بن سلیمان پاشا (b). ملا خسرو (c). علامہ فناری (d). ابو سعود آفندی

6. "ارشاد العقل السلیم" کس کی تصنیف ہے؟

(a). شیخ ابو طاہر محمد کردی (b). حاجی بیرم ولی (c).5ابو سعود آفندی (d). حاجی پاشا

7. الادویات المفردہ کس کی تصنیف ہے؟

(a). حکیم حاجی پاشا (b). حکیم برکت (c). حکیم اسحٰق (d). حکیم ابن سینا

8. کشف الظنون کس فن سے متعلق ہے؟

(a). طب (b). فلکیات (c). تذکرہ (d). تصوف

9. کنہ الاخبار کے مصنف کا نام بتایئے؟

(a). ابو سعود آفندی (b). مصطفیٰ علی چلپی (c). حاجی خلیفہ (d). کمال پاشا

10. عہد عثمانی میں پہلا مدرسہ کس نے اور کہاں قائم کیا؟

(a). محمد اول نے ادرنہ میں (b). سلیمان اعظم نے استنبول میں

(c). اورخان نے ازنیق میں (d). محمد فاتح نے قونیہ میں

6.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. عہد عثمانی میں علم طب میں ہوئی خدمات پر نوٹ لکھیے۔
2. عثمانی دور میں فلکیاتی ترقی کا جائزہ لیجیے۔
3. مصطفیٰ علی چلپی کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔
4. حاجی خلیفہ کی علمی خدمات پر مضمون لکھیے۔
5. ابو سعود آفندی کی خدمات پر نوٹ لکھیے۔

6.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. عثمانی دور کی علمی خدمات میں مدارس کی اہمیت و خدمات پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔
2. عثمانی عہد میں نقلی علوم کی ترقی پر مفصل مضمون لکھیے۔
3. عہد عثمانی میں عقلی علوم کی ترقی پر روشنی ڈالیے۔

6.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

.1	ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ	:	ثروت صولت، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی
.2	آل عثمان	:	اسلم جیراجپوری، مکتبی جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی
.3	دولت عثمانیہ (اول، دوم)	:	ڈاکٹر محمد عزیر، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ
.4	تاریخ ملت	:	مفتی زین العابدین سجاد میرٹھی و مفتی انتظام اللہ شہابی، ادارہ اسلامیات، کراچی، پاکستان
.5	اردو دائرہ معارف اسلامیہ	:	دانش گاہ پنجاب، لاہور پاکستان

اکائی 7: عثمانی دور میں فن تعمیر

اکائی کے اجزا:

7.0 تمہید

7.1 مقاصد

7.2 سلطنت عثمانیہ میں فن تعمیر اور اس کا ارتقاء

7.3 سلطنت عثمانیہ کے اہم تعمیری نمونے

7.3.1 مسجدیں اور عوامی کلیے

7.3.2 محل اور حمام

7.3.3 بازار اور کارواں سرائے

7.4 عثمانی فن تعمیر کی اہم خصوصیات

7.5 اکتسابی نتائج

7.6 کلیدی الفاظ

7.7 نمونہ امتحانی سوالات

7.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

7.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

7.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

7.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

7.0 تمہید

انسانی تاریخ نہ صرف اس بات پر شاہد ہے بلکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت بھی ہے کہ کسی بھی تہذیب و ثقافت کا سب سے نمایاں، دیرپا

اور تفصیلی اظہاراس کے تعمیری نمونوں میں ہوتا ہے، جس کے بین ثبوت مختلف قوموں، علاقوں اور تہذیبوں کی تاریخ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ پروفیسر محمد مجیب کے بقول: "عمارتوں کی بھی زبان ہوتی ہے اور ہر عمارت اپنی ابدی و پر شکوہ خاموشی کے باوجود آپ سے کچھ کہتی ہے۔ وہ صرف اپنے بنانے والے یاوالوں کے ذہن ودماغ کی ہی عکاسی نہیں کرتی بلکہ اپنے عہد اور گردوپیش کے حالات وواقعات کی بھی راوی ہوتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ اسے سننے کے لیے آپ کے پاس کان ہوں اور لکھنے وبیان کرنے کے لیے الفاظ وزبان"۔

عثمانی تاریخ بالخصوص تہذیب وثقافت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ سلطنت کے چھ سوسالہ دور میں تمدنی وثقافتی کارناموں کی انجام دہی اور ان کے اظہار کا سب سے اہم ذریعہ فن تعمیر تھا۔ تعمیراتی نمونوں میں مرکزیت، تقدیس و توازن، زینت وآرائش اور حسن ولطافت سے سلطنت عثمانیہ کے ماہرین اور فن کاروں کا خصوصی شغف ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے معماروں نے مسجدوں اور محلوں کی تعمیر کے جدید خاکے متعارف کرائے۔ انہوں نے اپنی عمارتوں میں میناروں کے استعمال سے عظمت، گنبد ومحراب سے ندرت، بیل بوٹوں وپھول پتیوں کے نقش و نگار سے حسن، اقلیدسی اشکال اور شوخ رنگوں کے استعمال سے ضیاء وچمک اور قرآنی آیتوں کی خطاطی سے تقدس پیدا کیا۔

7.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد طلبہ کو سلطنت عثمانیہ کی تہذیبی وثقافتی زندگی کے ایک اہم گوشے یعنی فن تعمیر کی ترقیات سے روشناس کرانا ہے تاکہ طلبہ سلطنت عثمانیہ کی فن عمارت سازی کی ترقیات کا نہ صرف ادراک کر سکیں بلکہ انہیں اس بات کا بھی اندازہ ہو سکے کہ ملک و قوم کی زندگی میں اس کی کیا اہمیت ہوتی ہے؟ اس اکائی کا مقصد طلبہ کو عثمانی فن تعمیر کی خصوصیات اور تعمیراتی نمونوں سے متعارف کرانا بھی ہے اور انہیں اس بات کی بھی معلومات فراہم کرنا ہے کہ وہ کون سے مادے اور اجزائے ترکیبی تھے، جن سے سلطنت عثمانیہ کی عمارتیں تعمیر کی گئیں؟ اس عہد کے حکم رانوں اور ماہرین نے کس قسم کی عمارتوں کو تعمیر کرنے میں دلچسپی دکھائی؟ تاکہ وہ سلطنت عثمانیہ کی اس ثقافتی ترقی سے واقف ہو سکیں، جو ان کی تاریخ کا ایک شان دار باب رہی ہیں۔

7.2 سلطنت عثمانیہ میں فن تعمیر اور اس کا ارتقاء

سلطنت عثمانیہ میں ثقافتی کارناموں کی انجام دہی اور ان کے اظہار کا سب سے اہم اور بنیادی ذریعہ فن تعمیر تھا۔ فن تعمیر کی ترقی میں اس عہد کے حکم رانوں، امراء اور روساء نے نہ صرف بھرپور حصہ لیا بلکہ اس کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی بھی کی۔ سلطنت کے مختلف حصوں میں موجود اس عہد کے تعمیری نمونے ان کی دل چسپی اور سرپرستی کا آئینہ دار ہیں۔ عثمانی فن تعمیر کا اپنے ابتدائی سالوں میں ایرانی اور وسط ایشیائی تعمیری روایات سے گہرا رشتہ رہا، مگر سلطنت کی توسیع کے نتیجے میں اس نے بازنطینی، عربی اور افریقی اثرات بھی قبول کیے۔ اس طرح مفتوحہ علاقوں کے مختلف تعمیراتی وآرائشی نمونوں، اجزاء اور تراکیب وخصوصیات کو عثمانی فن تعمیر کا حصہ بنایا گیا۔ مختلف تعمیری روایات سے ماخوذ اجزاء کے اس مرکب کو عثمانی سلاطین اور ماہرین تعمیرات نے نہ صرف وسعت دی بلکہ اپنی فکری، فنی اور اختراعی صلاحیتوں کے مطابق اس میں قابل قدر اضافے بھی کیے۔ اسی تعمیری روایت کو تاریخ میں عثمانی فن تعمیر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ سلطنت عثمانیہ میں فن تعمیر کی

تاریخ کو مورخین نے مختلف ادوار میں منقسم کیا ہے، جو درج ذیل ہیں:

1. ابتدائی عہد: تیرہویں صدی عیسوی سے فتح قسطنطنیہ تک

عثمانی حکومت کا قیام تیرہویں صدی کے اواخر میں شمال مغربی اناطولیہ کے ایک چھوٹے سے علاقہ سُغُوت میں ایک جاگیر سے ہوا۔ اِزنِک میں اب بھی ابتدائی عثمانی عہد کی بہت سی عمارتیں موجود ہیں، جو عثمانیوں کا پہلا دارالسلطنت بھی رہا اور عثمانی فن تعمیر کا اولین مرکز بھی۔ ان میں سبز مسجد، نیلو فر خاتون کا محل، سلیمان پاشا مدرسہ، مختلف مقبرے، اسماعیل بے حمام اور بُیُوک حمام شامل ہیں۔ عثمانی فن تعمیر کے ابتدائی عہد کا دوسرا مرکز برصہ تھا، جسے عثمانی حکم رانوں نے اپنا دارالحکومت بنایا تھا۔ یہاں پر بھی ابتدائی عثمانی عہد کی بہت سی عمارتیں موجود ہیں، جن میں جامع مسجد، جس کی تعمیر بایزید اول کے عہد میں ہوئی، ایک کشادہ کارواں سرائے اور ایک بڑا مسقف بازار شامل ہیں۔ بُرصَہ کی ابتدائی عمارتوں میں بازنطینی فن تعمیر کا اثر واضح طور پر نظر آتا ہے۔ 14ویں اور 15ویں صدی میں عثمانی سلطنت میں ایک خاص ترتیب اور انداز میں مسجدوں سے منسلک عام طور پر مہمان خانے، مدرسے، حمام اور چند دوسری عوامی عمارتیں تعمیر کی جاتی تھیں۔ بعد کے عہد میں یہی تعمیری نمونہ عثمانی فن تعمیر کی شناخت قرار پایا۔ بُرصَہ کی ابتدائی عمارتوں میں اُورخان کی مسجد اہم ہے، جس میں مسجد کے ساتھ مہمان خانہ بھی تعمیر کیا گیا ہے۔ اسی طرح بُرصَہ میں مراد اول کا تعمیر کردہ خداوند گار کلیہ، ابتدائی عثمانی فن تعمیر کا ایک شان دار نمونہ ہے۔ ابتدائی عثمانی سلاطین کی تدفین بُرصَہ میں ہوئی، یہاں پر مراد اول کی مسجد سے متصل قبرستان میں ابتدائی عہد کے مقبرے موجود ہیں، جو اپنی تعمیراتی خصوصیات کے اعتبار سے ابتدائی عثمانی فن تعمیر کے اہم نمونے شمار کیے جاتے ہیں۔ فن تعمیر کے اعتبار سے بُرصَہ میں واقع محمد چلیپی کا مقبرہ ان میں سب سے اہم ہے۔ یِشِل کلیہ میں واقع یہ یادگار تعمیرات، بشمول مقبرہ، مسجد اور مدرسہ، ایرانی اور وسط ایشیائی معماروں اور کاری گروں کی شوخ روغنی ٹائلوں کی تزئین کاری اور لکڑی پر نفیس کندہ کاری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ابتدائی عثمانی فن تعمیر کا تیسرا اہم مرکز اَدَرنہ ہے۔ اس قدیم یونانی قصبے کو عثمانی عہد میں ترقی ملی اور نیا شہر قدیم قصبہ کی دیواروں کے باہر تعمیر ہوا۔ نئے شہر میں ایک تجارتی مرکز، مذہبی عمارتیں اور شاہی محل، لاتعداد رہائشی مکانات اور دوسری عمارتیں شامل تھیں۔ 14ویں اور 15ویں صدی کے ان تعمیری نمونوں میں سے ایک شاہی محل، متعدد مساجد، ایک مسقف بازار، متعدد خوب صورت حمام اور پل اب بھی باقی ہیں۔ اَدَرنہ میں فن تعمیر کے جدید اور اچھوتے تعمیری نمونوں کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ برتا اور پروان چڑھایا گیا۔ اَدَرنہ میں مراد دوم کے عہد میں 1438 سے 1447 کے درمیان تعمیر ہونے والی اُچ شرفلی مسجد اپنی تعمیراتی خصوصیات کے اعتبار سے عثمانی فن تعمیر میں تعمیر مسجد کے لیے حوالے اور معیار کا درجہ رکھتی ہے۔ عثمانی سلاطین نے اپنی سلطنت کو استحکام بخشنے کے لیے حفاظتی نقطہ نظر سے اہم مقامات پر بڑی تعداد میں قلعے اور مینار تعمیر کیے۔ آبنائے باسفورس پر ان کا پہلا اناطولیائی قلعہ بایزید اول کے دور میں تعمیر کیا گیا اور قسطنطنیہ کے محاصرے سے پہلے رومیلیائی قلعہ تعمیر ہوا، جس کا مقصد آبنائے باسفورس سے گزرنے والی کشتیوں اور جہازوں کو کنٹرول کرنا تھا۔

2. ابتدائی کلاسیکی عہد: فتح قسطنطنیہ سے اواخر پندرہویں صدی عیسوی

قسطنطنیہ کی فتح نے عثمانی فن تعمیر کی ترقی کو جلا بخشی۔ محمد دوم نے اس شہر کو اپنا دارالحکومت بنایا، جسے بعد میں استنبول کے نام

سے جانا گیا۔ عثمانی سلطنت میں فن تعمیر کی ترقی اوراس کی ارتقائی تاریخ کے اعتبار سے 15ویں صدی کا دوسرا نصف بہت اہم شمار کیا جاتا ہے، اس عہد میں کئی بڑے تعمیراتی منصوبے مکمل ہوئے۔ ان میں سب سے اہم توپ کاپی محل، جامع فاتح کلیہ، سات میناروں والا قلعہ، ابو ایوب انصاری کلیہ اور مسقف بازار شامل ہیں۔ اس عہد کے تعمیراتی نمونوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ عثمانی معمار چھٹی صدی کی بازنطینی یادگار ایاصوفیہ سے کافی متاثر تھے اورانہوں نے اس کی ترتیب وتزئین اور خوب صورتی کو اپنی مساجد کے خاکوں میں بھرنے کی کوشش کی۔ اس عہد کی اہم یادگاروں میں ابتدائی مسجد فاتح کو شمار کیا جاتاہے، جو چند نیم گنبدوں کے ساتھ ایک مرکزی گنبد والا ڈھانچہ تھا۔ بعد کی صدیوں میں چھوٹے اور نیم گنبدوں کے ساتھ ایک مرکزی گنبد کا امتزاج عثمانی مساجد کی شناخت بن گیا، جن میں بایزید دوم کی مسجد، شہزادے مسجد، سلیمانیہ مسجد، سلطان احمد مسجد اوریِنی جامع کو شمار کیا جاتاہے۔ ان مساجد کے مرکزی گنبد آبشار کا نقشہ پیش کرنے والے نیم گنبدوں کے ساتھ مسجد کے اندرونی حصے میں کامل ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں۔ مساجد کے اندرونی حصے سفید ورنگین سنگ مرمر، نفیس پتھروں کے مزین نقوش، خطاطی، شوخ وروغنی اِزنیکی ٹائلوں، رنگین شیشوں، موتیوں کی عمدہ کندہ کاری اور رنگین مصوری سے مزین تھے۔ اسی طرح اس عہد کے تعمیری نمونوں اور فن تعمیر کی ایک بہترین مثال استنبول کے توپ کاپی محل سے ملتی ہے، جس نے بعد کے عہد میں محلوں کی تعمیر میں گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔ تعمیراتی ترقی اور فنی حصولیابیوں کے اعتبار سے بجاطور پر اس عہد کو عثمانی فن تعمیر کا ابتدائی کلاسیکی عہد قرار دیا جاسکتاہے۔

3. کلاسیکی عہد یا عہد زریں: سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی

عثمانی تاریخ میں 16ویں اور 17ویں صدی فن تعمیر اوراس کی ترقی کے اعتبار سے سب سے اہم رہی ہیں۔ اس عہد میں سلطنت کے مختلف حصوں بالخصوص استنبول، اَدَرنہ اور بُرصَہ میں بہت سی عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ اس عہد کی عمارتیں اور تعمیراتی نمونے اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ انہیں بڑے پیمانے پر سلاطین کی سرپرستی اور سیاسی واقتصادی اداروں کی معاونت حاصل رہی تھی، کیوں کہ اس عہد کے تعمیراتی نمونے نہ صرف بڑے اوراعلیٰ منصوبہ بندی کا آئینہ دار ہیں بلکہ عمدہ ونفیس قسم کے نقش ونگاراور دست کاری وکندہ کاری کے نمونوں سے مزین وآراستہ بھی ہیں۔ تعمیراتی ترقی اور طرز تعمیر میں عمارتی اجزاء، تراکیب وخصوصیات کے استعمال کے اعتبار سے 16ویں اور 17ویں صدی کو عثمانی فن تعمیر کا کلاسیکی وسنہرا دور تصور کیا جاتاہے۔ عثمانی فن تعمیر کے کلاسیکی عہد کا سب سے بہترین اوراہم نمائندہ بجاطور پر خواجہ سنان ہے، جو 1539 سے 1588 تک سلطنت عثمانیہ کے معمار اعلیٰ رہے۔ استنبول اور دمشق کے سلیمانیہ مسجد کلیے؛ اَدَرنہ کا سلیمیہ مسجد کلیہ؛ استنبول کے قریب 'بُیُوک چِک مجے 'پل اوروزِگراد (بوسنیا) میں 'محمد پاشا سُکولووِک 'پل، تین براعظموں پر محیط سلطنت عثمانیہ کے مختلف علاقوں میں خواجہ سنان کے وسیع کاموں کی صرف چند مثالیں ہیں۔

سنان کے بڑے تعمیراتی منصوبوں میں سلیمانیہ مسجد کلیہ اور عتیق والدۂ سلطان مسجد کلیہ ہیں۔ اونچے گنبدوں والی سلیمانیہ مسجد استنبول کی ایک اہم عمارت ہے۔ اس کلیے میں تقریباً ایسے تمام مذہبی اور رفاہی ادارے شامل ہیں، جو 16ویں صدی میں سلطنت میں فعال تھے۔ معمار سنان کی ذمہ داریوں میں انجینئرنگ کے کام بھی شامل تھے، جیسے استنبول کو تازہ پانی کی فراہمی میں سہولیات بہم پہنچانا۔ انہوں نے

پانی کے چشموں اور شہر کے درمیان وادیوں کو عبور کرنے کے لیے لمبی مسقف آبی قناتیں تیار کیں۔'اُوزُون کیمر ،مَیگ لووا کیمِر 'اور'اِگرِی کیمر' سبھی دومنزلہ آبی قناتیں کِرک چشمہ آب رسانی منصوبے کا حصہ تھیں،جو شہروں کو پانی فراہم کرتیں۔سنان نے مسافروں و تجارتی اشیاء کی نقل و حمل اور فوجی مہموں میں سہولیات بہم پہنچانے کے لیے جھیلوں اور دریاؤں پر پل بھی تعمیر کیے۔ترکی کے تھریسیائی حصے میں دریائے اِرگنِے پر'اُوزُون کوپرو' پل ایک وسیع دریا پر بنے سب سے شان دار لمبے پلوں میں سے ایک ہے۔بوسنیا کا شہر موسٹار دریائے 'نرِتوا' پر واقع اپنے ایک محراب والے پل کے لیے مشہور ہے۔پتھروں کے ان پلوں کے وسط میں عام طور پر اس سے متعلق کتبے نصب کیے جاتے اور فوج کا معائنہ کرنے کے مقصد سے سلطان یا وزیر کے لیے ایک چھوٹا سا کھلا دالان بنایا جاتا۔اسی طرح 'بُیُوک چِک مجے' پل استنبول کے نواح میں 1565 اور 1568 کے درمیان بحیرہ مرمرہ کے قریب ایک جھیل پر بنایا گیا، یہ پل 635 میٹر لمبا ہے۔17 ویں صدی کے تعمیراتی نمونوں میں سلطان احمد مسجد، جسے نیلی مسجد کہا جاتا ہے، استنبول کے بڑے تعمیری منصوبوں میں سے ایک ہے۔معمار صدف کار محمد آغا نے ایک شان دار کلیہ ترتیب دیا، جس میں احمد اول کا مقبرہ، ایک مدرسہ، ایک عوامی مطبخ، متعدد دکانیں اور مکانات تعمیر کیے گئے تھے۔استنبول کی یہ واحد مسجد ہے، جس کے چھ مینار ہیں۔

4. عہدِ زوال: اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی

18 ویں صدی کے اوائل کو عثمانی فن تعمیر میں 'ٹُلِپ' عہد کے نام سے جانا جاتا ہے، جب اٹلی اور فرانس سے رابطے کے نتیجے میں عثمانی فن تعمیر میں 'رُکوکو' طرز تعمیر کے اثرات نمودار ہوئے اور 1730 سے 19 ویں صدی کے اواخر کو عثمانی فن تعمیر میں 'بَروق عہد' شمار کیا جاتا ہے۔استنبول کی جامع نور عثمان بَروق طرز کی پہلی عظیم الشان مسجد ہے۔یہ ایک گنبد والی مسجد ہے، جس میں گنبد کو بڑے اور مزین محراب کے اوپر تعمیر کیا گیا ہے۔مسجد کا صحن اپنے بیضوی منصوبے اور شکل کے ساتھ عثمانی فن تعمیر میں منفرد ہے۔سلطان کی اقامت گاہ، ایک کتب خانہ، ایک مطبخ، سبیل اور سلطان کا مقبرہ کلیہ کا حصہ ہیں۔19 ویں صدی میں بہت سے یورپی ممالک میں نَوکلاسیکی، نَوبَروق اور نَوقُوطی طرز حاوی رہے۔اس عہد میں ان یورپی معماروں اور انجینئَروں نے سلطنت عثمانیہ میں بھی یورپی طرز تعمیر کو متعارف کیا، جنھیں جدید اسکولوں، ہسپتالوں یا فوجی بیرکوں کی منصوبہ سازی یا تعمیر کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔اسی لیے استنبول اور سلطنت کے دیگر حصوں میں 19 ویں صدی میں یورپی طرز کی بہت سی عمارتیں نظر آتی ہیں۔عثمانی فن تعمیر کی تاریخ میں 19 ویں صدی کے اواخر میں ایک احیاء بھی نظر آتا ہے، جسے قومی فن تعمیر کا نام دیا گیا۔اس طرز تعمیر کو الیکزنڈر ولیری، رائمنڈ وڈی اَرونکو، کمال الدین بے اور محمد وِداد ٹیک جیسے غیر ملکی اور مقامی معماروں نے اپنایا تھا۔عثمانی فن تعمیر میں 20 ویں صدی کی ابتداء میں فن تعمیر کا ایک جدید طرز متعارف ہوا۔استنبول میں اس طرز کو اطالوی معمار رائمنڈ وڈی اَرونکو نے متعارف کیا، جنہوں نے سلطان عبدالحمید دوم کے لیے یَلدِز محل کے احاطے میں کئی عمارتیں تعمیر کیں۔سلطنت عثمانیہ کے آخری سالوں میں قومی اور جدید طرز کا مرکب نظر آتا ہے۔20 ویں صدی کی دوسری دہائی میں ترک جمہوریہ کے قیام کے بعد بھی طرز تعمیر میں کچھ عرصے تک قومی طرز حاوی رہا۔

7.3 سلطنت عثمانیہ کے اہم تعمیری نمونے

عثمانی حکم رانوں اور ماہرین تعمیرات نے سلطنت اور رعایا کی ضرورتوں کے پیش نظر بڑے پیمانے پر مختلف قسم کی عمارتیں تعمیر کیں، جن میں مسجد، محل، مہمان خانے، مدرسے ومکاتب، کتب خانے، خانقاہ، مقبرے، اراستہ بازار، مسقف بازاراور کارواں سرائے، اسپتال، حمام، پانی کی ترسیل کے نظام، فوارے، سبیل (پانی فراہم کرنے والے ذمہ داران کے ساتھ پانی کے چھوٹے ذخائر)، پل اور قلعے وفوجی بیرک شامل ہیں۔ سلطنت عثمانیہ میں تمام قسم کے تعمیراتی منصوبوں کی تنظیم وترتیب، اس پر عمل آوری اوراس کی دیکھ بھال ومرمت کی ذمہ داری سلطنت کے معمار اعلیٰ اور اس کے دفتر کی ہوتی۔ وہ تمام قسم کے تعمیراتی منصوبوں کو دارالحکومت اور سلطنت کے مختلف علاقوں میں نافذ کرتا۔ صوبائی سطح پر ان تعمیراتی اصولوں، اجزاء وخصوصیات کی توسیع دوسرے درباری معماروں کے ذریعہ انجام دی جاتی۔ عثمانی سلاطین اور معماروں کی انہی کوششوں کے نتیجے میں فن تعمیر کا ایک متوازن وممتاز طرز ظہور پذیر ہوا، جسے تاریخ میں عثمانی طرز کا نام دیا گیا۔ اس طرز تعمیر کے مختلف فنی اور عمارتی نمونوں کو آج بھی استنبول اوراناطولیہ کے علاوہ سلطنت عثمانیہ کے دوسرے علاقوں بلغاریہ، بوسنیا، سربیا، یونان، البانیہ، شام، اردن اور مصر وغیرہ میں دیکھا جاسکتا ہے۔

7.3.1 مسجدیں اور عوامی کلیے

عثمانی تعمیراتی تاریخ میں مسجدوں کی حیثیت بنیادی رہی اور سلاطین نے مسجدوں کی تعمیر پر خصوصی توجہ صرف کی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عثمانی فن تعمیر کی ترقی میں مسجدوں کے تعمیری منصوبے نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ عثمانی فن تعمیر کا اہم اور مؤثر کن عنصر ایک یا متعدد گنبدوں والی مسجدیں شمار کی جاتی ہیں، جن کے اطراف میں مختلف قسم کی عوامی عمارتیں تعمیر ہوتیں اور سب مل کر ایک کلیے کا نقشہ پیش کرتے۔ ان کلیوں میں مذہبی وعوامی سہولیات کا عنصر غالب ہوتا، اس طرح مسجد کے اطراف میں متعدد عمارتیں تعمیر کی جاتیں، جیسے: مدرسہ، اسپتال، کتب خانہ، عوامی مطبخ، مہمان خانہ، چشمہ / سبیل، حمام اور مقبرے۔ عثمانی مسجدوں کو تعمیراتی خاکے کے اعتبار سے تین اقسام میں بانٹا جاسکتا ہے۔ (1) ایک گنبد والی مسجدیں (2) T یا بُرصَہ طرز کی مسجدیں (3) متعدد گنبد والی مسجدیں۔

عثمانیوں کی ابتدائی مساجد ایک گنبد یا لکڑی کی چھتوں والی تعمیرات تھیں، مگر رفتہ رفتہ مسجدوں کے حدود اربعہ میں اضافہ اور تعمیراتی اجزاء وخصوصیات میں نفاست پیدا ہوتی گئی۔ اس طرح عثمانی مسجدوں میں نیم گنبد، محراب دار صحن، دہرے دالان اور بغلی برآمدے جیسے اہم تعمیراتی عناصر ظاہر ہوئے۔ اِزنِک میں 1333 میں تعمیر ہونے والی حاجی اُزبِک مسجد سلطنت عثمانیہ کی قدیم ترین مسجد ہے۔ خاکے کے اعتبار سے مسجد چوکور ہے، جس میں ایک مربع ایوان کے اوپر ایک گنبد تعمیر کیا گیا ہے۔ مسجد بنیادی طور پر اینٹوں اور پتھر کے تراشوں سے تعمیر کی گئی ہے اور گنبد کو کھپریل سے ڈھکا گیا ہے۔ ابتدائی دور کی ایک گنبد والی مسجدوں میں اِزنِک کی سبز مسجد کافی اہم ہے، جس کی تعمیر مراد اول کے عہد میں قرا خیلِ پاشا کے حکم سے 1378 سے 1391 کے درمیان معمار حاجی بن موسیٰ کے ذریعہ کی گئی۔ مرکزی نماز گاہ کے اوپر ایک گنبد ہے، جس کا قطر 10.5 میٹر اوراونچائی 17.5 میٹر ہے، اس میں چار کھڑکیاں ہیں۔ اندرونی دیواروں کے نچلے حصے پر سرمئی سنگ

مرمر کی تختیاں لگی ہیں۔ عمارت کے شمال مغربی کونے میں مسجد کا اکلوتا مینار ہے، جسے سبز، پیلے، فیروزی اور گہرے جامنی رنگ کی چمک دار روغنی ٹائلوں سے مزین کیا گیا ہے۔ مینار پر رنگین ٹائلوں اور خاص طور پر سبز رنگ کی کثرت نے اسے سبز مسجد کا نام عطا کیا۔ سلطنت عثمانیہ کی ابتدائی مساجد میں شمال مغربی ترکی کے صوبہ بولو کے قصبہ مودورنو میں واقع یلدرم مسجد بھی اہمیت کی حامل ہے، جس کی تعمیر 1389 میں ہوئی۔ اس مسجد کے مرکزی اور بڑے گنبد کا موازنہ بعد کی عثمانی مساجد سے کیا جاسکتا ہے، جس کا قطر 20 میٹر ہے، مگر گنبد کی بلندی زیادہ نہیں ہے، اسے زمین سے بہت قریب تعمیر کیا گیا ہے۔ اس مسجد میں مربع ایوان اور گول گنبد کے عبوری حصے کو ترکی مثلث کے بجائے محرابی زاویوں سے پورا کیا گیا ہے، جو دیواروں کے ساتھ نیچے سے شروع ہوتے ہیں۔

سلطنت عثمانیہ کی 'T' یا 'بُرصَہ طرز' کی مسجدوں نے عثمانی فن تعمیر کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ اس طرز کی ابتدائی مسجد اِزنِک میں 1335 میں اُورخان کے ذریعہ تعمیر کی گئی۔ ان مسجدوں کو 'T' طرز مسجد اس وجہ سے کہا جاتا ہے، کیوں کہ ان کا خاکہ انگریزی کے 'T' شکل کا ہوتا تھا۔ اسی طرح انہیں 'بُرصَہ طرز' مسجد اس لیے کہا جاتا ہے، کیوں کہ اس طرز کی زیادہ تر ابتدائی مسجدیں بُرصَہ اور اس کے اطراف میں تعمیر ہوئیں۔ بُرصَہ کی ابتدائی مسجدوں میں 1339 میں تعمیر ہونے والی اُورخان مسجد ؛1366 سے 1385 کے درمیان تعمیر ہونے والی خداوندگار مسجد ؛ یلدرم مسجد اور محمد اول کی سبز مسجد کو شمار کیا جاتا ہے، جن کی تکمیل 1395 اور 1419 میں ہوئی۔ یہ تمام مسجدیں مذہبی اور عوامی کلیے کا حصہ تھیں، جن میں مساجد کے علاوہ دوسری عمارتیں بھی شامل تھیں، جیسے: مدرسے، کتب خانے، عوامی مطبخ اور حمام۔ یہ مسجدیں تعمیراتی خصوصیات اور عناصر کے اعتبار سے عثمانی فن تعمیر کا اہم نمونہ شمار کی جاتی ہیں۔ یہ عہد خاص طور پر اپنے آرائشی نمونوں اور شوخ روغنی ٹائلوں کی وسیع تزئین کاری کے لیے مشہور ہے۔ بُرصَہ کے علاوہ 'T' طرز کی مسجدوں میں 1394 میں تعمیر کی گئی جنوب مغربی ترکی کے مُوگلہ صوبہ کی فیروز بے مسجد اہم ہے۔ یہ مسجد پتھروں کے استعمال اور اعلیٰ قسم کی کندہ کاری کے لیے مشہور ہے۔ اس طرز تعمیر کی دوسری مثالوں میں اَدَرنہ کی بیلر بے مسجد اور اِزمِر کی یحشِی بے مسجد کو شمار کیا جاتا ہے، جن کی تعمیر بالترتیب 1429 اور 1442 میں ہوئی۔ ان دونوں مسجدوں کے ذریعہ یہ طرز اپنے عروج کو پہنچتا ہوا دکھائی دیتا ہے، ساتھ ہی تعمیر میں تنوع اور جدت بھی نظر آتی ہے، جیسے کہ ان دونوں مسجدوں میں روایتی بغلی ایوان کے بجائے علاحدہ ہال بنائے گئے ہیں۔ دونوں عمارتوں میں قبلہ ایوان نیم ہشت پہلو ہے اور نیم گنبد سے ڈھکا ہوا ہے۔ گنبد کے اندرونی اور اس کے اطراف کو مقرنس، ہندسی اشکال اور دوسرے آرائشی نمونوں سے مزین کیا گیا ہے۔

عثمانی فن تعمیر کی تاریخ میں تعمیر مسجد اور فنی خصوصیات کا اعلیٰ نمونہ متعدد گنبدوں والی مسجدوں میں نظر آتا ہے۔ اس طرز کی ابتدائی مسجد بُرصَہ کی جامع مسجد ہے۔ یہ بُرصَہ کی سب سے بڑی مسجد ہے، جسے ابتدائی عثمانی فن تعمیر کا سنگ میل تصور کیا جاتا ہے، جسے 1399 میں معمار علی نجار نے تعمیر کیا۔ متعدد ستونوں اور 20 گنبدوں والی مکمل مسقف مسجد بنیادی طور پر دو حصوں میں منقسم ہے، قبلہ سمت میں مرکزی نماز گاہ اور دوسرے حصے کے درمیانی گوشہ میں گنبد کے نیچے وضو خانہ ہے۔ منبر ابتدائی لکڑی کے منبروں کی عمدہ مثال ہے، جسے کندہ کاری تکنیک کے ذریعہ بنایا گیا ہے۔ مسجد میں مرکزی بیرونی دروازے کی جانب دونوں کونوں پر دو مینار تعمیر کیے گئے ہیں۔ مسجد کا اندرونی حصہ قرآنی آیتوں، پھول پتیوں، بیل بوٹوں اور ہندسی اشکال کی آرائش کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ کثیر گنبد والی مسجد کی ایک اہم مثال اَدَرنہ کی

قدیم مسجد بھی ہے، جس کی تعمیر کی ابتدا 1403 میں امیر سلیمان کے ذریعہ ہوئی اور تکمیل 1414 میں محمد اول نے کی۔ مسجد مربع ہے، جس میں نو گنبدوں کا استعمال کیا گیا ہے اور ہر گنبد چار ستونوں پر قائم ہے۔ مسجد میں ابتدائی طور پر ایک مینار تعمیر کیا گیا تھا، دوسرے اور بڑے مینار کا اضافہ مراد دوم نے کیا۔ اندرونی حصے میں خطاطی اور شوخ رنگوں کا استعمال وافر مقدار میں کیا گیا ہے۔

اُچ شرفلی مسجد کلیہ: اَدَرنہ کی اُچ شرفلی مسجد اور اس کا کلیہ تعمیری اور فنی خصوصیات کے اعتبار سے کافی اہم ہے، جس کی تعمیر مراد دوم کے حکم پر 1437 سے 1447 کے درمیان ہوئی۔ اس کا منصوبہ ابتدائی عثمانی مساجد سے بالکل مختلف ہے۔ مسجد کے ساتھ ایک مکتب، دو مدرسے اور ایک عوامی مطبخ تعمیر کیا گیا تھا، جو اسے کلیہ کی شکل عطا کرتے ہیں۔ مستطیل مسجد، صحن اور مرکزی عبادت گاہ کے درمیان منقسم ہے۔ عثمانی فن تعمیر میں پہلی مرتبہ اس مسجد میں محراب دار دالان سے گھرے ہوئے صحن کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے بعد، کشادہ صحن حکم رانوں کے ذریعہ تعمیر ہونے والی مسجدوں کا لازمہ بن گئے، جن کے وسط میں وضو خانے کا چشمہ ہوتا۔ صحن کے وسط میں ایک چشمہ ہے، جو محراب اور گنبد دار دالان سے گھرا ہوا ہے۔ ایک شاندار مزین بیرونی دروازہ باہر سے صحن میں اور اسی طرح کا دوسرا دروازہ صحن سے مرکزی عبادت گاہ کے اندر لے جاتا ہے۔ مرکزی عبادت گاہ کے اوپر درمیان میں 24 میٹر قطر کا ایک بڑا گنبد موجود ہے۔ گنبد اپنے سابقہ عثمانی گنبدوں سے بڑا ہے، مرکزی ایوان کے اطراف میں چھوٹے چھوٹے جڑواں گنبد بنائے گئے ہیں۔ گنبدوں کے اس مجموعہ کو بصری اعتبار سے 'گنبدوں کے آبشار' کا ابتدائی نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے، جس کا اظہار بعد کی عثمانی تعمیرات میں نظر آتا ہے۔ اس مسجد کے ذریعہ عثمانی مسجدوں میں ایک اور جدت پیدا ہوئی، جو مسجد کے میناروں اور ان کی بالکونیوں کی تعداد میں اضافے کا سبب بنی۔ اُچ شرفلی مسجد پہلی عثمانی مسجد ہے، جس میں چار مینار ہیں، جو عمارت کے بیرونی حصے میں صحن کے چاروں کونوں پر ایستادہ ہیں۔ جنوب مغربی مینار اس عہد تک تعمیر کردہ عثمانی میناروں میں سب سے اونچا تھا۔ معمار نے ہر مینار پر خصوصی توجہ صرف کی ہے، سبھی میناروں کو مختلف قسم کی ابھری ہوئی دھاریوں اور مربع سرخ پتھروں سے بنے ہوئے آرائشی نمونوں سے سجایا گیا ہے، جو اسے ایک شاندار شکل عطا کرتے ہیں۔ مسجد اپنے تعمیراتی منصوبے، عناصر اور خصوصیات کے اعتبار سے ابتدائی اور کلاسیکی عثمانی فن تعمیر کا سنگم قرار دی جاتی ہے۔

ایا صوفیہ اور مسجد فاتح کلیہ: سلطان محمد ثانی دوم نے قسطنطنیہ کی فتح کے بعد وہاں کے قدیم کلیسا 'ایا صوفیہ'، جس کی تعمیر 537 میں رومی شہنشاہ قسطنطین نے کی تھی، کو مسجد میں تبدیل کیا اور اس میں چار نوک دار میناروں کا اضافہ بھی کیا۔ 1935 میں مصطفیٰ کمال پاشا نے اسے عجائب خانے میں تبدیل کر دیا تھا مگر رجب طیب اردگان نے 2020 میں اسے دوبارہ مسجد کے طور پر بحال کر دیا ہے۔ مسجد فاتح کلیہ 1463 سے 1470 کے درمیان استنبول میں محمد دوم کے حکم سے تعمیر ہوا۔ مسجد اور کلیہ منصوبے، وسعت وعظمت اور تعمیراتی عناصر و خصوصیات کے اعتبار سے ایک بے مثال تعمیری نمونہ ہے۔ معمار عتیق سنان کا تعمیر کردہ فاتح مسجد عثمانی کلاسیکی عہد اور شاہی تعمیراتی روایت کا پہلا یادگار منصوبہ تھا۔ کلیہ میں آٹھ مدرسے، ایک کتب خانہ، ایک اسپتال، ایک درویش سرائے، ایک کارواں سرائے، ایک بازار، ایک حمام، ایک مکتب اور ایک عوامی مطبخ شامل تھا۔ بعد کے ادوار میں اس کلیے میں مختلف مقبرے شامل کیے گئے۔ مسجد کو مختلف ادوار میں آنے والے زلزلوں سے ناقابل تلافی نقصان پہنچا، موجودہ مسجد مصطفیٰ سوم کے دور میں 1767 سے 1771 کے درمیان معمار محمد طاہر آغا کے ذریعہ تعمیر کی

گئی۔ پہلی فاتح مسجد میں 26 میٹر قطر کا ایک مرکزی گنبد اور قبلہ کی طرف اسی قطر کا ایک نیم گنبد بنایا گیا تھا، جب کہ موجودہ مسجد مستطیل شکل کی ایک عمارت ہے، جس کے دو بنیادی حصے ہیں؛ ایک مرکزی نماز گاہ اور دوسرا صحن۔ موجودہ مسجد میں بھی 26 میٹر قطر کا ایک مرکزی گنبد ہے، جس کے اطراف میں چار نیم گنبد بنائے گئے ہیں اور ان کے کونوں پر مزید چار چھوٹے گنبد موجود ہیں۔ فاتح مسجد کا موجودہ اندرونی حصہ خواجہ سنان کے ایجاد کردہ ڈیزائنوں کی ایک نقل ہے۔ مسجد میں دو بالکونیوں والے دو نوک دار مینار بنائے گئے ہیں، اندرونی تزئین کے لیے خطاطی اور مختلف قسم کے رنگوں کا استعمال کیا گیا ہے۔

شہزادے مسجد اور کلیہ: استنبول کی شہزادے مسجد اور کلیہ عثمانی فن تعمیر کے کلاسیکی عہد کا ایک اہم نمونہ ہے، جسے سلیمان القانونی نے اپنے بیٹے شہزادہ محمد کی یاد میں تعمیر کیا تھا۔ یہ کلیہ معمار سنان کے ابتدائی اور اہم ترین کاموں میں سے ایک شمار کیا جاتا ہے۔ شہزادہ محمد کا مقبرہ اس کلیے کی اولین عمارت تھی، جو 1544 میں مکمل ہوئی۔ مسجد اور دوسری عمارتیں 1545 سے 1548 کے درمیان تعمیر کی گئیں۔ مسجد مستطیل ہے، جو بنیادی طور پر دو حصوں صحن اور مرکزی عبادت گاہ پر مشتمل ہے۔ رقبے کے اعتبار سے دونوں حصے مساوی ہیں۔ مسجد کا صحن سنگ مرمر سے بنے ہوئے ستون دار محرابی اور گنبدوں والے دالان سے گھرا ہوا ہے۔ صحن کے وسط میں وضو کا چشمہ ہے، جسے سلطان مراد چہارم نے تعمیر کیا تھا۔ مسجد میں تین درجوں والے دو مینار استعمال کیے گئے ہیں، جن میں مقرنس کی سجاوٹ کے ساتھ دو بالکونیاں بنائی گئی ہیں اور ان میناروں کے نچلے حصے پر ہندسی اشکال سے تزئین کاری کی گئی ہے۔ میناروں پر آرائشی نقوش کا یہ کام اسی مسجد کے لیے خاص ہے، جسے بعد کی عثمانی مساجد میں شاذ و نادر ہی دہرایا گیا ہے۔ مسجد کا مرکزی ایوان مربع ہے، جسے ایک مرکزی گنبد سے ڈھکا گیا ہے۔ مرکزی گنبد چار نیم گنبدوں اور چاروں کونوں پر واقع مزید چار چھوٹے گنبدوں سے گھرا ہوا ہے۔ گنبد کا قطر 19 میٹر اور اونچائی 37 میٹر ہے۔ مسجد معمار سنان کی ابتدائی کاریگری اور اختراعات کا ایک بیش قیمتی نمونہ ہے، جس نے بعد کی تعمیرات پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ شہزادہ مسجد کے احاطے کی دیگر عمارتوں میں ایک مدرسہ، ایک مہمان خانہ، ایک کارواں سرائے، ایک عوامی مطبخ، ایک مکتب اور ایک قبرستان شامل ہے، جس میں متعدد مقبرے ہیں۔ سب سے قدیم اور بڑا مقبرہ شہزادہ محمد کا ہے۔ یہ ہشت پہلو مقبرہ محراب دار دالان، ابھرواں دھاری دار گنبد، کثیر الالوان پتھروں اور روغنی ٹائلوں کی آرائش کا ایک حسین مرقع ہے۔ مقبرے کے اندر محمد کی بیٹی ہماشاہ سلطان اور اس کے چھوٹے بھائی شہزادہ جہاں گیر کی قبریں ہیں۔ شہزادے مقبرہ کے جنوب میں رستم پاشا کا ہشت پہلو مقبرہ واقع ہے، جسے سنان نے ڈیزائن کیا تھا۔ یہ مقبرہ بھی روغنی اِزنِک ٹائلوں سے مزین ہے۔ کلیہ کے دروازہ کے پاس ابراہیم پاشا کا مقبرہ ہے، جسے معمار داکچی احمد چاؤوش نے ڈیزائن کیا تھا۔ یہ مقبرہ اپنے ڈیزائن اور ٹائلوں کی آرائش میں تقریباً شہزادے مقبرہ کے مساوی ہے۔

سلیمانیہ مسجد کلیہ: 1550 سے 1557 کے درمیان تعمیر ہونے والی استنبول کی سلیمانیہ مسجد عثمانی فن تعمیر کا شاہ کار اور معمار سنان کے تعمیری کارناموں کا اعلیٰ نمونہ ہے، جو ایک بڑے کلیے کا حصہ ہے۔ مستطیل مسجد استنبول کی سب سے بڑی عثمانی مسجد ہے، جس کے دو حصے ہیں: صحن اور مرکزی ایوان۔ مرکزی بیرونی دروازہ شمال مغربی جانب واقع ہے، جس کی تزئین کتبوں، مقرنس اور سنگ مرمر پر کندہ کاری کے ذریعہ کی گئی ہے۔ تقریباً 47 میٹر چوڑے اور 57 میٹر لمبے رقبے پر محیط صحن گنبد اور محراب دار مربع دالان سے گھرا ہوا ہے۔ دالان

کے ستون سنگ مر مر اور سنگ خارا سے بنے ہیں، جب کہ مقرنس نقش و نگار سے آراستہ سر ستون کلاسیکی عثمانی روایت کا آئینہ دار ہیں۔ دالان میں کھڑکیوں پر سجاوٹ کے لیے مستطیل شکل کی اِزنک ٹائلوں کا استعمال ہوا ہے۔ سلطنت عثمانیہ کی یہ پہلی عمارت تھی، جہاں اِزنک ٹائلوں پر شوخ سرخ رنگ شامل ہوئے۔ مسجد کے اندرونی دروازہ پر ایک پیچیدہ مقرنس کا سائبان ہے، جس پر خط ثلث میں حسن چلیبی کے تین مستطیل کتبے موجود ہیں۔ داخلی دروازہ اخروٹ، آبنوس اور زیتون کی تراشیدہ اور منقش لکڑیوں سے بنا ہے، جن پر ہاتھی دانت اور موتیوں کا جڑاؤ کام ہے۔ صحن کے چاروں کونوں پر چار مینار تعمیر کیے گئے ہیں۔ دو مینار تین بالکونیاں والے اور دو مینار دو بالکونیوں والے ہیں۔ بالکونیوں کو مقرنس کی آرائشی تختیوں اور پایوں کے ذریعے بنایا گیا ہے، جن پر ہندسی اشکال اور نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ مسجد کا اندرونی حصہ 58.5 میٹر لمبے اور 57.5 میٹر چوڑے رقبے پر محیط تقریباً مربع ہے، جس پر 26.5 میٹر قطر اور 53 میٹر اونچا ایک بڑا مرکزی گنبد تعمیر کیا گیا ہے۔ مرکزی گنبد کے ساتھ صرف دو نیم گنبد استعمال کیے گئے ہیں۔ مرکزی گنبد کے دونوں طرف تین متوسط اور دو چھوٹے گنبدوں کی ایک قطار بنائی گئی ہے۔ ان چھوٹے گنبدوں اور مرکزی گنبد کے درمیان متعدد کھڑکیوں سے بھرے ہوئے قوسی شکل کے جداری نمونے ہیں۔ مسجد کی اندرونی آرائش خط ثلث میں حسن چلیبی کی فنی مہارت کا آئینہ دار ہے۔ سنگ مر مر سے بنا ہوا محراب روایتی طرز کا ہے، جس میں مقرنس کا سائبان اور ایک کتبہ ہے۔ محراب کے دونوں جانب مستطیل اِزنک ٹائلوں کے سفید خاکے پر فیروزی، سرخ، سیاہ اور نیلے رنگ کے پھولوں کی تزئین کاری کے ساتھ مربع شکل میں سورہ فاتحہ کی خطاطی کی گئی ہے۔ مسجد میں آرائشی شیشوں کا وسیع استعمال محراب کے آس پاس کی کھڑکیوں پر کیا گیا ہے، جہاں ایک کھڑکی پر اللہ، محمدؐ اور خلفائے اربعہ کے ناموں کے علاوہ سورۃ النور کی آیت نمبر 35 کی خطاطی ہے۔ منبر روایتی طرز کا سنگ مر مر سے تعمیر کیا گیا ہے، جس کی تزئین کاری ہندسی اور محرابی اشکال سے کی گئی ہے۔

سلیمانیہ مسجد کو بھی بطور کلیہ ترتیب دیا گیا تھا، جس کے ملحقہ ڈھانچے مذہبی اور رفاہی ضرورتیں پوری کرتے تھے۔ کلیے میں چار مدرسے، ایک مکتب، ایک طبی اسکول، ایک اسپتال، ایک عوامی مطبخ، ایک کارواں سرائے، حمام اور دکانوں کی قطاریں تھیں۔ زیادہ تر عمارتیں مستطیل صحن پر مشتمل کلاسیکی عثمانی ڈھانچے ہیں، جن کے چاروں طرف محراب دار دالان تعمیر کیا گیا تھا۔ مسجد کی قبلہ والی دیوار کے پیچھے اس سے منسلک ایک قبرستان ہے، جس میں سلیمان اول اور ان کی ملکہ خرم / حریم سلطان کے مقبرے ہیں۔ 1566 میں سنگ مر مر سے تعمیر شدہ سلیمان القانونی کا مقبرہ سلطنت عثمانیہ کے بڑے عثمانی مقبروں میں سے ایک ہے، جو محراب دار دالان سے گھرا ہوا ہے، اس کے اوپر 14 میٹر قطر کا ایک گنبد تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ مقبرہ اِزنک ٹائلوں، شوخ رنگوں اور آیات قرآنی کی خطاطی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ خرم سلطان کا مقبرہ بھی گنبد دار ہے، جس کی تعمیر 1558 میں سنگ مر مر سے ہوئی۔ مقبرے کے اندرونی حصے کو اِزنک ٹائلوں، مقرنس اور شوخ رنگوں سے سجایا گیا ہے۔ دونوں مقبرے ہشت پہلو ہیں مگر ملکہ کے مقبرے کے مقابلے سلطان کا مقبرہ بڑا اور وسیع ہے۔

جامع سلیمیہ کلیہ: اَدَرنہ کی سلیمیہ مسجد سلطان سلیم دوم کے عہد میں خواجہ سنان کے ذریعہ 1568 سے 1575 کے درمیان تعمیر کی گئی۔ مسجد اسلامی فن تعمیر کا بالعموم اور عثمانی فن تعمیر کا بالخصوص ایک تعمیراتی شاہ کار ہے۔ اسے سنان کی تمام تعمیرات کا تاج تصور کیا جاتا ہے۔ مسجد مستطیل اور دو مساوی حصوں صحن اور مرکزی ایوان پر مشتمل ہے، ہر ایک کا طول تقریباً 60 میٹر اور عرض 44 میٹر ہے۔ نیم محراب دار

مرکزی بیرونی دروازہ غیر معمولی حد تک سادہ ہے۔ صحن، محراب و گنبد دار دالانوں سے گھرا ہوا ہے۔ جس کے اطراف کی بڑی اور نچلی کھڑکیوں کے اوپری حصے اِزنِک ٹائلوں پر بیل بوٹوں و شوخ رنگوں کے ساتھ سورۃ الفتح کی خطاطی اور محراب دار آرائش کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ صحن کے درمیان سنگ مرمر سے بنا ہوا وضو کا چشمہ ہے، جس میں گنبد یا سائبان کا استعمال نہیں ہے۔ مرکزی ایوان کے داخلی دروازہ پر مقرنس کی عمدہ سجاوٹ کی گئی ہے۔ مرکزی ایوان کے اوپر ایک بڑا گنبد تعمیر کیا گیا ہے، جس کی مثال اس سے پہلے کی دوسری بڑی گنبد والی مسجدوں میں نہیں ملتی۔ یہ ڈیزائن سنان کے اختراعات و تجربات کی معراج شمار کی جاتی ہے۔ مرکزی گنبد کو دیواروں کے مستطیل خول میں کٹے ہوئے آٹھ ستونوں پر کھڑا کیا گیا ہے۔ مرکزی ایوان کے کونوں پر چار چھوٹے نیم گنبد بنائے گئے ہیں۔ اس مرکزی نصف کرہ دار گنبد کا قطر 31.28 میٹر ہے، جو سطح زمین سے تقریباً 42 میٹر بلند ہے۔ جگہ اور روشنی کی فراہمی کے حوالے سے مسجد کے محراب کی تعمیر پر بھی خصوصی توجہ صرف کی گئی ہے۔ محراب کے دونوں طرف اِزنِک ٹائلوں کی تزئین کاری کی گئی ہے۔ محراب سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے اور اس عہد کی عثمانی سنگ تراشی کی عمدہ مثال ہے، جس میں مقرنس کا سائبان اور ایک کتبہ موجود ہے۔ مسجد کا منبر سنگ مرمر کے ذریعہ تعمیر شدہ منبروں کا اعلیٰ نمونہ ہے، جو اس وقت تک عثمانی فن تعمیر میں عام ہو چکے تھے۔ سنگ مرمر کی سطحوں کو محراب، ہندسی اشکال اور عربی طرز آرائش سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اندرونی حصے کی آرائش میں بنیادی طور پر سنگ مرمر، مصوری اور اِزنِک ٹائلوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ مرکزی ایوان کے چاروں کونوں پر تین بالکونیوں والے چار مینار ایستادہ ہیں، یہ عثمانی فن تعمیر کی تاریخ کے سب سے اونچے مینار شمار کیے جاتے ہیں، جن کی بلندی 70.89 میٹر ہے۔ مسجد ایک بیرونی دیوار کے اندر کلیے کے مرکز میں واقع ہے۔ اس کلیے میں دو مدرسے ہیں، دونوں مدرسے ایک اندرونی مربع صحن پر مشتمل ہیں، جس کے چاروں طرف دالان ہیں۔ دو اطراف سے چھوٹے گنبد والے کمروں کی قطاریں ہیں، اور ایک طرف بڑے گنبد کے ساتھ درس گاہیں۔ کلیے میں ایک مکتب اور ایک مسقف بازار بھی شامل ہے۔ مکتب کی عمارت ایک گنبد والے ہال پر مشتمل ہے، جس کے جنوب مغرب کی طرف ایک کھلا دالان ہے۔

سلطان احمد مسجد کلیہ: استنبول کی سلطان احمد مسجد، جو نیلی مسجد کے نام سے مشہور ہے، 1609 سے 1617 کے درمیان تعمیر کی گئی۔ یہ مسجد اور کلیہ عثمانی فن تعمیر کی سب سے مشہور اور اہم تعمیری یادگاروں میں سے ایک ہے۔ اسے کلاسیکی دور کی آخری مسجد بھی کہا جاتا ہے۔ مستطیل شکل کی یہ مسجد دو حصوں مرکزی عبادت گاہ اور صحن پر مشتمل ہے۔ مسجد کی مرکزی عبادت گاہ 64 میٹر چوڑے اور 72 میٹر لمبے رقبے پر محیط ہے، جس کے اوپر ایک مرکزی گنبد تعمیر کیا گیا ہے، جس کا قطر 23.5 میٹر ہے۔ مرکزی گنبد چار نیم گنبدوں اور متعدد چھوٹے گنبدوں سے گھرا ہوا ہے۔ صحن میں داخلے کے تین دروازے ہیں۔ مرکزی بیرونی دروازہ شمال مغرب کی جانب واقع ہے اور دو دوسرے بغلی دروازے بھی ہیں۔ فنی اعتبار سے مسجد کا مرکزی داخلی دروازہ بہت شان دار ہے، جس کے اوپر ایک چھوٹا گنبد بنایا گیا ہے۔ اس دروازہ پر مقرنس کے ذریعہ آرائشی نقوش بنے ہیں اور دروازہ کی پیشانی پر دو کتبے لگے ہیں۔ اسی طرح صحن سے مرکزی عبادت گاہ میں داخل ہونے کے لیے بھی مقرنس اور کتبوں سے مزین ایک شان دار دروازہ موجود ہے۔ مرکزی عبادت گاہ میں مسجد کے باہر سے داخل ہونے کے لیے دو بغلی دروازے بنائے گئے ہیں۔ مسجد کا صحن اندر سے ایک ستون دار تعمیری نمونہ ہے، جس کے چاروں طرف محراب اور گنبد دار دالان

ہیں۔ صحن کے وسط میں محراب اور گنبد دار ہشت پہلو کوشک میں وضو کا چشمہ موجود ہے۔ نیلی مسجد ترکی کی ان پانچ مساجد میں سے ایک ہے، جس کے چھ مینار ہیں اور یہ سبھی مخروطی شکل کے ہیں۔ مرکزی عبادت گاہ کے چاروں کونوں پر واقع میناروں میں تین بالکونیاں ہیں، جب کہ صحن کے بیرونی کونوں والے مینار دو بالکونیوں والے ہیں۔ ہر بالکونی کو مقرنس کے ذریعہ مزین اور مضبوط بنایا گیا ہے۔ مسجد کا اندرونی حصہ مرکزی گنبد اور آبشار نما نیم گنبدوں سے مزین ہے۔ فرش سے مرکزی گنبد کی اونچائی 43 میٹر ہے۔ گنبد چار بڑے بیلن نما ستونوں پر کھڑا ہے۔ مرکزی محراب باریک تراشے ہوئے سنگ مرمر سے بنا ہے، جس میں مقرنس کے ذریعہ طاق اور نقش و نگار بنائے گئے ہیں، محراب کے اوپری حصے میں قرآنی آیتوں کے دو کتبے آویزاں ہیں۔ محراب کے دائیں جانب سنگ مرمر سے بنا ہوا مسجد کا شان دار منبر موجود ہے، جس کی چوٹی کو سونے کی مخروطی ٹوپی سے ڈھکا گیا ہے۔ مسجد کی آرائش کے لیے اِزنِک ٹائلوں کا وافر استعمال کیا گیا ہے، جن میں مختلف قسم کے مشجر اور نباتی آرائشی نقوش متنوع رنگوں جیسے نیلے، سبز، سرخ، سیاہ اور فیروزی میں کندہ کیے گئے ہیں۔ مسجد کے علاوہ دوسری تعمیرات میں یہاں پر سلطان احمد اول کا مقبرہ، ایک مدرسہ، ایک مکتب، ایک اسپتال، ایک عوامی مطبخ، ایک حمام اور ایک بازار موجود ہیں، جو اسے کلیے کی شکل عطا کرتے ہیں۔ احمد اول کے مقبرے کی تعمیر 1619 میں عثمان دوم کے عہد میں ہوئی۔ دوسرے عثمانی مقبروں کے برعکس، جو عام طور پر ہشت پہلو ہوتی تھیں، یہ مقبرہ مربع ہے، جس پر ایک گنبد تعمیر کیا گیا ہے، گنبد کا قطر 15 میٹر ہے۔ مقبرہ میں سلطان احمد اول اور ان کے خاندان کے کچھ لوگوں کی قبریں ہیں، جن میں ان کی اہلیہ کوسم سلطان اور تین بیٹوں، سلطان عثمان دوم، سلطان مراد چھارم اور شہزادہ بایزید شامل ہیں۔

7.3.2 محل اور حمام

عثمانی سلاطین کے محل بھی تعمیراتی اور فنی خصوصیات کا اہم نمونہ شمار کیے جاتے ہیں۔ یہ نہ صرف حکومت کے مراکز ہوتے، جہاں سلطنت کے تمام انتظامی امور انجام دیے جاتے بلکہ سلطان کی رہائش گاہ بھی تھے، جہاں وہ اپنے خاندان، قریبی رشتہ داروں، خدمت گاروں اور محافظوں کے ساتھ رہتا تھا۔ عثمانی تاریخ میں سلطان کے محل کی دو قسمیں تھیں: پہلا حکومت کا مستقل مرکز، دوسرا آرام کرنے کی جگہ۔ 14 ویں اور 15 ویں صدی میں عثمانی دارالحکومت ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل ہوا، جس کی وجہ سے اس عہد میں ہر نئے دارلسلطنت میں نیا محل تعمیر ہوا، مگر 16 ویں صدی سے 19 ویں صدی کے وسط تک توپ کاپی محل مرکزی محل رہا۔

تعمیراتی خصوصیات اور اہمیت کے اعتبار سے بُرصَہ کا محل عثمانی تاریخ کا پہلا شاہی محل قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کی تعمیر سے پہلے بطور محل ذکر کردہ رہائش گاہیں شاید صرف بڑے گھر تھے۔ بُرصَہ محل 1326 کے بعد شہر کے اندرون میں تعمیر کیا گیا اور 1360 کی دہائی یعنی عثمانی دارالحکومت اَدَرنہ منتقل ہونے تک بطور محل استعمال میں رہا۔ 1360 کی دہائی میں سلطان مراد اول نے دارالحکومت کو بُرصَہ سے اَدَرنہ منتقل کیا اور اَدَرنہ میں اس مقام کے پاس ایک محل تعمیر کیا، جہاں 16 ویں صدی میں سلیمیہ مسجد تعمیر کی گئی۔ مراد دوم کے آخری سالوں کے دوران مُنجاندی کے قریب ایک نیا محل تعمیر کیا گیا۔ 1457 کے بعد سلطان محمد دوم نے اس محل کی توسیع کی۔ 1453 میں قسطنطنیہ کی فتح کے بعد محمد دوم نے اس شہر کا پہلا عثمانی محل تعمیر کیا، جو اب قدیم محل کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اونچی دیوار سے گھرا ہوا یہ محل شہر کے وسط میں

واقع تھا، جو بالکل سادہ مگر کشادہ تھا اور اس میں ایک روایتی عثمانی محل کی تمام خصوصیات موجود تھیں۔ یہ محل صرف کچھ ہی عرصہ تک استعمال میں رہا۔ استنبول میں سلطان محمد دوم کے حکم سے 1459 میں ایک نئے محل کی تعمیر کی ابتدا ہوئی، جو 7,00,000 مربع میٹر رقبے پر تعمیر ہوا۔ تاریخ میں اسے 'توپ کاپی' محل کے نام سے جانا جاتا ہے، مگر اس محل کا اصل نام 'جدید محل' تھا۔ یہ محل جلد ہی عثمانی تاریخ کا سب سے اہم محل بن گیا۔ محل کے مرکزی حصوں کی تعمیر بشمول بیرونی فصیل اور باب ہمایوں، چار پانچ سالوں میں مکمل ہوئی، اگلی چار صدیوں میں دوسرے عثمانی سلاطین نے محل اور اس کے رقبے میں قابل قدر اضافے کیے، جن میں مختلف قسم کے ایوان، کوشک اور دیگر عمارتیں شامل ہیں۔ سمندر کے کنارے تک پھیلے ہوئے شاہی باغات مختلف قسم کے پھول دار پودوں سے مرصع تھے، جو راحت و سکون اور چہل قدمی کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ 17 ویں صدی کے بعد توپ کاپی کی اہمیت میں بتدریج کمی واقع ہوئی اور اس عہد کے عثمانی سلاطین نے باسفورس کے کنارے تعمیر ہونے والے دوسرے محلوں میں رہائش کو ترجیح دی۔ توپ کاپی کے علاوہ سلطنت عثمانیہ کے دوسرے اہم محلوں میں دولماَبہچے اور یَلدِز محل کو شمار کیا جاتا ہے۔

17 ویں اور 19 ویں صدی کے درمیان عثمانی سلاطین نے بحیرہ مرمرہ کی جانب باسفورس کے ساحل پر کوشک کے نام سے متعدد حویلیاں اور عمارتیں تعمیر کی تھیں۔ عثمانی تعمیراتی تاریخ میں یہ جدید حویلیاں ساحلی محلوں کے نام سے مشہور ہوئیں۔ ان عمارتوں کی بیشتر تعداد سلطان محمود دوم کی پسندیدگی کا نتیجہ شمار کی جاتی ہے، جس نے عثمانی انتظامی اداروں اور فن تعمیر میں بڑے پیمانے پر یورپی نمونوں کو متعارف کرایا۔ بعد کے عہد میں یہ تفریحی مقامات دولماَبہچے محل کا جائے وقوع بن گئے، جب سلطان محمود دوم کے جانشین سلطان عبدالمجید اول نے ان ساحلی حویلیوں کے کچھ حصوں کو مسمار کر کے ان کی جگہ ایک جدید شاہی محل کی تعمیر کا فرمان جاری کیا۔ پتھروں سے تعمیر شدہ سلطنت عثمانیہ کی یہ پہلی جدید اور مغربی طرز کی شاہی رہائش گاہ تھی۔ یلدز محل سلطنت عثمانیہ کا آخری شاہی محل شمار کیا جاتا ہے، جس کی تعمیر 1880 میں ہوئی۔ یہ محل سلطان عبدالحمید ثانی کے استعمال میں رہا۔ یلدز محل مختلف عمارتوں پر مشتمل ایک کلیہ ہے، جو پہاڑیوں اور وادیوں کے درمیان ایک بڑے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس محل کو اواخر عثمانی فن تعمیر کا ایک بہترین نمونہ شمار کیا جاتا ہے۔ ان شاہی محلوں کے علاوہ بھی سلطنت عثمانیہ میں شہزادے و شہزادیوں کی رہائش کے لیے بڑے پیمانے پر محل اور قصر تعمیر کیے گئے، ساتھ ہی امراء اور رؤساء نے بھی اپنے قیام کے لیے سلطنت کے مختلف حصوں میں محل اور رہائش گاہیں تعمیر کیں، جو نہ صرف اس عہد کی فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ شمار کی جاتی ہیں بلکہ عثمانی تہذیب و ثقافت کی ترقی اور مردوزن کے تعلقات کو سمجھنے کا ایک اہم ذریعہ بھی ہیں۔

عہد وسطی کے تاریخی مآخذ مسلم شہروں کے بنیادی وسائل میں عوامی حمام کا تذکرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حمام شہری ثقافت اور اس کے بنیادی ڈھانچے کا ایک اہم جزء ہوتے تھے۔ مذہبی اور تمدنی ضرورتوں کے پیش نظر ما قبل عہد جدید میں مسلم سیاحوں اور تاجروں کے ذریعہ کسی بھی شہر کو سفر کے لیے اس وقت تک مناسب تصور نہیں کیا جاتا تھا، جب تک کہ اس میں مسجد، بازار اور حمام کی سہولت نہ ہو۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ عہد وسطی میں مسلم حکومتوں نے عوامی ضرورتوں کے پیش نظر تمام شہروں میں حمام اور اس جیسی تمام دوسری سہولیات کا نظم کیا۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اناطولیہ میں ترکوں کی آمد سے پہلے ہی یہاں کے بازنطینی شہروں میں رومی حمام کی ثقافت موجود

تھی۔ اناطولیہ میں موجود عوامی حمام کی اس ثقافت، فن تعمیر اور تکنیک کو عثمانی ترکوں نے اسلام کی نظافت اور طہارت و پاکیزگی کی تعلیمات سے منسلک و مربوط کر کے اسے مزید پائیداری عطا کی۔ اس کے نتیجے میں غسل کے لیے نئی روایت کے قیام کے ساتھ ساتھ نئی عمارتیں بھی تعمیر ہوئیں، جنہیں 'ترک یا عثمانی حمام' کا نام دیا گیا۔ سلطنت عثمانیہ کے ان حماموں کو عام طور پر ان کے استعمال کے اعتبار سے دو طبقوں یعنی ذاتی اور عوامی میں منقسم کیا جاتا ہے۔ عثمانی سلطنت میں عام طور پر عوامی حمام حالات اور ضرورت کے پیش نظر ایک مقام پر ایک اور کبھی دو ایک ساتھ تعمیر کیے جاتے۔ ایک مقام پر ایک ہی عوامی حمام کی موجودگی کی صورت میں مرد اور خواتین کے لیے مختلف دن اور اوقات مختص ہوتے۔ مردوں اور عورتوں کے لیے ایک ہی مقام پر علاحدہ حمام بھی تعمیر کیے گئے تھے، جن کا انتظام جدا ہوتا، مگر ان میں یکساں سہولیات بہم پہنچائی جاتیں اور ان دونوں کے داخلی دروازے اور راستے مختلف ہوتے۔ عام طور پر مردوں کے حمام کا داخلی دروازہ مرکزی راستے سے ہوتا، جب کہ خواتین کے حمام کا داخلی دروازہ پردے کو ملحوظ رکھتے ہوئے بغلی گلی سے ہوتا۔ اس کے علاوہ کچھ حمام، جنہیں اناطولیہ میں جیوتھرمل حمام کہا جاتا تھا، گرم پانی کے ذرائع پر قائم کیے گئے تھے۔ ایسے حمام عام طور پر عمومی غسل کے بجائے علاج کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ سلطنت عثمانیہ کے شہروں میں تقریباً ہر محلے میں ایک حمام ہوتا۔ یہ عوامی حمام صرف غسل خانے نہیں تھے بلکہ یہاں پر عوام الناس کو بھاپ، ٹھنڈے و گرم پانی اور مالش کے امتزاج سے جسمانی راحت و آرام کے ساتھ ذہنی و روحانی سکون حاصل ہوتا تھا۔ اس طرح یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان حماموں نے سلطنت کی رعایا کو نہ صرف جسمانی اور ظاہری صفائی و ستھرائی کا موقع فراہم کیا بلکہ روحانی و قلبی راحت و آرام کے ساتھ اجتماعی تفریح کے لیے ایک مناسب عوامی جگہ بھی فراہم کی۔ عثمانی حمام مستطیل اور تین حصوں پر مشتمل ہوتے۔ (1) کپڑے تبدیل کرنے کا کمرہ، (2) غسل کا کمرہ اور (3) اشیائے غسل (ٹھنڈے و گرم پانی اور ایندھن) کا کمرہ۔ حمام میں کپڑا تبدیل کرنے والے حصے سے پہلے داخلی دروازے اور استقبالیہ کے لیے ایک علاحدہ حصہ ہوتا، جس کا مقصد انسانی جسم کو حمام کے اندرونی درجہ حرارت کے مطابق ڈھالنا اور پردے کا انتظام تھا۔ تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ سلطنت عثمانیہ میں صرف استنبول کی سڑکوں اور گلیوں میں 230 حمام پائے جاتے تھے اور تقریباً یہی تناسب سلطنت کے دوسرے شہروں میں بھی تھا۔ ان حماموں کے روایتی سنگ مرمر کے فرش اور ازنِک ٹائلوں پر خوبصورت خطاطی کے نمونوں سے مزین اندرونی حصے زائرین کو ایک منفرد ماحول فراہم کرتے تھے۔ سلطنت عثمانیہ کے یہ حمام اپنی تعمیراتی اور فنی خصوصیات کے اعتبار سے عثمانی فن تعمیر کا اہم حصہ رہے ہیں۔ ان میں سے متعدد اب بھی موجود ہیں، جن میں خرم سلطان حمام، قلیچ علی پاشا حمام، چمبرلی تاش حمام اور زیرک چینی لی حمام کو شمار کیا جاسکتا ہے۔ استنبول اور سلطنت عثمانیہ کے مختلف شہروں میں پائے جانے والے ان عوامی حماموں کو آج بھی عثمانی ثقافتی روایت کا عظیم مظہر شمار کیا جاتا ہے۔

7.3.3 بازار اور کارواں سرائے

عثمانی قصبوں میں تجارتی اور صنعتی سرگرمیوں کا انتظام بازاروں کے ارد گرد ہوتا ہے۔ سلطنت عثمانیہ میں مختلف قسم کے بازاروں اور ان کی مستقل عمارتوں کا ذکر ملتا ہے۔ بازار کے طور پر استعمال ہونے والی یہ عمارتیں بھی فن تعمیر کا اہم نمونہ شمار ہوتی ہیں۔ عثمانی عہد میں بازاروں کے لیے عام طور پر مختلف ناموں 'اراستہ، بازار' اور 'بیدستین' کا ذکر ملتا ہے۔ عثمانی تعمیرات میں 'اراستہ' اوپر سے کھلا یا ڈھکا ہوا ایک

ایسا تعمیراتی ڈھانچہ تھا، جہاں کبھی ساتھ ساتھ، کبھی مخالف سمت میں ایک متعینہ خط پر دکانوں کا ایک سلسلہ واقع ہوتا۔ سلطنت عثمانیہ کے بازار خرید و فروخت کے لیے ایسے موزوں مقام ہوتے، جن کے ڈھانچے اوپر سے کھلے یا ڈھکے ہوتے اور دونوں جانب دکانوں سے گھرے ہوتے تھے۔ تاہم، ایک بازار کو ایسے علاقے کے طور پر بھی بیان کیا جاتا ہے، جس کے درمیان میں ایک بید ستین (مسقف بازار) ہو اور چاروں طرف سے مختلف تاجروں کی دکانوں، کارخانوں، سرائے، حمام، مطبخ، مسجد اور ہسپتال سے گھرا ہوا ہو۔ اس طرح عثمانی بازار کو ایک ایسا تجارتی مرکز قرار دیا جاسکتا ہے، جو عوامی اور کاروباری شعبوں پر محیط تھا، جہاں شہر اور اس کے اطراف میں رہنے والے لوگ اپنی سماجی اور معاشی ضرورتیں پوری کرتے تھے۔ اگر قصبہ بڑا اور خوش حال ہوتا، تو اس کا تجارتی مرکز ایک بید ستین، ایک ملحقہ بازار کی عمارت، جس میں ایک بڑا گنبد یا قبہ نما بڑا ایوان اور بیرونی دکانوں پر مشتمل ہوتا، جو قیمتی اشیاء جیسے ریشم، زیورات اور مہنگے دست کاری والے سامانوں کی ذخیرہ اندوزی اور فروخت کے لیے استعمال ہوتا۔ بید ستین کی تعمیر پتھر کی موٹی دیواروں سے کی جاتی تا کہ ان میں رکھی ہوئی اشیاء کو چوری اور آگ سے بچایا جاسکے۔ صرف بڑے شہروں، جیسے استنبول میں ایک سے زیادہ بید ستین موجود تھے۔

کارواں سرائے کو بھی عثمانی فن تعمیر کا اہم تعمیراتی نمونہ شمار کیا جاتا ہے۔ مختلف شہروں کے درمیان شاہراہوں کے کنارے واقع یہ وقف عمارتیں تھیں، جو مسافروں کو مفت خدمات فراہم کرتیں۔ کارواں سرائے ایک صحن کے اطراف میں متعدد ایوانوں، کمروں اور عمارتی اکائیوں کا مجموعہ ہوتا، جو ایک مسافر کو درکار تمام سہولیات بہم پہنچاتا۔ ان میں عام طور پر ایک مسجد، مسقف بازار، اصطبل، گودام، آرام گاہ اور حمام ہوتے، جو مسافروں کو مذہبی فرائض ادا کرنے، سامان کا تبادلہ کرنے اور تازہ دم ہونے کا موقع فراہم کرتے۔ فاتح کلیہ میں واقع کارواں سرائے مستطیل تھا، جس میں مسافروں کے لیے سو کمرے موجود تھے۔ اسی طرح کوبان مصطفی پاشا کلیہ میں واقع کارواں سرائے بھی تعمیراتی اجزاء اور خصوصیات کے اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے، جو ایک گنبد والے داخلی دروازے، صحن، مرکزی ایوان، گودام اور اصطبل پر مشتمل تھا۔ شہری علاقوں میں واقع کاروان سرائے، جنہیں 'خان' بھی کہا جاتا تھا، ایک اعتبار سے تجارتی عمارتیں تھیں۔ جہاں تاجروں کے دفتر، دکانیں اور اشیاء کی ذخیرہ اندوزی ہوتی تھی۔ ان عمارتوں کو کرائے پر دے دیا جاتا تھا اور ان کی آمدنی اوقاف کو چلانے کے لیے استعمال ہوتی۔ ان عمارتوں کے نام ان میں فروخت ہونے والی اشیاء کے مطابق رکھے جاتے، جیسے: بُرصَہ میں واقع اِپیک خان، کوزہ خان، فِدان خان اور پِرِنج خان۔ 'خان' عام طور پر دو منزلہ عمارتیں تھیں، جن کے اردگرد ایک یا ایک سے زائد کشادہ صحن ہوتے تھے۔ اَدِرنہ میں رستم پاشا کارواں سرائے 16 ویں صدی کے کارواں سرائے کی ایک عمدہ مثال ہے، جس میں دو صحن تھے۔

7.4 عثمانی فن تعمیر کی اہم خصوصیات

عثمانی عہد اپنی تعمیراتی خصوصیات کے اعتبار سے اسلامی فن تعمیر کا بہت ہی اہم اور شان دار دور شمار کیا جاتا ہے، جہاں نہ صرف مختلف فن تعمیر کے عناصر اور اجزاء کو ایک خاص قالب عطا کر کے ایک نئے تعمیری نمونے کی داغ بیل ڈالی گئی، جسے تاریخ میں عثمانی فن تعمیر کے نام سے جانا جاتا ہے بلکہ اس عہد نے اپنے تعمیری کارناموں کے ذریعہ اسلامی فن تعمیر میں قابل قدر اضافے بھی کیے اور اسلامی فن تعمیر میں تنوع، جدت اور ندرت کی بہت سی ایسی اعلیٰ مثالیں قائم کیں، جو صرف انہی کے تعمیراتی نمونوں کا خاصہ شمار کی جاتی ہیں۔

فن تعمیر میں ان کی سب سے اہم ندرت مسجدوں کو عوامی بنانا قرار دیا جاسکتا ہے، جس کے تحت انہوں نے مسجدوں کو ایک مذہبی اور رفاہی کلیے کی شکل عطا کی اور مسجدوں کے ساتھ ایک ہی احاطے میں مدرسے، اسپتال، کتب خانے، کارواں سرائے، عوامی مطبخ، حمام اور بازار تعمیر کیے۔ اسی طرح مسجدوں کے منصوبے میں بھی انہوں نے جدت و ندرت پیدا کی۔ انہوں نے مسجد کی وسعت و آفاقیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس میں مرکزیت اور مکانی وحدت کا عنصر پروان چڑھایا، جس کے تحت انہوں نے اپنی مسجدوں کی تعمیر اس انداز میں کی کہ ہر نمازی محراب اور منبر یعنی امام کو دیکھ سکے۔ اس طرز تعمیر کا شاہ کار اَدرنہ کی جامع سلیمیہ کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ عثمانی فن تعمیر میں گنبدوں کی تعمیر اور اس کے طرز استعمال کو بھی ان کا ایک تعمیری خاصہ شمار کیا جاتا ہے، جس میں ایک بڑے مرکزی گنبد کے اطراف میں نیم گنبدوں اور متعدد چھوٹے گنبدوں کو اس طرح ترتیب دیا جاتا تھا کہ وہ گنبدوں کا ایک آبشار معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح مسجدوں میں لمبے اور مخروطی یا نوک دار میناروں کا استعمال اور ان کا تعدد بھی عثمانی فن تعمیر کی ایک نمایاں خصوصیت رہی ہے، جس قسم کے مینار سلطنت عثمانیہ میں استعمال کیے گئے ہیں، اس کی مثال مسلم تاریخ میں دوسری جگہوں پر نہیں ملتی۔ اسی طرح قوسی مثلث کو بھی عثمانی فن تعمیر کی ایک اہم خصوصیت شمار کیا جاتا ہے۔ عثمانی فن تعمیر کے ابتدائی ادوار میں عمارتوں کے مربع ایوان پر گنبد کی تعمیر اور اسے سہارا دینے کے لیے محرابوں کے اتصال سے گچ کاری کے ذریعہ یہ قوسی مثلث بنائے جاتے تھے۔ یہ گنبد کی گول بنیاد اور عمارت کے مربع ایوان کے درمیان مثلث شکل کا ایک مربوط عبوری مجموعہ ہوتا تھا، جسے تعمیراتی تاریخ میں 'ترکی مثلث' کا نام دیا جاتا ہے۔ اِزنِک اور بُرصَہ کی سبز مسجدیں اس کی عمدہ مثال ہیں۔

7.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- فن تعمیر کی ترقی کے اعتبار سے سلطنت عثمانیہ اسلامی تاریخ کا ایک بہت ہی اہم اور شان دار عہد شمار کیا جاتا ہے۔ اس عہد میں تعمیر ہونے والی عمارتیں اپنی منصوبہ سازی اور فنی و عمارتی تفصیلات کے اعتبار سے بہت ہی پختہ اور ترقی یافتہ تھیں۔ اسی لیے ان کے اثرات دیرپا ثابت ہوئے اور یہ عمارتیں آج بھی اپنے دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈالنے کا ذریعہ بنتی ہیں۔
- عثمانی فن تعمیر کے بنیادی اجزاء ایران، وسط ایشیاء، بازنطینی سلطنت، عرب اور افریقہ سے اخذ کیے گئے تھے۔ عثمانی ماہرین نے مفتوحہ علاقوں کے مختلف تعمیراتی و آرائشی نمونوں، اجزاء اور تراکیب و خصوصیات سے ایک ایسا مرکب بنایا، جو بعد میں عثمانی فن تعمیر کے نام سے جانا گیا۔ مختلف تعمیری روایات سے ماخوذ اجزاء کے اس مرکب کو عثمانی سلاطین اور ماہرین نے نہ صرف وسعت دی بلکہ اپنی فکری، فنی، اختراعی اور خلاقانہ صلاحیتوں کے مطابق اس میں قابل قدر اضافے بھی کیے۔ سلطنت عثمانیہ کے حکمرانوں نے فن تعمیر کے فروغ میں بڑے پیمانے پر دلچسپی دکھائی، اسی کا نتیجہ ہے کہ سلطنت کے مختلف علاقوں میں اس

عہد کے تعمیراتی نمونے آج بھی پائے جاتے ہیں، جن میں بُرصَہ، اَدَرنہ اور استنبول کو اہم تعمیراتی مراکز کے طور پر شمار کیا جاتا ہے۔

- 16ویں اور 17ویں صدی عیسوی کو عثمانی فن تعمیر کا عہد ذریں شمار کیا جاتا ہے۔ اس عہد میں عثمانی سلاطین کو معمار سنان اور ان کے شاگردوں کی خدمات حاصل ہوئیں۔ عثمانی ماہرین تعمیرات نے عوامی سہولیات کو مدنظر رکھتے ہوئے مسجد کو مرکز بنا کر بڑے پیمانے پر مذہبی اور رفاہی کلیے تعمیر کیے، جنہیں اسلامی فن تعمیر کا ایک اختراع شمار کیا جاتا ہے۔

7.6 کلیدی الفاظ

فن تعمیر : عمارتیں بنانے کا فن

معمار : عمارتیں بنانے والے

کلیہ : کمپلیکس، مختلف عمارتوں کا مجموعہ

7.7 نمونہ امتحانی سوالات

7.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. عثمانی فن تعمیر کا پہلا مرکز کون سا شہر شمار کیا جاتا ہے؟

(a). بُرصَہ (b). اِزنِک (c). اَدَرنہ (d). استنبول

2. مراد اول کا تعمیر کردہ خداوندگار کلیہ کہاں واقع ہے؟

(a). اِزنِک (b). استنبول (c). اَدَرنہ (d). بُرصَہ

3. عثمانی فن تعمیر میں محراب دار دالان سے گھرے ہوئے صحن کا استعمال سب سے پہلے کس مسجد میں کیا گیا؟

(a). اُچ شرفلی مسجد (b). سلیمانیہ مسجد (c). سلیمیہ مسجد (d). نیلی مسجد

4. عثمانی فن تعمیر کے کلاسیکی عہد کا سب سے اہم نمائندہ کسے تصور کیا جاتا ہے؟

(a). کمال الدین بے (b). محمد وِداد (c). خواجہ سنان (d). صدف کار محمد

5. استنبول میں بَروق طرز میں تعمیر کی گئی پہلی مسجد کون سی ہے؟

(a). ینی جامع (b). جامع فاتح (c). جامع نور عثمان (d). جامع ابوایوب

6. اِزنِک کی حاجی اُزبِک مسجد کب تعمیر کی گئی؟

(a).1333 (b).1385 (c).1399 (d).1442

7. ایاصوفیہ میں میناروں کا اضافہ کس سلطان کے عہد میں ہوا؟

(a). سلیم اول (b). سلیمان القانونی (c). مراد دوم (d). محمد دوم

8. شہزادے مسجد کلیہ کا معمار کون تھا؟

(a). معمار کمال الدین (b). معمار سنان (c). معمار حسن (d). معمار وِداد ٹیک

9. استنبول کی نیلی مسجد کس عہد میں تعمیر کی گئی؟

(a). محمد دوم (b). سلیم اول (c). سلیمان اول (d). احمد اول

10. عثمانی فن تعمیر کا شاہ کار جامع سلیمیہ کہاں واقع ہے؟

(a). بُرصَہ (b). استنبول (c). اَدَرنہ (d). انقرہ

7.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. سلطنت عثمانیہ میں فن تعمیر کی ترقی میں معمار سنان کے کارناموں کو بیان کیجیے۔
2. محلوں کی تعمیر کے حوالے سے عثمانی فن تعمیر کی ترقیات کی وضاحت کیجیے۔
3. عثمانی فن تعمیر میں بُرصَہ طرز کی مسجدوں کی فنی خصوصیات کا جائزہ لیجیے۔
4. 'حمام عثمانی فن تعمیر کی ترقی کا ایک اہم عنصر شمار کیے جاتے ہیں۔' وضاحت کیجیے۔
5. عثمانی فن تعمیر میں بازار اور کارواں سرائے کی تعمیراتی تاریخ کا جائزہ پیش کیجیے۔

7.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. سلطنت عثمانیہ میں فن تعمیر کی ابتدائی ترقیات پر نوٹ لکھیے۔
2. ”مسجدیں اور عوامی کلیے سلطنت عثمانیہ کی تعمیری روایات کا حقیقی آئینہ دار ہیں“۔ وضاحت کیجیے۔
3. سلطنت عثمانیہ میں فن تعمیر کی ترقی میں کلاسیکی عہد کی عمارتوں کا جائزہ پیش کیجیے۔

7.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد 15 (متعلقہ مضامین)، دانش گاہ پنجاب، لاہور، طبع اول، 1964
2. Goodwin, Godfrey: *A History of Ottoman Architecture,* Thames & Hudson, London, 1971
3. Freely, John: *A history of Ottoman Architecture,* WIT Press, Southampton, Boston, 1935
4. Kuran, Aptullah: *Sinan - The Grand Old Master of Ottoman Architecture,* Institute of Turkish Studies, Washington DC & Ada Press, Istanbul, 1987
5. Necipoğlu, Gülru: *The Age of Sinan - Architectural Culture in the Ottoman Empire, Reaktion Books Ltd.*, London, 2005

اکائی 8: عثمانی حکومت کا زوال

اکائی کے اجزا:

8.0 تمہید

8.1 مقاصد

8.2 عثمانی حکومت کا زوال

8.3 عثمانی حکومت کے زوال کے اسباب

8.3.1 سلطان کی مجلس دیوان سے علیحدگی

8.3.2 اعلیٰ عہدوں پر تقرری کے اصول میں تبدیلی

8.3.3 رشوت ستانی کی گرم بازاری

8.3.4 وزراءوامراء کی شاہانہ زندگی

8.3.5 امور حکومت میں حرم کی دخل اندازی

8.3.6 عثمانی شہزادوں کی محل تک تحدید

8.3.7 ولی عہدی کا طریقہ

8.3.8 اجنبی عورتوں سے شادی

8.3.9 فوج کی سرکشی

8.3.10 امراءاور وزراء کی مفاد پرستی

8.4 عثمانی حکومت کے زوال کو روکنے کی کوششیں

8.5 سلطان سلیم ثالث کی کاوشیں

8.6 سلطان محمود ثانی کی کاوشیں

8.7 دستور ثانی1856ء

8.8 بیرونی مداخلت
8.9 اکتسابی نتائج
8.10 نمونہ امتحانی سوالات
8.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
8.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
8.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
8.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

8.0 تمہید

اس سے پہلے کی اکائیوں میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ عثمانی ترک غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ خانہ بدوشی کی اعلی خصوصیات ان میں شہری زندگی اختیار کرنے کے بعد بھی ایک طویل عرصے تک باقی اور قائم رہیں۔ اسلامی تعلیمات نے ان خصوصیات کو مزید صیقل کر کے انہیں اعلیٰ اخلاق و کردار کا حامل بنا دیا تھا۔ ایک وسیع اور مستحکم حکومت قائم کرنے کے باوجود عثمانی حکمراں ایک طویل زمانے تک ان برائیوں اور خرابیوں سے دور رہے جو بالعموم بہت جلد دوسری اقوام کے حکمرانوں میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ عثمانی حکومت کا یہ کردار خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ زوال کا آغاز ہو جانے کے بعد بھی انہوں نے نہ صرف یہ کہ بہت دنوں تک اپنے اقتدار کو بچائے رکھا بلکہ وقفے وقفے سے ان میں کئی ایسے اولوالعزم حکمراں بھی پیدا ہوئے جنھوں نے زوال پر بند باندھنے کی کوشش کی، یہ الگ بات ہے کہ اپنی اس کوشش میں وہ پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکے۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ وہ زوال کی رفتار کو سست کرنے میں کامیاب رہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دوسری اقوام جو زوال کے آغاز کے بعد پچاس، سو سال کے اندر ہی اپنے خاتمے کو پہنچ گئیں، عثمانی زوال کے آغاز کے بعد بھی تین سو سال تک اپنی حکومت کا کامیاب دفاع کرتے رہے۔

8.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد آپ کو عثمانی حکومت کے زوال کے بارے میں معلومات فراہم کرنا ہے کہ وہ کون سے حالات اور اسباب تھے جن کے تحت اور جن کی وجہ سے ایک ایسی حکومت جو اپنے زمانے کی سب سے وسیع، مضبوط اور طاقت ور حکومت رہ چکی تھی اور جس کے حکمرانوں نے چھ سو سال سے زیادہ عرصے تک دنیا کے طول و عرض پر حکومت کی تھی، زوال کا شکار ہوئی، زوال کا آغاز کب ہوا، اس کا ادراک عثمانی حکمرانوں کو ہوا یا نہیں، اگر ہوا تو زوال اور اسباب زوال کے تدارک کو ششیں کی گئیں یا نہیں اور انہیں کامیابی ملی یا نہیں۔ ان

تمام پہلوؤں سے آگاہی حاصل ہوگی۔

8.2 عثمانی حکومت کا زوال

کہاوت مشہور ہے "ہر عروجِ رازوال" (ہر عروج کے لیے زوال ہے)۔ اس کا اطلاق شخص کی انفرادی زندگی سے لے کر اقوام کی اجتماعی زندگی تک ہر سطح پر ہوتا ہے۔ یہی قانون فطرت بھی ہے۔ دنیا کی جن قوموں کو بھی تاریخ کے کسی دور میں ترقی اور عروج کا موقع ملا، عروج کی ایک خاص سطح اور مرحلے پر پہنچنے کے بعد ان کا زوال شروع ہو گیا۔ عروج، ترقی اور خوش حالی کے زمانے میں قوموں کے ارباب اختیار کی جانب سے جو بے اعتدالیاں ہوتی ہیں، اگر وقت پر ان کے تدارک کے اقدامات نہیں کیے جاتے تو بہت جلد وہ مرض کا پیکر اختیار کر لیتی ہیں اور پھر رفتہ رفتہ توجہ اور دیکھ بھال کے مناسب حال یہی مرض ان کی ہلاکت کا سبب بھی بن جاتا ہے۔ عثمانیوں کی حکومت بھی عروج و زوال کے اس فطری قانون سے مستثنیٰ نہیں تھی۔ ان کی حکومت کا آغاز ایشیائے کوچک میں بازنطینی سرحد کے قریب ایک چھوٹی سی جاگیر سے ہوا۔ اس خاندان کے اولوالعزم حکمرانوں نے بہت جلد اس چھوٹی سی جاگیر کو ایک وسیع و عریض سلطنت میں بدل دیا، جو ایشیا، یورپ اور افریقہ تین براعظموں میں پھیلی ہوئی تھی۔ پوری اسلامی تاریخ میں عثمانی حکومت تنہا ایک ایسی حکومت ہے جس میں کسی ایک خاندان نے چھ سو سال سے زیادہ عرصہ حکومت کی ہو۔ مسلم دنیا میں کسی خاندان کی حکومت کو اتنا عروج نہیں حاصل ہوا جتنا کہ عثمانی خاندان کی حکومت کو۔ تقریباً تین سو سال تک عثمانی حکومت مسلسل ترقی اور عروج کی جانب گامزن رہی، اس کے بعد بھی سو، سوا سو سال تک اس کی سطوت اور حکمرانی کا جلوہ تمام دنیا میں قائم رہا اور جب زوال ہوا تو بھی ان کا زوال عام خاندانوں کی حکومتوں جیسا نہیں تھا۔ اس میں بھی ان کو تین سو سال لگ گئے۔ اس دوران متعدد عثمانی حکمرانوں نے نہ صرف یہ کہ اصلاح احوال کے لیے کوششیں کیں بلکہ انہوں نے اپنی ایک ایک انچ زمین کے لیے خون بہائے اور اسے آسانی کے ساتھ دشمنوں کے قبضے میں جانے نہیں دیا۔

عثمانی حکومت کی اس پائیداری اور استحکام پر اگر نظر ڈالی جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس کا راز زیادہ تر ان کے اس نظام حکومت میں تھا جو انہوں نے رائج کیا اور جو اپنے زمانے کے حالات کے لیے بہت ہی مناسب اور موزوں تھا۔ خاص طور پر عثمانی حکمرانوں نے قانون کی پاسداری کی جو روایت قائم کی، اور حکومت کے کاموں میں مشورے کی اہمیت کا باب عالی اور دوسرے اداروں کے حوالے سے جس طرح خیال رکھا، اس نے ان کی حکومت کو مضبوطی بھی عطا کی اور استحکام بھی بخشا۔ ینی چری بظاہر ان کی منظم فوج کا نام تھا، لیکن اس کے انتخاب کے طریقے نے ایک منظم ادارے (ادارۂ حکومت) کی شکل اختیار کر لی، جس کے ذریعے فوجی سپاہیوں اور حکام سے لے کر انتظامیہ کے اعلیٰ حکام (صدر اعظم) تک کا انتخاب عمل میں آتا تھا۔ ادارہ حکومت کے تحت فوجیوں اور انتظامیہ کے حکام کی بہترین تربیت کی جاتی تھی، جس کی وجہ سے ینی چری اگر اپنے زمانے کی منظم ترین اور باضابطہ فوج تھی، جو ایک لمبے عرصے تک ناقابل شکست باور کی جاتی تھی تو دوسری طرف عثمانیوں کی انتظامیہ کو بھی بہترین منتظم میسر آئے، جنہوں نے اپنی صلاحیتوں سے اس کے عروج و ترقی میں اہم رول ادا کیا۔ ان سب چیزوں

سے بڑھ کر عثمانی حکمرانوں اور حکمراں طبقے کے وہ ذاتی اوصاف تھے جو انہیں اس زمانے کی برائیوں، مثلاً جوا، شراب، بے حیائی، بددیانتی، خود غرضی وغیرہ سے باز رکھتے تھے، بلکہ ترکوں کی روایتی شجاعت ان کے حکمرانوں کو میدان جنگ میں بھی سرگرم عمل رکھتی تھی۔ لیکن جیسے جیسے عثمانیوں کے ان اوصاف میں انحطاط آتا گیا، محکوم اقوام کی برائیاں اور بے حیائیاں ان کے حکمراں طبقے میں عام ہونے لگیں۔ حکمراں شجاعت و بہادری اور تدبّر جیسے اوصاف سے محروم ہونے لگے، عثمانی حکومت کو بھی زوال آتا گیا۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، حکمرانوں کی معمولی بے اعتدالیاں جو شروع میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں رفتہ رفتہ ایسی غلطیوں کا پیش خیمہ بن جاتی ہیں جو کسی بھی خاندانی حکومت کو زوال کے راستے پر ڈالنے کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ عثمانی حکومت کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ مثال کے طور پر غیر ترک اور غیر مسلم عورتوں کی عثمانی حکمرانوں کے حرم میں شمولیت کا آغاز بالکل ابتدائی دور میں ہی ہو گیا تھا۔ چونکہ ابتدائی عثمانی حکمراں نہایت قابل اور باصلاحیت تھے اس لیے اس کے اثرات ان کی حکومت پر شروع کے دور میں نہیں پڑے۔ لیکن جب حکومت کی باگ ڈور نسبتاً کمزور عثمانی حکمرانوں کے ہاتھ میں آئی تو امور حکومت میں حرم کا دخل روز بروز بڑھنے لگا، جو عثمانی حکومت کے زوال کے بنیادی اسباب میں شامل ہے۔ اسی طرح ابتدائی دور کے عثمانی حکمراں براہ راست نہ صرف جنگوں میں شرکت کرتے تھے بلکہ امور حکومت کی انجام دہی کی تربیت کے لیے عثمانی شہزادے سلطنت کے مختلف علاقوں میں مامور بھی ہوتے تھے۔ سلیمان اعظم کے زمانے سے اس روایت کو بدل دیا گیا اور شہزادوں کو محل کے اندر رکھا جانے لگا۔ محل کے اندر عیش و عشرت کی زندگی کے جو نتائج نکلتے ہیں ان سے عثمانی شہزادے بھی محفوظ نہیں رہے۔ وہ عیش و عشرت میں پڑ کر ناکارہ ہو گئے اور عثمانی حکومت کے زوال کا سبب بنے۔ حالانکہ بظاہر شہزادوں کو محل میں رکھنے کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح ہر حکمراں کے انتقال کے بعد مختلف علاقوں میں موجود شہزادوں کے درمیان حکومت کے حصول کے لیے جو کش مکش ہوتی ہے اسے روکا جائے۔ لیکن ایک احتیاطی تدبیر حکمرانی کے جوہر کے خاتمے کا سبب بن گئی۔

8.3 عثمانی حکومت کے زوال کے اسباب

اس میں کوئی شک نہیں کہ سلطان محمد فاتح کی فتح قسطنطنیہ اور بعد ازاں سلطان سلیمان اعظم (قانونی) کی فتوحات نے عثمانی حکومت کو بام عروج تک پہنچا دیا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عروج و ترقی کی اسی عظمت و شوکت کے بطن سے عثمانی حکومت کے زوال نے بھی جنم لینا شروع کیا اور ''دولت عثمانیہ'' کے مؤلف ڈاکٹر محمد عزیز کے مطابق اب سے بہت پہلے بلکہ سلیمان اعظم کے سو سال بعد ہی ایک ترک مؤرخ قوچی بے نے 1663ء میں سلطنت عثمانیہ کے زوال پر ایک کتاب لکھی تھی۔ حالانکہ اس وقت اس کی باتوں پر دھیان نہیں دیا گیا۔ لیکن اس نے اپنی کتاب میں دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا تھا کہ سلطنت عثمانیہ کے زوال کی بنیاد سلیمان اعظم کے عہد حکومت میں ہی پڑ چکی تھی، اور اس نے اسباب زوال کو بھی اپنی کتاب میں ذکر کیا تھا۔ اسی طرح مشہور ترک ادیبہ خالدہ ادیب خانم نے بھی عثمانی حکومت کے زوال کا سرِ آغاز سلیمان اعظم کے دور حکومت کو ہی قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق اگرچہ سلیمان اعظم کی حکومت دنیا کے تین براعظموں پر پھیلی ہوئی تھی اور وہ اتنی طاقت ور فوج کا سربراہ اعلیٰ تھا جو یورپ کی مشترکہ افواج کو بحر و بر دونوں میں بیک وقت شکست فاش دے سکتی تھی لیکن خود اس کی اقلیم قلب و دماغ پر اس کی روسی بیگم سلطانہ خرّم، جسے اہل مغرب Roxalane (روکسلین) کے نام سے یاد کرتے ہیں، کا راج

قائم تھا اور اس مملکت دل میں صرف اسی کا سکہ چلتا تھا۔ اسی طرح عثمانی حکومت کے زوال کے اسباب کی چھان بین کے وقت ہمیں سلطان محمد فاتح کے اس خونیں قانون کو بھی نہیں بھلانا چاہیے جس کے تحت جانشین حکومت کے لیے ضروری قرار پایا کہ وہ اپنے بھائیوں کو قتل کروادے۔ خود سلطان محمد فاتح نے بھی اپنی حکومت کا آغاز اپنے شیر خوار بھائی کے قتل سے کیا تھا۔ ذیل میں ہم عثمانی حکومت کے زوال کے اسباب کا ایک ایک کر کے ذکر کرتے ہیں۔

8.3.1 سلطان کی مجلس دیوان سے علیحدگی

عثمانیوں کے نظام حکومت کے تحت ہم یہ پڑھ چکے ہیں کہ عثمانی حکومت کی سب سے زیادہ بااختیار اور سب سے بڑی انتظامی مجلس اس کا دیوان تھا، جس کے اجلاس کی صدارت خود سلطان کرتا تھا اور جس میں عثمانی انتظامیہ، فوج اور عدلیہ کے اعلیٰ حکام، وزراء اور ذمہ داران شامل ہوتے تھے۔ سلطان سلیمان اعظم سے پہلے دستور یہ تھا کہ سلطان خود مجلس دیوان میں بیٹھتا اور اس کا صدر نشین ہوا کرتا تھا۔ سلطان دیوان کی ہر مجلس میں خود موجود رہتا تھا اور سلطنت کے وزیروں اور اعلیٰ حکام سے مختلف امور میں مشورے کرتا تھا۔ سلیمان اعظم نے اپنے عہد حکومت میں مجلس میں سلطان کی موجودگی کے اس دستور کو موقوف کر دیا۔ وہ دیوان کے بجائے اس سے متصل ایک علاحدہ کمرے میں بیٹھنے لگا اور وہیں جالیوں سے مجلس کی تمام کارروائیوں کو سنا کرتا تھا۔ سلیمان کے بعد اس کے جانشینوں نے متصل کمرے میں بیٹھنے اور وہاں سے مجلس کی کارروائی پر نظر رکھنے کی زحمت کو بھی کنارے لگا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دیوان کی تمام کارروائی صدر اعظم (وزیر اعظم) کے سپرد ہوگئی اور اسے تمام ملکی، فوجی اور عدالتی اختیارات حاصل ہوگئے۔ البتہ اس تبدیلی کا خطرناک پہلو یہ تھا کہ سلطان اب مجلس دیوان کے مشوروں سے محروم ہوگیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعد کے سلاطین زیادہ مطلق العنان ہونے لگے۔ سلیمان کے زمانے میں دستور کی اس تبدیلی کے بُرے نتائج اس لیے ظاہر نہیں ہوئے کہ وہ خود باتدبیر اور عالی دماغ سلطان تھا، اس لیے وہ بہترین فیصلے کر سکتا تھا۔ لیکن بعد کے سلاطین جو ان خصوصیات کے حامل نہیں تھے، ان کے زمانے میں اس تبدیلی کے مضر اثرات سامنے آنے لگے۔ اس تبدیلی کی وجہ سے وہ ایک طرف تو باصلاحیت اور اہل افراد کے مشوروں سے محروم ہوئے، دوسری طرف ان کے ارد گرد تملق پسندوں، چاپلوسوں اور خود غرض افراد کا حصار تنگ ہونے لگا۔ اسی طرح سلاطین کی کارکردگی اور فیصلوں پر حرم کی خواتین بھی اثر انداز ہونے لگیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عثمانی حکومت روبہ زوال ہونے لگی۔

8.3.2 اعلیٰ عہدوں پر تقرری کے اصول میں تبدیلی

عثمانی نظام حکومت کے مطالعے کے دوران ہم یہ بھی جان چکے ہیں کہ اس حکومت میں انتظامیہ کے تمام اعلیٰ عہدوں پر تقرری ادارۂ حکومت کے تحت انتخاب و تربیت کے ایک مشکل عمل کے ذریعہ ہوتی تھی، جس کی وجہ سے حکومت کو چلانے کے لیے بہترین اور اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل افراد کار مہیا ہوتے تھے۔ کم صلاحیت کے لوگ اعلیٰ عہدوں تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ سلطان سلیمان اعظم نے اپنے زمانہ حکومت میں ایک نئی روایت یہ ڈالی کہ کچھ ایسے لوگ جنھوں نے انتخاب و تربیت کے تدریجی مراحل نہیں طے کیے تھے، صرف اپنی مردم شناسی کی وجہ سے اس نے ان کا تقرر اعلیٰ عہدوں پر کر دیا۔ بلاشبہ سلیمان اعظم کو مردم شناسی کا خاص ملکہ حاصل تھا اور اس نے سلطنت کے

عام اصول کو نظر انداز کر کے کئی بہترین مدبر اپنی حکومت کے لیے حاصل کیے۔ مثال کے طور پر اس کے وزیر اعظم ابراہیم پاشا کو پیش کیا جا سکتا ہے، جسے اس نے محض اپنی مردم شناسی کی بنیاد پر اپنی حکومت کے اعلیٰ ترین منصب صدر اعظم (وزیر اعظم) پر مقرر کر دیا۔ (کہا جاتا ہے کہ ابراہیم اصلاً یونانی نسل کا تھا اور ایک لڑائی میں گرفتار ہو کر غلام بنا لیا گیا تھا۔ اسے ایک دولت مند ترک بیوہ نے خریدا اور اس کی ذہانت و فطانت کو دیکھتے ہوئے بہترین تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ ابراہیم فن موسیقی کا بھی ماہر تھا، ایک سفر میں سلیمان کی نظر اس پر پڑی اور وہ اسے لے کر قسطنطنیہ آ گیا۔ یہاں آکر اس کے دوسرے جوہر بھی کھلے۔ سلیمان اعظم اس سے اتنا متاثر ہوا کہ اس کا نکاح اپنی بہن سے کر دیا اور اسے اپنا وزیر اعظم بنا لیا) سلیمان اعظم نے اپنی مردم شناسی سے کئی دوسرے لوگوں کو بھی اعلیٰ عہدوں پر مقرر کیا جو بلاشبہ اعلی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان سے سلطنت کو فائدہ بھی پہنچا۔ لیکن مردم شناسی کی جو صلاحیت سلیمان اعظم کو حاصل تھی وہ اس کے بعد کے عثمانی سلاطین میں نہیں پائی جاتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک روایت جس کو سلیمان اعظم نے سلطنت کی بھلائی کے لیے توڑا تھا، اس کے جانشینوں کے دور میں اس کا استعمال تملق پسندوں کے انتخاب اور حرم کی بیگمات کو خوش کرنے کے لیے ہونے لگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اعلیٰ عہدوں پر بے صلاحیت افراد کا تقرر ہونے لگا اور جو باصلاحیت افراد ادارۂ حکومت کے انتخاب و تربیت کے مراحل طے کر کے ان مناصب کے امیدوار ہوتے تھے ان میں بے چینی پیدا ہونے لگی۔ یہ بھی عثمانی حکومت کے زوال کا ایک اہم سبب بنا۔

8.3.3 رشوت ستانی کی گرم بازاری

عثمانی حکومت کے زوال کا ایک بنیادی سبب سلطنت میں جاری رشوت ستانی کی گرم بازاری بھی تھی۔ عہد زوال کے عثمانی حکمرانوں کے دور میں حکومت کی ملازمتیں اور نوکریاں صلاحیتوں کی بنیاد پر لوگوں کو نہیں ملتی تھیں بلکہ انہیں نیلام کیا جاتا تھا اور جو شخص زیادہ بولی لگاتا تھا وہ اس کا حق دار قرار پاتا تھا۔ عثمانی حکومت کے زوال کے اس اہم سبب کا سرِ آغاز بھی ہمیں سلیمان اعظم کے زمانے میں ہی ملتا ہے۔ عثمانی حکومت میں اس بدعت اور بڑی خرابی کا آغاز سلیمان اعظم کے دوسرے وزیر اعظم رستم پاشا نے کیا۔ یہ شخص سلیمان کا داماد تھا اور سلطان کی چہیتی ملکہ سلطانہ خرم کا منظور نظر تھا۔ اس کی سفارش سے بلکہ سازش سے وزارت عظمیٰ کے عہدے تک پہنچا تھا۔ وہ پندرہ سال تک عثمانی حکومت میں وزیر اعظم کے عہدے پر فائز رہا۔ وہ شاہی خزانہ کے لیے رقم حاصل کرنے کے ہنر سے خوب اچھی طرح واقف تھا اور اسی کی آڑ میں اس نے عثمانی سلطنت میں رشوت کے چلن کو عام کیا۔ وزیر اعظم کے طور پر اس کا طریقہ یہ تھا کہ سلطنت کے انتظامی عہدوں پر جو لوگ مقرر کیے جاتے تھے ان سے ان کے تقرر کے موقع پر رستم پاشا عہدے کی مناسبت سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتا تھا۔ سلیمان کے زمانے میں اس خرابی کے آثار زیادہ نمایاں اس لیے نہیں ہوئے کہ اس کے عہد میں رقم کی مقدار عہدے اور منصب کی تنخواہ کی مناسبت سے طے کی جاتی تھی اور ایک متعین رقم سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی طرح یہ روایت صرف انتظامی عہدوں تک محدود تھی، بری و بحری افواج کی ملازمتیں اس سے مستثنیٰ تھیں۔ لیکن سلیمان اعظم کے بعد اس کے جانشینوں کے دور میں نہ صرف یہ کہ رقم کی متعین مقدار کی حد ختم کر دی گئی بلکہ انتظامی عہدوں کی قید بھی باقی نہیں رہی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت کی ملازمتوں کے بدلے لوگوں سے موٹی موٹی رقمیں وصول کی جانے لگیں۔ سلطنت کی تمام فوجی و انتظامی ملازمتیں نیلامی کے لیے پیش ہونے لگیں۔ عہدے اور منصب انہیں لوگوں کو ملنے لگے جو اپنے تقرر کے

وقت سب سے بڑی بولی لگا سکتے تھے، گویا ملازمتیں صلاحیت کی بنیاد پر نہیں بلکہ پیسوں کی بنیاد پر حاصل کی جانے لگیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بڑے بڑے حاکموں سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے ملازمین تک ہر سطح پر رشوت کی گرم بازاری عام ہو گئی۔ لوگ عہدے اور ملازمتیں حاصل کرنے کے لیے جا و بے جا تمام طریقے استعمال کرنے لگے۔ اس طرح سلطنت عثمانیہ سلیمان اعظم کے زمانے کے بعد باصلاحیت حکام اور ملازمین سے محروم ہونے لگی اور یہ بھی اس کے زوال کا ایک اہم سبب بنا۔

8.3.4 وزراء وامراء کی شاہانہ زندگی

سلطان سلیمان اعظم کے زمانے تک، جب کہ اعلیٰ عہدوں کے تقرر میں تبدیلی نہیں ہوئی تھی، وزراء اور اعلیٰ حکام کا تقرر ادارۂ حکومت سے ہوتا تھا اور چونکہ ان کی وفاداری خالص سلطان کی ذات تک محدود ہوتی تھی اور ان کے لیے سلطان قلی (سلطان کا غلام) سے بڑھ کر کوئی دوسرا اعزاز نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے مال و دولت ان کے لیے ثانوی (دوسرے درجے کی) حیثیت رکھتے تھے۔ سلیمان اعظم کی ایک عادت یہ تھی کہ دوسرے مطلق العنان حکمرانوں کی طرح وہ بھی جس وزیر یا حاکم سے خوش ہوتا تھا، اسے بے تحاشا انعام واکرام سے نوازتا تھا۔ یہی نہیں وہ خواہ کتنا ہی مال و دولت جمع کر لیں ان سے کوئی پرستش نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ اس کے دور حکومت میں پہلے ابراہیم پاشا جو تیرہ سال تک وزیر اعظم رہا اور رستم پاشا جو پندرہ سال تک وزیر اعظم رہا، دونوں نے بے انتہا دولت جمع کی اور انہوں نے شاہ خرچی اور شاہانہ زندگی کا ایک ایسا معیار قائم کیا جس نے انہیں سلطان کا تقریباً ہم پلّہ بنا دیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ابراہیم پاشا کے زوال کا ایک سبب محلاتی سازش کے علاوہ اس کی شاہانہ زندگی بھی بنی۔ دوسرے وزیروں اور اعلیٰ عہدے داروں نے بھی انہیں کی پیروی کرنے اور انہیں کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اعلیٰ معیار زندگی کے فراق میں انہوں نے جا و بے جا تمام طریقے مال و دولت کے حصوں کے لیے استعمال کرنے شروع کر دیے، جو سلطنت عثمانیہ کے زوال میں معاون ہوئے۔

8.3.5 امور حکومت میں حرم کی دخل اندازی

تاریخ میں حرم کی بہت سی خواتین ایسی گزری ہیں جن کے صائب اور مناسب مشوروں سے حکمرانوں نے نہ صرف فائدہ اٹھایا ہے بلکہ کئی بار ان کے مشورے حکومت کی پائیداری اور استحکام کا سبب بھی بنے ہیں۔ لیکن جب مشورے حرم کی سازشوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور امور حکومت میں حرم کی خواتین کی دخل اندازی بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے تو محلاتی سازشوں کے نتیجے میں کتنی ہی حکومتیں صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔ سلطنت عثمانیہ کے زوال میں ایک اہم سبب حکومت کے امور میں حرم کی بے جا دخل اندازی اور سازشیں بھی بنیں۔ بلکہ اسے ایک قوی سبب کہنا مناسب ہوگا۔ اوپر مذکور دیگر اسباب زوال کی طرح امور حکومت میں حرم کی عورتوں کی مداخلت اور سازشوں کا آغاز بھی سلطان سلیمان اعظم کے زمانے میں ہی ہوا، جیسا کہ پہلے ذکر ہوا سلیمان اعظم کی روسی بیوی سلطانہ خرم یا روکسلین (Roxalane) کو سلطان کے مزاج میں خاص دخل تھا۔ وہ اپنے بیٹے سلیم کو سلیمان کے بعد سلطنت عثمانیہ کے تخت و تاج کا وارث بنانا چاہتی تھی جب کہ سلیمان کا بڑا بیٹا مصطفیٰ، جو دوسری بیوی سے تھا، نہایت ہی لائق اور بہادر تھا۔ اس کے مقابلے سلیم عمر میں چھوٹا ہونے کے علاوہ عیش پسند بھی تھا، لیکن سلطانہ خرم نے سلیمان کے کان بھر کر اسے شہزادہ مصطفیٰ سے بدظن کر دیا۔ نتیجے میں سلیمان اعظم نے خود اپنے سامنے اپنے بیٹے کو

گلا گھونٹ کر مروا دیا۔ سلیمان کے دوسرے بیٹے بایزید اور اس کے بیٹوں کے قتل کے پیچھے بھی سلیمان کی اسی روسی حرم کا ہاتھ تھا۔ یہاں تک کہ سلیمان کے لائق وزیر اعظم ابراہیم پاشا کا خون بھی سلطانہ خرم کی سازش کا نتیجہ تھا۔ جو اپنے داماد رستم پاشا کو اس کی جگہ وزیر اعظم بنوانا چاہتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سلیمان کے حسن تدبّر کی وجہ سے زوال کے آثار اس کے زمانے میں بلکہ اس کے بعد بھی ایک زمانے تک بہت زیادہ نمایاں نہیں ہوئے۔ لیکن سلیمان کے بعد امور حکومت میں حرم کی خواتین کی دخل اندازی اور بھی زیادہ بڑھ گئی اور محلّاتی سازشوں نے ایسی شکل اختیار کر لی کہ حکمرانوں کا عروج وزوال سب کچھ محل کی سازشوں کے تحت ہونے لگا۔ اس طرح امور حکومت میں حرم کی خواتین کی بے جا دخل اندازی بھی عثمانی حکومت کے زوال کا ایک اہم اور بنیادی سبب بنی۔

8.3.6 عثمانی شہزادوں کی محل تک تحدید

جہاں گیری و جہاں بانی کے اصول و آداب درس گاہوں کی چہار دیواری کے اندر نہیں بلکہ کوہ و بیابان میں سکھائے جاتے ہیں۔ ابتدائی دور کے عثمانی حکمرانوں کی طاقت کا راز اس میں پنہاں تھا کہ ان میں کا ہر ایک حکمراں بہترین مرد میدان بھی ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنی فوجوں کی کمان خود اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا اور ان کی حوصلہ افزائی کے لیے میدان جنگ میں بھی موجود رہتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان میں اپنے زمانے کے بڑے بڑے فاتح پیدا ہوئے۔ عثمانی شہزادوں کی تربیت شاہی محل کے بجائے جنگ کے میدانوں اور صوبوں کے دارالحکومتوں میں ہوا کرتی تھی۔ جہاں انہیں حکمرانی کا براہ راست تجربہ حاصل ہوتا تھا۔ سلیمان اعظم کے زمانے میں حرم کی خواتین خاص طور پر سلطانہ خرم کے زیر اثر طرز حکمرانی میں جہاں اور دوسری بدعات کو رواج حاصل ہوا وہیں ایک انتہائی مہلک بدعت یہ رائج ہوئی کہ عثمانی شہزادوں کو محل کے اندر ہی ایک طرح سے قید میں رکھ کر ان کی تعلیم وتربیت کا انتظام کیا جانے لگا۔ اس کے زمانے میں شہزادوں کو قید رکھنے کا جو قانون بنایا جو روایت پڑی، اس نے کافی دنوں کے لیے عثمانی حکمرانوں کی شان وعظمت پر گہن لگا دیا۔ کیونکہ نئی روایت کے مطابق عثمانی شہزادوں کو مختلف زبانوں اور علوم وفنون کی تعلیم تو دی جاتی تھی لیکن ان کی جسمانی تربیت اور عملی تجربہ حاصل کرنے کا نظم نصاب سے خارج ہو گیا۔ شہزادوں کو قصر شاہی سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عثمانی خاندان میں اب ایسے حکمراں پیدا ہونے لگے، جنہوں نے تخت نشینی سے پہلے تک شاہی محل سے باہر کی دنیا کو نہیں دیکھا تھا۔ بند محل کے اندر کی تعلیم اور عیش وعشرت کی زندگی نے جفاکش عثمانی خاندان کے شہزادوں کو آسائش اور آرام پسند بنا دیا اور وہ حکومت کے کاروبار سے غافل ہو گئے۔ یہی وجہ ہے جو ہم دیکھتے ہیں کہ سلیمان اعظم کے بعد عثمانی خاندان میں معدودے چند قابل اور باصلاحیت حکمراں پیدا ہوئے۔

8.3.7 ولی عہدی کا طریقہ

عثمانی حکومت کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ ایک خاندان کی خالص موروثی حکومت تھی جس میں حکومت ایک ہی خاندان میں محدود رہتی ہے خاص طور پر باپ کے بعد بیٹا اس کی حکومت کا وارث ہوتا ہے۔ خاندانی یا موروثی حکومتوں میں صلاحیت و قابلیت کے بجائے اصل اہمیت حکمراں خاندان سے تعلق کو ہوتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں کئی بار ایسے لوگوں کو حکمرانی مل جاتی ہے جو کسی بھی طور پر اس کے اہل نہیں ہوتے اور پھر اس خاندان کی حکومت کے زوال کا سبب بن جاتے ہیں۔ موروثی حکومتوں کے اس کلیے سے آل عثمان کی حکومت

بھی مستثنیٰ نہیں تھی۔ وہاں بھی رواج یہی تھا کہ باپ کے بعد بیٹا اس کا جانشین ہوتا تھا۔ بہت بعد میں جا کر 1617ء میں سلطان احمد اوّل کے انتقال کے بعد قانون وراثت میں یہ تبدیلی آئی کہ آل عثمان کا وہ شہزادہ تخت کا وارث ہوگا جو عمر میں سب سے زیادہ ہوگا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اکثر بڑا بیٹا، خواہ وہ کتنا ہی نااہل کیوں نہ ہو، اپنے آپ کو تخت و تاج کا وارث خیال کرتا تھا۔ اس کی وجہ سے ولی عہدی کے زمانے سے ہی اس کے ارد گرد تملق پسندوں اور چاپلوسوں کا ایک ایسا حصار قائم ہو جاتا تھا جو صرف اس کی ہاں میں ہاں ملایا کرتے تھے۔ نتیجے میں اسے اس کی کمزوریاں معلوم ہی نہیں ہو پاتی تھیں پھر جب وہ تخت نشین ہو کر حکمراں بن جاتا تھا تو ان غرض کے بندوں کی بن آتی تھی اور وہ اسے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتے تھے اور اس طرح فتنہ و فساد کا سبب بنتے تھے۔ موروثی اور خاندانی حکومت کا اس سے بھی خطرناک پہلو یہ ہے کہ شہزادوں کے درمیان اقتدار کے حصول کے لیے چپقلش پیدا ہو جاتی ہے، محل کے اندر اور باہر مختلف گروہ بن جاتے ہیں اور ہر طرف سازشوں کا جال بُنا جانے لگتا ہے اور نتیجہ کئی بار شہزادوں کے درمیان قتل و خوں ریزی کی صورت میں بر آمد ہوتا ہے۔ عثمانی حکومت بھی موروثی حکومتوں کی اس کمزوری سے محفوظ نہیں تھی۔ محمد فاتح جیسا عظیم فاتح اور حکمران بھی اس بیماری سے نہیں بچا، اس نے اس خوف سے تخت نشینی کے فوراً بعد اپنے دودھ پیتے (شیر خوار) بھائی کو حوض میں غرق کر کے مروا دیا کہ کہیں وہ اس کے برابر نہ ہو جائے۔ یہی نہیں اس نے ایک ایسا قانون بنا دیا جس کی رو سے حکومت حاصل کرنے والے عثمانی فرماں روا کے لیے لازمی قرار پایا کہ وہ اپنے بھائیوں کو قتل کرا دے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ولی عہدی کے رواج سے ہونے والے خون خرابے اور اس کے لیے ہونے والی محلاتی سازشوں نے بھی سلطنت عثمانیہ کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے میں اہم رول ادا کیا اور اس کے زوال کا سبب بنیں۔

8.3.8 اجنبی عورتوں سے شادی

عثمانی حکومت کے زوال کے اسباب میں ایک سبب عثمانی حکمرانوں کی اجنبی (غیر مسلم) خواتین کے ساتھ شادی بھی تھا۔ غیر مسلم خواتین کے ساتھ شادیوں کے معاملے میں عثمانی حکمراں اپنے ابتدائی دور سے ہی غیر محتاط رہے تھے۔ آل عثمان کا دوسرا حکمراں اور خاں تھا، اس نے ایک عیسائی شہزادی سے شادی کی تھی اور اسے اپنے مذہب پر قائم رہنے کی اجازت دی تھی۔ اس کے بعد سلطان مراد اور بایزید یلدرم نے بھی غیر مسلم عیسائی عورتوں سے شادیاں کر رکھی تھیں۔ سلیمان اعظم کی روسی بیوی کے بارے میں ہم پہلے ہی پڑھ چکے ہیں۔ متعدد عثمانی حکمراں ایسے گزرے ہیں جن کی مائیں غیر مسلم تھیں۔ شادیوں کے علاوہ بھی حکمرانوں کے محل میں کنیزوں اور باندیوں کی شکل میں غیر مسلم خواتین کی ایک بڑی تعداد موجود رہتی تھی۔ اور مختلف مواقع پر یہ امور سلطنت پر بھی اثر انداز ہوتی تھیں۔ ایک مورخ نے عثمانیوں کے اسباب زوال سے بحث کرتے ہوئے اسے بھی زوال کے بنیادی اسباب میں شمار کیا ہے۔ اس کے مطابق:

”آل عثمان کے انحطاط کا ایک جوہری سبب یہ ہے کہ عیسائی باندیوں اور کنیزوں کی کثرت کی وجہ سے سلطانی خون بہت زیادہ بدل گیا تھا“۔ (الاسلام والحضارۃ العربیۃ۔ ج2، ص499)

بلا شبہ اسلام نے اہل کتاب خواتین کے ساتھ ازدواجی رشتے قائم کرنے کی اجازت دی ہے۔ لیکن جب اس طرح کے رشتے سماجی تانے بانے کو متاثر کرنے لگیں یا حکومتوں کی کارکردگی پر اثر انداز ہونے لگیں تو مصلحت اس میں ہے کہ اس سے گریز کیا جائے۔ خود عہد

صحابہ میں اس طرح کی مثالیں موجود ہیں جب خلیفہ دوم حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کو کتابیات کے ساتھ شادی سے منع کر دیا تھا۔

8.3.9 فوج کی سرکشی

ہم پڑھ چکے ہیں کہ عثمانیوں کی کامیابی کا اصل دارومدار اور راز ان کی منظم اور باضابطہ فوج میں تھا۔ عہد زوال میں جب درباری سازشیں بڑھیں تو اس کا اثر فوج پر بھی پڑا۔ عثمانی فوج جو اب تک ہر طرح کے لالچ سے الگ تھی اس کے لیے نشان امتیاز سلطان قلی کہلانا تھا، رفتہ رفتہ اس کے اندر سے بھی سلطان کی محبت کا جذبہ مفقود ہونے لگا اور اطاعت وفرماں برداری کا ان کا نمایاں وصف ختم ہو گیا۔ ینی چری کے طریقہ انتخاب میں اور ان فوجیوں کی اولاد کی فوج میں بھرتی کے حوالے سے قوانین میں جو نرمی برتی گئی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ بہادر فوج نہ صرف یہ کہ اپنا وقار کھو بیٹھی بلکہ یہ بھی دنیاوی آسائشوں میں پڑ گئی۔ ہر سلطان کی تاج پوشی کے موقعے پر ان کی جانب سے تنخواہوں میں اضافے اور دیگر مراعات کا مطالبہ ہونے لگا۔ یہ فوج اتنی زیادہ جری ہو گئی تھی کہ جب بھی اس کے مطالبات پورے نہیں ہوتے بغاوت پر آمادہ ہو جاتی۔ اس نے انتظامی معاملات میں بھی مداخلت کرنی شروع کر دی۔ سلطنت کے مختلف عہدوں پر تقرر کے معاملے میں بھی اس کا عمل دخل بڑھ گیا یہاں تک کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ عثمانی سلاطین کا عزل ونصب ایک طرح سے ان کے ہاتھ میں چلا گیا۔ فوج کا کام سرحدوں کی حفاظت اور ملک میں امن وامان کا قیام ہے اگر وہ سلطنت کے امور میں دخل اندازی کرنے لگے تو پھر اس کا کردار مجروح ہو جاتا ہے اور وہ سرکش قرار پاتی ہے۔ اس طرح عثمانی فوج کی سرکشی بھی اس حکومت کے زوال کا ایک اہم سبب بنی۔

8.3.10 امراءاور وزراء کی مفاد پرستی

کہا جاتا ہے کہ سماج میں بگاڑ ہمیشہ اعلی طبقات سے شروع ہوتا ہے۔ ایسا ہی کچھ عثمانی سماج کے ساتھ بھی ہوا۔ جب حکمرانوں کے اخلاق وکردار میں بگاڑ آیا تو ان کے نزدیکی امیروں اور وزیروں کے اخلاق بھی خراب ہو گئے۔ ان کو صرف اپنے ذاتی مفادات سے غرض رہنے لگی، سلطنت کے مفادات کو انہوں نے پس پشت ڈال دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سلطنت کے مخالفین اور دشمنوں کے ساتھ مل کر اس کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ مختلف مواقع پر ان امیروں اور وزیروں نے سلطان کے ساتھ وفاداری کے بجائے غداری کا ثبوت دیا۔ یا تو وہ دشمن کے ساتھ جا ملے یا پھر ایسے طریقے اختیار کیے جن کا فائدہ بالواسطہ یا بلاواسطہ عثمانی سلطنت کے دشمنوں کو پہنچا۔ اس طرح عثمانی امراء اور وزراء کی مفاد پرستی بھی سلطنت کے زوال کا ایک اہم سبب بنی۔

مذہبی علماء کا جمود

عثمانی ترکوں کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ شروع دور سے ہی وہ مذہب اور مذہبی علماء کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کی بڑی بڑی فتوحات کی پشت پر بڑی حد تک مذہبی جذبہ بھی کار فرما تھا۔ سلطان اپنی تمام تر خود مختاریوں کے باوجود خود کو شریعت ومذہب سے بلند نہیں سمجھتا تھا۔ سلطنت میں شیخ الاسلام یا مفتی اعظم جیسا موقر اور اہم عہدہ جو صدر اعظم کے عہدے کے تقریباً برابر تھا، عثمانی سلطنت میں علماء کی حیثیت کو اجاگر کرنے کے لیے کافی ہے۔ لیکن جب عثمانی ترکوں کا عمومی زوال شروع ہوا تو علماء کا طبقہ بھی اس سے محفوظ نہیں رہا۔ اس دور کے علماء ذہنی وفکری جمود کا شکار ہو گئے۔ ہر نئی چیز کی مخالفت وہ محض اس بنیاد پر کرنے لگے کہ اس کی نظیر اسلامی شریعت کے پہلے سے موجود

مذہبی سرمایہ میں نہیں تھی۔ عثمانی دور کے عہد زوال کے علماء نے ان حکمرانوں اور ان کی اصلاحات کی کھل کر اور پر زور مخالفت کی جو اصلاحات کے ذریعہ عثمانی حکومت کو اس کا کھویا ہوا وقار واپس دلانا چاہتے تھے۔ چنانچہ سلطان سلیم ثالث نے جب عثمانی فوج کی اصلاح کرنی چاہی اور اسے جدید انداز میں منظم کرنے کی کوشش کی تو اس وقت کے شیخ الاسلام عطاء اللہ آفندی نے نہ صرف یہ کہ اس کی مخالفت کی بلکہ یہ فتوی دے دیا کہ جدید قسم کا فوجی لباس پہننا شعائر اسلام کے خلاف ہے۔ یہاں تک کہ انہی علماء نے سلطان سلیم کی معزولی کا شرعی جواز بھی فراہم کیا۔ اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ مذہبی علماء کا جمود بھی عثمانی حکومت کے زوال کا ایک اہم سبب بنا۔

ترک قوم پرستی

عثمانی سلطنت میں ترکوں کے علاوہ مختلف نسلوں اور قومیتوں کے لوگ بھی آباد تھے۔ حالانکہ عثمانی حکمرانوں کی جانب سے ایسے اقدامات نہیں ہوئے جنہیں ہم ترک قوم پرستی کی طرف لے جانے والا کہیں۔ لیکن اس وقت کے یورپ میں قومی بیداری کی جو لہر چلی رہی تھی اس سے عثمانی سلطنت کے ترکوں میں بھی ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا جو ترک قوم پرستی کا حامی تھا۔ عثمانی حکومت کے زوال میں اس عنصر نے بھی اپنا رول ادا کیا اور بالآخر اسی کے ذریعہ عثمانی حکومت کا خاتمہ ہوا۔

عربوں کی بغاوت

عثمانی سلطنت ایک وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ جب عثمانیوں کا زوال شروع ہوا تو مرکز کمزور ہو گیا۔ نتیجے میں مختلف علاقوں میں مقامی حکام کے ذریعہ عام لوگوں پر زیادتیاں بھی ہوئیں، جس سے لوگ عثمانی حکومت کے مخالف ہو گئے۔ اس کا سب سے نمایاں اظہار عربوں کی بغاوت کی شکل میں ہوا۔ حالانکہ عثمانی حکمراں اپنی تمام ترکوتاہیوں کے باوجود حرمین اور آس پاس کے عرب علاقوں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ لیکن عربوں کو یورپی طاقتوں نے خود مختاری کا سبز باغ دکھا کر ان کو عثمانی حکومت کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا۔ عربوں کی بغاوت نے بھی عثمانی حکومت کے زوال میں اہم کردار ادا کیا۔

اقتصادی بدحالی

مختلف وجوہ سے عثمانی حکومت نئے حالات اور تقاضوں کا ساتھ دینے سے قاصر رہی۔ یورپ کے صنعتی انقلاب سے ترکوں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، جب کہ جدید تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جس پیمانے پر رقم کی ضرورت تھی، وہ پرانے نظام کے تحت نہیں فراہم ہو رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی پر قرضوں کا بوجھ بڑھتا گیا اور وہ اقتصادی بدحالی کا شکار ہو گیا۔ چنانچہ اقتصادی بدحالی نے بھی اس کے زوال میں اہم کردار ادا کیا۔

معاصر اقوام کی بیداری اور عثمانی حکومت کے خلاف سازشیں

ایک طرف عثمانی ترکی کی حالت یہ تھی کہ وہ لکیر کا فقیر بنا رہا تو دوسری طرف اس کی ہم سایہ قوموں نے علوم وفنون سے فائدہ اٹھا کر نہ صرف یہ کہ ان میں ترقی کی بلکہ اس ترقی کے ذریعہ نئی نئی ایجادات کیں جو ان کی نشاۃ ثانیہ کا سبب بن گئیں۔ علمی وسیاسی انقلاب کے

ساتھ صنعتی انقلاب نے مل کر ترکی کی ہم سایہ قوموں کو بہت زیادہ طاقتور بنا دیا۔ انہوں نے عثمانیوں سے یورپی علاقوں کو چھیننے کا منصوبہ بنایا۔ نیز دوسرے علاقوں کے بھی حصے بخرے کرنے کے لیے سازشیں کیں۔ اس طرح یہ بھی عثمانی حکومت کے زوال کا ایک سبب بنا۔

8.4 عثمانی حکومت کے زوال کو روکنے کی کوششیں

اکائی کے شروع میں ہم یہ بات لکھ چکے ہیں کہ مسلم دنیا میں سب سے طویل حکومت کا سہرا عثمانی خاندان کے سر ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عثمانیوں کا زوال دوسری خاندانی حکومتوں کی طرح بالکل اچانک سو پچاس برس کے اندر نہیں ہو گیا۔ بلکہ زوال کے آغاز کے بعد بھی اپنے مخصوص نظام حکومت کی وجہ سے عثمانیوں نے سو برس سے زیادہ عرصے تک اپنے دبدبے کو برقرار رکھا اور اس کے بعد بھی دو سو برس کے عرصہ زوال میں متعدد ایسی کوشش عثمانی حکمرانوں کے ذریعہ ہوتی رہیں جن کا مقصد زوال کو روکنا تھا۔ اکائی کے اس حصے میں ہم ان کوششوں کا ذکر کریں گے جو مختلف عثمانی حکمرانوں نے حکومت کے زوال کو روکنے کے لیے کیں۔

عثمانی دور زوال میں سلطان محمود اول (1730ء تا1754ء) شاید پہلا عثمانی حکمراں ہے جس نے اپنے فوجی نظام کی کمزوری کو سمجھا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ترکوں کی شکست کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی فوجوں کی تنظیم یورپ کی فوجوں کے مقابلے میں اچھی نہیں ہے۔ اسی طرح ان کے پاس جو ہتھیار ہیں وہ یورپی افواج کے ہتھیاروں کے مقابلے کمتر ہیں۔ عثمانی فوج کی اس کمزوری کو دور کرنے کے لیے محمود اول نے یورپی ملک فرانس کی مدد لی اور فرانسیسی فوجی ماہرین کی خدمات حاصل کیں۔ ان ماہرین کی کوشش اور توجہ سے عثمانی فوج کی تنظیم میں بہتری آئی اور اس کے بعد پیش آنے والے مختلف معرکوں میں اس نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ بھی کیا۔

8.5 سلطان سلیم ثالث کی کاوشیں

البتہ سلطنت عثمانیہ کے زوال کو روکنے یا کم از کم اس کی رفتار کو سست کرنے کے لیے جس عثمانی حکمراں کی کوششیں بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہیں وہ سلطان سلیم ثالث (1789ء تا1807ء) ہے۔ اس نے سلطنت کے اندر تعلیم کے فروغ اور جدید علوم کی اشاعت پر خالص توجہ دی۔ بری اور بحری عثمانی فوجوں کو از سر نو منظم کر کے اسے تنظیم جدید کا نام دیا۔ جنگ کے فن سے متعلق فرانسیسی کتابوں کا ترکی زبان میں ترجمہ کرایا۔ اسی طرح توپ تیار کرنے کے نئے کارخانے قائم کے گئے۔ نظام جاگیرداری میں اصلاح کی گئی اور امور سلطنت میں جمہوری مزاج پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن سلطان سلیم ثالث اپنی ان کوششوں میں زیادہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ ثروت صولت نے اسے اس طرح بیان کیا ہے:

”مفاد پرست اور تنگ نظر لوگ سلیم کے خلاف ہو گئے۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ ینی چری فوج جو کسی زمانے میں ترکی کی سب سے منظم اور طاقت ور فوج تھی نظام جدید کے خلاف تھی اور وہ اپنی اجارہ داری قائم رکھنا چاہتی تھی۔ ینی چری کے سپاہیوں نے جدید یورپی اسلحہ رکھنے اور جنگی طریقوں کو اختیار کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ شیخ الاسلام اسعد آفندی اصلاحات کے حامی تھے لیکن 1807ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ نئے شیخ الاسلام عطاء اللہ آفندی ینی چری کے زیر اثر تھے۔ ”جاہل صوفیوں“ تنگ نظر علماء نے جو دین کے علم اور اس کی روح

سے قطعاً بے بہرہ تھے، مذہب کے نام پر اصلاحات کی مخالفت کی۔ یورپی طرز پر فوجوں کی تنظیم کو بے دینی سے تعبیر کیا، جدید فوجی وردیوں کو تشبہ بالنصاریٰ (عیسائیوں کی مشابہت) قرار دیا، سنگین تک کے استعمال کی اس لیے مخالفت کی گئی کہ کافروں کے اسلحے استعمال کرنا ان کے نزدیک گناہ تھا۔ سلیم کے خلاف یہ کہہ کر نفرت پھیلائی گئی کہ وہ کفار کے طریقے رائج کر کے اسلام کو خراب کر رہا ہے۔ شیخ الاسلام عطاء اللہ آفندی نے فتویٰ دیا کہ ایسا بادشاہ جو قرآن کے خلاف عمل کرتا ہو بادشاہت کے لائق نہیں۔ آخر کار 1807ء میں سلیم کو معزول کر کے قتل کر دیا گیا۔ "یہ پہلا موقع تھا کہ مذہبی پیشواؤں نے اپنی حمایت اور تاریک خیالی سے اسلام کے مانع ترقی ہونے کا غلط تخیل پیدا کیا۔" (ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ۔ دوم:49-448)

8.6 سلطان محمود ثانی کی کاوشیں

عثمانی حکومت کے زوال کو روکنے کی کوششوں میں سلطان محمود ثانی (1808ء تا1839ء) کی خدمات سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اگر اس کی جاری کردہ اصلاحات بروئے کار آنے دی جاتیں اور اس کی اور اس کے بعد سلطان عبدالمجید خاں کی کوششوں کو بیرونی طاقتیں اپنی مداخلت سے سبوتاژ نہیں کرتیں تو شاید عثمانی حکومت کا زوال نہیں ہوتا اور وہ جمہوری تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے نئے دور میں داخل ہو جاتی۔ سلطان محمود نے سب سے پہلے اندرونی استحکام پر توجہ دی۔ کیونکہ وہ بدامنی اور سرکشی کے حالات میں برسر اقتدار آیا تھا۔ استحکام حاصل ہوتے ہی اس نے اصلاحات کے کام کا آغاز کیا، اس حوالے سے اس کا بڑا کارنامہ ینی چری کا خاتمہ ہے جو اس وقت عثمانی حکومت کے لیے مصیبت بن گئی تھی۔ اس نے جدید طرز پر ایک نئی فوج تیار کی، جس کی وردی اور ٹوپی یورپی طرز کی تھی۔ جاگیرداری نظام کی اصلاح کی۔ اس نے دیوان کی مجلسوں میں پھر سے شرکت کرنی شروع کی (جو سلیمان اعظم کے زمانے سے ختم ہو گئی تھی)۔ سلطان محمود ثانی نے اصلاحات کا ایک پروگرام تیار کیا تھا اور اسے نافذ بھی کرنا چاہتا تھا لیکن بیرونی مداخلتوں نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔ ان اصلاحات کو اس کے انتقال کے فوراً بعد اس کے جانشین سلطان عبدالمجید خاں نے نافذ کیا اور ترکی میں ان اصلاحات کی شہرت "تنظیمات خیریہ" کے نام سے ہوئی۔ اصلاحات کے اس پروگرام کے ذریعہ سلطنت کی رعایا کو جان و مال اور آبرو کی ضمانت دی گئی۔ مذہب و ملت کی کسی بھی تفریق کے بغیر سب کے ساتھ یکساں سلوک کا وعدہ کیا گیا۔ سلطنت کی حدود میں قانون کی بالادستی قائم کی گئی۔ انتظامی، فوجی اور تعلیمی میدانوں میں اصلاحات کی گئیں۔ اسی طرح سلطنت سے غلامی کے رواج کے خاتمے کا بھی قانونی طور پر اعلان کیا گیا۔ سلطان محمود کا تیار کردہ اصلاحات کا پروگرام جسے سلطان عبدالمجید خاں نے جاری کیا اس کی کچھ تفصیل درج ذیل ہے:

یہ امر بخوبی معلوم ہے کہ حکومت عثمانیہ کے ابتدائی دور میں قرآن مجید کے احکام اور سلطنت کے قوانین کا احترام ہمیشہ کیا جاتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ سلطنت کی طاقت و عظمت میں ترقی ہوتی گئی اور بلا استثنا اس کے تمام باشندوں میں بہت زیادہ خوش حالی اور فارغ البالی پھیل گئی۔

ڈیڑھ سو برس سے مسلسل حادثات اور مختلف اسباب سے شرع شریف اور قوانین سلطنت کی پابندی جاتی رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ

قوت اور خوش حالی ضعف اور افلاس سے بدل گئی ہے کیوں کہ جو سلطنت اپنے قوانین کی پابندی ترک کر دیتی ہے اس کا سارا استحکام بھی رخصت ہو جاتا ہے۔

ہم ابتدا ہی سے ان امور پر غور کر رہے ہیں اور تخت نشینی کے روز سے آج تک فلاحِ عامہ، صوبوں کی اصلاحِ حال اور قومی بار کی تخفیف ہماری توجہ کا مرکز ہے، اگر ہم عثمانی صوبوں کے جغرافی حالات، زمین کی زرخیزی اور باشندوں کی موزونی طبع اور ذکاوتِ فہم کو پیشِ نظر رکھیں تو ہمیں یقین آجائے گا کہ موثر طریقوں کے دریافت اور استعمال کرنے پر امید ہے کہ خدا کی مدد سے خاطر خواہ نتیجہ چند ہی سالوں میں حاصل ہو جائے۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ کی مدد اور نبی کریم ﷺ کی دعا پر پورا اعتماد کر کے ہم مناسب خیال کرتے ہیں کہ جدید قوانین کے ذریعہ سلطنت عثمانیہ کے صوبوں میں عمدہ نظم و نسق پیدا کرنے کی کوشش کریں، یہ قوانین خصوصیت کے ساتھ مندرجہ ذیل امور سے متعلق ہوں گے۔

(1) رعایا کی جان، آبرو اور مال کے کامل تحفظ کی ضمانت۔

(2) محاصل کی وصولی کا ایک باقاعدہ نظام۔

(3) فوج کی بھرتی اور اس کی مدتِ ملازمت کی تعیین کے لیے بھی ایسا ہی باقاعدہ نظام۔

محاصل کی تشخیص کا انتظام نہایت درجہ اہم ہے کیوں کہ سلطنت کو اپنے علاقوں کی حفاظت کرنے میں مختلف اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں اور فوجوں نیز دوسری ملازمتوں کے لیے روپیہ کی ضرورت رہتی ہے، جس کے حاصل کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ رعایا پر چندے (ٹیکس) لگائے جائیں۔

اگرچہ خدا کی عنایت سے ہماری رعایا کچھ عرصہ سے اجاروں کی مصیبت سے نجات پا چکی ہے جن کو اب تک غلطی سے آمدنی کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا تھا، تاہم ایک مہلک دستور اب بھی جاری ہے جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ بھی نہیں یعنی وہ مراعات جو 'التزامات' کے نام سے مشہور ہیں۔

اس نظام کے تحت صوبہ کا ملکی اور مالی انتظام کسی ایک شخص کی مطلق العنانی کے سپرد کر دیا جاتا ہے جو بعض اوقات نہایت سخت گیر اور حریص ثابت ہوتا ہے کیوں کہ حاکم اگر نیک نہیں ہے تو وہ اپنے فائدے کے علاوہ کسی چیز کی پروا نہیں کرتا۔

لہٰذا ضروری ہے کہ آئندہ ملت عثمانیہ کے ہر فرد پر اتنا ہی محصول لگایا جائے جتنا اس کی حیثیت کے موافق ہو اور اس سے زیادہ کا مطالبہ اس سے نہ کیا جائے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ بری اور بحری فوجوں کے اخراجات کی تعیین خاص قوانین کے ذریعہ کر دی جائے، اگرچہ ملک کی حفاظت کا خیال سب پر مقدم ہے اور تمام باشندوں کا فرض ہے کہ اس مقصد کے لیے سپاہی فراہم کریں، تاہم ضروری ہے کہ وقت کی ضرورت کے لحاظ سے فوجی دستوں کے لیے جو ہر طبع مہیا کرے قوانین مقرر کر دئے جائیں، نیز فوجی سپاہیوں کی مدتِ ملازمت کم کر کے چار یا پانچ سال کر دی

جائے، کیوں کہ ضلع کی آبادی کا لحاظ کیے بغیر کسی ضلع سے زیادہ اور کسی سے کم سپاہیوں کا بھرتی کرنا ناانصافی کے علاوہ ملک کی زراعت اور صنعت و حرفت کو ایک مہلک صدمہ پہنچاتا ہے، اسی طرح سپاہیوں کو تمام عمر فوجی خدمت میں رکھنے کے لیے ان کے اندر مایوسی پیدا ہو جاتی ہے اور ملک کی آبادی بھی کم ہونے لگتی ہے۔

مختصر یہ کہ ان مختلف قوانین کے بغیر جن کی ضرورت تسلیم کر لی گئی ہے، سلطنت میں نہ قوت رہ سکتی ہے نہ دولت، نہ خوش حالی نہ امن، بر خلاف اس کے ان جدید قوانین کی موجودگی سے یہ تمام باتیں حاصل ہو سکتی ہیں۔

لہٰذا آئندہ ہر ملزم کے مقدمہ کی سماعت علانیہ طور پر ہمارے شرعی قانون کے مطابق ہوا کرے گی اور جب تک باضابطہ فیصلہ نہ سنا دیا جائے کسی شخص کو اختیار نہ ہو گا کہ دوسرے کو خفیہ طور پر یا علانیہ زہر دے کر یا کسی دوسرے طریقے سے مار ڈالے۔

کسی کو اجازت نہ ہو گی کہ وہ دوسرے کی آبرو پر حملہ کرے خواہ وہ کوئی بھی ہو، ہر شخص اپنے ہر قسم کے مال و اسباب پر قابض رہے گا اور پوری آزادی کے ساتھ اسے فروخت یا منتقل کر سکے گا کسی کو اس میں مزاحمت کا حق نہ ہو گا، مثلاً کسی مجرم کے بے گناہ ورثہ اپنے قانونی حقوق سے محروم نہ کیے جائیں گے اور نہ اس مجرم کا مال و اسباب ضبط کیا جائے گا۔

یہ مراعات ہماری تمام رعایا کے لیے خواہ وہ کسی مذہب یا فرقہ سے تعلق رکھتی ہو یکساں طور پر جاری ہوں گی اور وہ بلا استثنا ان سے مستفید ہو گی۔

پس جیسا کہ ہماری مقدس شریعت کے قانون کا تقاضا ہے سلطنت کے تمام باشندوں کو ان کی جان، آبرو اور مال کی نسبت ہماری طرف سے کامل ضمانت عطا کی جاتی ہے۔

دوسرے امور کے لیے چوں کہ ضروری ہے کہ اہل الرائے کے اتفاق سے طے کیے جائیں، اس لیے ہماری مجلس عدل (Council of Justice) جس میں متعین دنوں میں ہمارے وزرا اور اعیانِ سلطنت بھی شریک ہوا کریں گے، جان و مال کی حفاظت اور محاصل کی تشخیص کے متعلق بنیادی قوانین مرتب کرنے کی غرض سے منعقد ہوتی رہے گی، ان مجالس میں ہر شخص اپنے خیالات و آرا کا اظہار آزادی سے کرے گا۔

جو قوانین فوجی ملازمت سے متعلق ہوں گے ان پر مجلس حربی میں بحث ہو گی جس کا اجلاس سرعسکر کے محل میں ہوا کرے گا جس وقت کوئی قانون طے کر لیا جائے گا وہ فوراً ہمارے سامنے پیش کیا جائے گا اور اس غرض سے کہ وہ ہمیشہ کے لیے قائم اور قابل نفاذ ہو جائے ہم اس کی منظوری اپنے دستِ خاص سے اس کے اوپر لکھ دیں گے۔

چونکہ ان قوانین کا مقصد تمام تر مذہب، حکومت، قوم اور سلطنت کا احیا ہے، اس لیے ہم عہد کرتے ہیں کہ کوئی بات ایسی نہ کریں گے جو ان کے مخالف ہو۔

اپنے اس عہد کی ضمانت کے طور پر ہمارا ارادہ ہے کہ اس فرمان کو سلطنت کے تمام علما اور اعیان کی موجودگی میں اس ایوان میں رکھ

دینے کے بعد جس میں نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے تبرکات رکھے ہوئے ہیں قادر مطلق کے نام پر خود بھی اس کی پابندی کا حلف لیں اور علما و اعیان کو بھی اس کا حلف دلوائیں۔ اس کے بعد علما یا اعیان میں سے کوئی شخص یا کوئی اور جو بھی ان قوانین کی خلاف ورزی کرنے گا اسے بلا لحاظ اس کے رتبہ یا شہرت کے وہ سزا دی جائے گی جو جرم کے ثابت ہونے کی حالت میں مقرر رہے، اس کے لیے تعزیری قوانین کا ایک مجموعہ منضبط کیا جائے گا۔

چونکہ آج سے سلطنت کے تمام عہدہ داران کو معقول تنخواہیں دی جائیں گی اور جن لوگوں کی خدمات کا معاوضہ اس وقت کافی نہیں ملتا انہیں بھی ترقی دے دی جائے گی، اس لیے رشوت ستانی کے خلاف جس کی ممانعت قوانین الٰہی میں آئی ہے اور جو زوالِ سلطنت کے خاص اسباب میں سے ایک سبب ہے، سخت قانون نافذ کیا جائے گا۔

ان قوانین سے چونکہ قدیم دستوروں کی مکمل تجدید ہوتی ہے اور وہ بالکل بدل جاتے ہیں، اس لیے یہ فرمانِ سلطانی قسطنطنیہ اور ہماری سلطنت کے تمام شہروں میں شائع کر دیا جائے گا اور حلیف طاقتوں کے تمام سفیروں کو جو قسطنطنیہ میں مقیم ہیں اس کی نقلیں باضابطہ طور پر بھیج دی جائیں گی تاکہ وہ ان قوانین کی مراعات کے شاہد رہیں جو خدا کے فضل و کرم سے ہمیشہ قائم رہیں گی۔

خدائے قدیر ہم سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے جو لوگ ان قوانین کے خلاف کوئی بات کریں ان پر عذابِ الٰہی نازل ہو اور وہ ہر قسم کی خوشی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائیں۔ "

8.7 دستور ثانی 1856ء

21/ فروری 1856ء کو سلطان عبد المجید نے حکومت عثمانیہ کے دوسرے اہم دستور کا اعلان کیا، اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

"تمام رعایا کی جان و مال اور عزت و آبرو کی ضمانت جو "خط شریف گلخانہ" (اصلاحات) میں کی گئی ہے اس کی توثیق کی جاتی ہے، اس باب میں رعایا کے مراتب و مذاہب میں کسی قسم کا امتیاز جائز نہ ہو گا۔

ان تمام حقوق و مراعات کی جو نصاریٰ اور سلطنت کے دوسرے فرقوں کو دئے گئے ہیں از سرِ نو توثیق کی جاتی ہے، ان حقوق و مراعات پر بلا تاخیر نظر ثانی کر کے زمانہ اور سوسائٹی کی ضروریات کے مطابق انہیں ترقی دی جائے گی اور اس غرض سے بطریق کے زیر صدارت ایک مجلس منعقد کی جائے گی، جو مذکورہ بالا اصلاحات پر بحث کر کے اپنی رائے باب عالی میں پیش کرے گی، سلطان محمد فاتح اور اس کے جانشینوں نے جو حقوق بطریق کو عطا کیے تھے ان میں اس جدید حق کا اضافہ کیا جائے گا اور آئندہ بطریق کا انتخاب تمام عمر کے لیے ہوا کرے گا۔

نصاریٰ اور دوسرے فرقوں کے بطریقوں، اسقفوں اور مذہبی عہدہ داروں کو باب عالی کے تجویز کردہ طریقہ کے مطابق وفاداری کا حلف لینا پڑے گا۔

وہ تمام محصول اور چندے جو مختلف فرقوں کے پادری اپنی جماعتوں سے وصول کیا کرتے تھے ممنوع قرار دئے جاتے ہیں، مقررہ

تنخواہیں، بطریقوں، اسقفوں اور تمام چھوٹے بڑے مذہبی عہدہ داروں کو ان کے مراتب اور خدمات کے لحاظ سے دی جائیں گی، پادریوں کی منقولہ یا غیر منقولہ جائداد سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔

موجودہ کلیساؤں، مدرسوں، ہسپتالوں اور قبرستانوں کی مرمت کی عام اجازت ہے لیکن اگر کسی جدید کلیسا، مدرسہ، قبرستان یا ہسپتال کے تعمیر کرنے کی ضرورت ہوگی اور بطریق یا اس فرقہ کا مذہبی پیشوا اسے منظور کرے گا تو ہر جدید تعمیر کا نقشہ باب عالی میں پیش کیا جائے گا، اگر کوئی وجہ مانع نہ ہوگی تو سلطان نقشہ کو ملاحظہ فرما کر تعمیر کی منظوری خود صادر فرمائے گا۔

ہر فرقہ کو اپنے مذہبی فرائض کی ادائیگی کی پوری آزادی حاصل ہوگی۔

وہ تمام القاب وامتیازات جن سے رعایا کے بعض طبقے اعلیٰ اور بعض ادنیٰ شمار ہوتے ہیں ہمیشہ کے لیے شاہی دفتر سے خارج کیے جاتے ہیں، اسی طرح عہدہ داروں اور عام لوگوں کو بھی دل آزار اور اہانت آمیز کلمات کے استعمال سے سختی سے روکا جاتا ہے، اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والے سزا کے مستوجب ہوں گے۔

چونکہ تمام مذاہب کو آزادی حاصل ہے، اس لیے کوئی شخص اپنے مذہب کی وجہ سے ستایا نہ جائے گا اور نہ کسی کو اپنا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔

ملکی اور فوجی عہدے تمام رعایا کے لیے یکساں طور پر کھلے رہیں گے، تقرر صرف قواعد وضوابط کے مطابق اور قابلیت کی بنا پر ہوگا۔
ہر فرقہ کو علوم وفنون کے مدارس قایم کرنے کی اجازت ہے، البتہ نصاب تعلیم اور اساتذہ کا انتخاب ایک مخلوط مجلس کے زیر نگرانی ہوگا جو باب عالی کی طرف سے مقرر کی جائے گی۔

وہ تمام مقدمات جن کا تعلق تجارت یا فوجداری سے ہوگا اور جن میں فریقین مختلف فرقوں کے ہوں گے مخلوط عدالتوں میں پیش کیے جائیں گے اور ان کا اجلاس بر سر عام ہوا کرے گا، صوبوں اور سنجقوں کے دیوانی کے مقدمات بھی مخلوط عدالتوں میں وکیل اور قاضی کی موجودگی میں پیش ہوں گے اور ان عدالتوں کا اجلاس بھی بر سرِ عام ہوگا۔

جن مقدمات میں فریقین ایک ہی فرقہ کے ہوں گے یا جو مقدمات عدالت سے متعلق ہونگے وہ فریقین کی خواہش کے مطابق یا ان کے بطریق کے سامنے پیش ہوں گے یا ان کی قومی مجلس کے۔

ایک ضابطہ تجارت وضابطہ فوجداری نیز وہ تمام قواعد وضوابط جو مخلوط عدالتوں سے متعلق ہیں حتی الامکان جلد از جلد شائع کر دئے جائیں گے اور سلطنت عثمانیہ میں جتنی زبانیں مستعمل ہیں ان سب میں ان کا ترجمہ کر دیا جائے گا۔

قید خانوں اور حوالاتوں کی اصلاح کی جائے گی اور معمولی جرائم کے مجرموں کے لیے نئے ضابطے مرتب کیے جائیں گے، علاوہ ان سزاؤں کے جو باب عالی کے ضابطہ پولیس کے رو سے مقرر ہوں گی اور تمام ایذائیں یک قلم منسوخ کی جاتی ہیں، اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزا دی جائے گی۔

چونکہ محصولوں کے عاید کرنے میں مساوات برتی جائے گی، اس لیے انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کی طرح عیسائی اور دوسرے فرقہ کے لوگ بھی فوج میں داخل ہوں لیکن انہیں فوجی خدمات کے معاوضہ میں نقد رقم پیش کرنے کی اجازت بھی حاصل رہے گی۔

مسلمانوں کے علاوہ دوسرے فرقوں کو بھی فوج میں بھرتی کرنے کے ضوابط مرتب کر کے جلد شائع کر دئے جائیں گے۔

صوبوں کی مجلسوں میں اصلاح کی جائے گی تاکہ انتخابات بہتر طریقہ پر ہو سکیں اور باشندوں کی آزاد اور صحیح رائے معلوم ہو سکے۔

چونکہ تجارتی معاملات اور غیر منقولہ جائدادوں کے قوانین تمام رعایا کے لیے یکساں ہیں اس لیے باب عالی جب غیر حکومتوں سے کوئی ایسا معاملہ کرے گا جس کے رو سے غیر ملکی باشندوں کو سلطنت کے ان قوانین کو تسلیم کر کے اسی حساب سے محصول ادا کرنا ضروری ہوگا جس حساب سے ملکی باشندے ادا کرتے ہیں تو ایسی صورت میں غیر منقولہ جائیدادوں کی ملکیت حاصل کرنے کا حق بھی غیر ملکی باشندوں کو عطا کیا جائے گا۔

ٹھیکہ داروں کی وساطت سے عشر اور دوسرے محصولوں کے وصول کرنے کا جو طریقہ اب تک رائج تھا وہ موقوف کیا جاتا ہے، آئندہ جہاں تک ممکن ہوگا حکومت کے عہدہ دار براہِ راست وصول کیا کریں گے۔

مقامی محصولوں کی تشخیص حتی الامکان اس طرح کی جائے گی کہ پیداوار اور تجارت کی ترقی کو نقصان نہ پہنچے۔

صوبوں میں محصول ان امور کے لیے عاید کیے جائیں گے جو سب کے لیے مفید ہوں مثلاً سڑکوں کی تعمیر جو اندرون ملک کے علاوہ سمندر کے ساحل تک چلی جائیں گی۔

ہر عہدہ دار کی تنخواہ متعین کر دی جائے گی۔ عیسائی اور دوسرے فرقوں کے معاملات کی نگرانی کے لیے ایک ایک افسر مقرر ہوگا جو اپنے مشوروں سے اسٹیٹ کونسل کو مدد دے گا، یہ افسر صدر اعظم کی مجلس وزرا میں سے منتخب کیے جائیں گے اور ان کا تقرر ایک سال کے لیے ہوا کرے گا۔

اسٹیٹ کونسل کے ممبروں کو معمولی اور غیر معمولی اجلاسوں میں اپنی رائے آزادانہ طور پر ظاہر کرنے کی اجازت ہوگی اور ان پر اس کے خلاف کسی قسم کا دباؤ نہ ڈالا جائے گا۔

رشوت ستانی کے قوانین بلا امتیاز تمام رعایا کے لیے یکساں طور پر نافذ ہوں گے، خواہ اس کے مجرم کسی طبقہ یا رتبہ کے اشخاص ہوں۔

باب عالی مالی اعتبار کے قایم کرنے میں حتی الامکان پوری کوشش کرے گا اور جن چیزوں سے اس اعتبار کو تقویت ہوتی ہے مثلاً بنک وغیرہ ان کو فروغ دے گا اور ان کے لیے ضروری سرمایہ فراہم کرے گا۔

باب عالی ملکی پیداوار کے نقل و حمل کے لیے سڑکیں اور نہریں تعمیر کرائے گا اور تمام رکاوٹوں کو دور کر کے زراعت کی ترقی میں آسانیاں بہم پہنچائے گا۔ "

8.8 بیرونی مداخلت

ان اصلاحات پر ایک نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اگر انہیں عملی جامہ پہنا دیا گیا ہوتا اور بعد کے حکمرانوں کی آمرانہ روش اور بیرونی مداخلتیں آڑے نہیں آتیں تو سلطنت عثمانیہ کا زوال شاید ٹل جاتا۔ تنظیمات کے نام سے عثمانی سلطنت کے زوال کو روکنے کے لیے جو کوششیں ہوئیں ان میں سلطان محمود ثانی اور سلطان عبد الحمید خاں کا کردار بہر حال سب سے اہم ہے، تاہم ان اصلاحات کے پیچھے جو دماغ کار فرما تھے اور جنہوں نے سلطنت عثمانیہ کے ڈوبتے ہوئے بیڑے کو بچانے کے لیے اپنی تمام تر ذہنی و دماغی صلاحیتیں استعمال کر کے پورے پروگرام کو تیار کیا ان میں اس دور کی عثمانی حکومت کے چار عالی مرتبت وزراء اعظم مصطفی رشید پاشا(1800ء تا1858ء) جس نے، 3/نومبر 1839ء کو اصلاحات کا اعلان کیا، فواد پاشا(1815ء تا1829ء)، عالی پاشا(1815ء تا 1871ء) اور مدحت پاشا(1820ء تا1883ء) کے نام سب سے اہم اور نمایاں ہیں۔ بد قسمتی یہ رہی کہ ان حکمرانوں کے بعد جو لوگ ان کے جانشین ہوئے انہوں نے حکومت کا آمرانہ طریقہ اختیار کیا۔ دوسری طرف بیرونی طاقتوں نے مختلف طریقوں سے سلطنت عثمانیہ کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی۔ انہوں نے مرکز گریز طاقتوں کی حوصلہ افزائی کی اور عثمانی سلطنت کے علاقوں کو اپنے درمیان بانٹ لینے کے لیے سازشیں بھی کیں۔ جس کی وجہ سے اصلاحات کا پروگرام کامیاب نہیں ہو پایا اور عثمانی حکومت کے زوال کو نہیں روکا جا سکا۔

8.9 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- خلاصہ یہ کہ دیگر خاندانی حکومتوں کی طرح عثمانی حکومت بھی ایک خاندانی اور موروثی حکومت تھی۔ اور موروثی حکومتوں کی تمام خرابیاں جو کسی بھی دوسری حکومت میں ہو سکتی ہیں عثمانیوں کے حصے میں آئیں۔ اور یہی خرابیاں اس حکومت کے انحطاط و زوال کا بنیادی سبب بھی بنیں۔
- جب عثمانی حکمرانوں نے مشورے کی اہمیت کو نظر انداز کرنا شروع کیا، اعلیٰ عہدوں پر نااہلوں کا تقرر کرنے لگے، مملکت کے امور میں حرم کی خواتین کو بے جا دخل اندازی کا موقع فراہم کیا گیا، فوج سرکش ہو گئی، جانشین ناکارہ ہونے لگے اور مذہبی علماء کی قیادت بھی جمود کا شکار ہو گئی تو عثمانی حکومت کے لیے زوال اس کا ایک طرح سے مقدر بن گیا۔
- البتہ عثمانی چوں کہ اپنے زمانے کے اعتبار سے ایک بہترین نظام حکومت کے وارث تھے، شجاعت و بہادری ان کو ورثے میں ملی تھی، عہد زوال میں بھی عہد عروج کے بہت سارے ادارے نہ صرف قائم تھے بلکہ وہ اپنا کردار بھی ادا کرتے رہے، اس لیے ان کا زاول اچانک عمل میں نہیں آیا بلکہ زوال کی رفتار کافی سست رہی، جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ عہد زوال کے دوران بھی عثمانی خاندان میں متعدد ایسے حکمراں پیدا ہوئے جو انتہائی قابل اور باصلاحیت تھے۔ انہوں نے اپنی کوششوں سے عثمانی حکومت کے زوال پر روک لگانے کی کوشش کی، لیکن اندرونی اور بیرونی مختلف وجوہ سے وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکے اور بالآخر بیسویں صدی کی

تیسری دہائی میں عثمانی حکومت کا پوری طرح زوال ہو گیا۔

8.10 نمونہ امتحانی سوالات

8.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. وزیر اعظم مصطفیٰ رشید پاشا نے اصلاحات کا اعلان کب کیا؟

(a).1839ء (b).1924ء (c).1453ء (d).1856ء

2. سلطان عبدالمجید نے دوسرے اہم دستور کا اعلان کب کیا گیا؟

(a).1856ء (b).1839ء (c).1924ء (d).سب غلط

3. عثمانی حکومت کے زوال کو روکنے کی کوشش میں کس کی خدمات اہم ہیں؟

(a). محمود ثانی (b).عبدالمجید ثانی (c). محمد چہارم (d). محمد وحید الدین

4. سلطان کی مجلس دیوان سے علیحدگی کس کے عہد میں ہوئی؟

(a). محمد فاتح (b). سلیمان اعظم (c).بایزید یلدرم (d).اور خان

5. ولی عہدی کے طریقہ میں کب تبدیلی آئی؟

(a).1617ء (b).1839ء (c).1924ء (d).1453ء

8.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. سلطان کی مجلس دیوان سے علیحدگی عثمانی سلطنت کے لیے کتنی مضر ثابت ہوئی۔ بیان کیجیے۔
2. امور مملکت میں حرم کی دخل اندازی کس طرح عثمانی حکومت کے زوال میں معاون ہوئے۔ واضح کیجیے۔
3. عثمانی حکومت میں رشوت ستانی کی گرم بازاری پر روشنی ڈالیے۔
4. وزراء اور امراء کی شاہانہ زندگی کا نقشہ کھینچیے۔
5. عثمانی شہزادوں کی محل تک تحدید سے سلطنت پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔ قلم بند کیجیے

8.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. عثمانی حکومت کے اسباب زوال میں سے تین اسباب پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔
2. عثمانی حکومت کے زوال کو روکنے کی کوششوں پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. تنظیمات خیریہ کے نام سے عثمانی اصلاحات کے پروگرام کی بعض اہم دفعات پر روشنی ڈالیے۔

8.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

.1	ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ (جلد دوم)	:	ثروت صولت، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی
.2	آل عثمان	:	مولانا اسلم جیراج پوری، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی
.3	دولت عثمانیہ (جلد اول، دوم)	:	ڈاکٹر محمد عزیر، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
.4	تاریخ ملت (جلد سوم)	:	مفتی زین العابدین سجاد میرٹھی و مفتی انتظام اللہ شہابی، ادارہ اسلامیات، کراچی، پاکستان
.5	مسلمانوں کا عروج اور زوال	:	مولانا سعید احمد ایم اے۔ فیمس بکس، لاہور
.6	ترکی میں مشرق و مغرب کی کش مکش	:	خالدہ ادیب خانم (اردو ترجمہ، ڈاکٹر عابد حسین)
.7	اردو دائرہ معارف اسلامیہ، (متعلقہ مضامین)	:	دانش گاہ پنجاب، لاہور

اکائی 9: سلجوقی حکومت کا قیام واستحکام

اکائی کے اجزا:

9.0 تمہید
9.1 مقاصد
9.2 سلاجِقہ
9.3 سلجوقی خاندان کی ابتدائی تاریخ
9.3.1 اولادِ سلجوق
9.3.2 سلطان طُغرِل بیگ
9.3.3 سلطان اَلپ اَرسلان
9.3.4 سلطان جلال الدین ملک شاہ
9.3.5 نظام الملک حسن بن علی طوسی
9.3.6 مدرسہ نظامیہ، بغداد
9.3.7 سلجوقی دور کے عباسی خلفاء
9.3.8 سلجوقی سلطنت مابعدِ تقسیم
9.3.9 سلجوقیانِ اعظم
9.3.10 سلاجقۂ عراق
9.3.11 سلاجقہ کِرمان (جنوبی فارس)
9.3.12 سلاجقۂ شام
9.3.13 سلاجقۂ روم (اناطولیہ)
9.3.14 اتابکین سلاجقہ

9.4 اکتسابی نتائج

9.5 نمونہ امتحانی سوالات

9.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

9.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

9.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

9.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

9.0 تمہید

اس اکائی میں دیلم اور بویہ کی اصلیت، بانیانِ سلطنتِ بویہ اور ان کی حکومت کی تفصیلات زیر بحث آئیں گی۔ آلِ بویہ، دیالمۂ فارس، دیالمۂ رے اور دیالمۂ عراق کیوں کر کہلائے، نیز اس میں بویہیوں کے اقتدار کے عملی پہلو کا بھی جائزہ لیا جائے گا، اس میں بتایا جائے گا کہ آلِ بویہ بالخصوص عضد الدولہ اور اس کے بیٹے شرف الدولہ کے عہد میں علمی، فنی اور تہذیبی سرگرمیوں نے کس طرح فروغ پایا۔ اسی طرح اس اکائی میں سلطنتِ سلجوقیہ پر بھی روشنی ڈالی جائے گی، اس میں یہ بھی جائزہ لیا جائے گا کہ سلجوقیوں کی تاریخ کیا ہے، سلجوقی نو مسلموں نے سیاسی اسلام کے تحفظ کے لئے کس طرح صحرا نوردی اور آبلہ پائی کی، سلجوقیانِ اعظم کے بعد یہ سلطنت سلجوقی خاندان میں کس طرح تقسیم ہو گئی، پھر تقسیم کے کیا نتائج بر آمد ہوئے۔

9.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ یہ جان سکیں کہ سلاجقہ کون تھے، طغرل بیگ، الپ شاہ ارسلان، ملک شاہ اور نظام الملک طوسی کے علاوہ دیگر حکمرانوں نے سلجوقی حکومت کو کس طرح پروان چڑھایا اور سلاجقہ عراق، کرمان، شام اور روم میں کیسے پہنچے۔ ان سب پر آپ کو آگاہی حاصل ہو گی۔

9.2 سلاجقہ

سلاجقہ، نسلاً اوغوز ترکوں کے ایک شاہی مسلم سنّی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے گیارہویں صدی عیسوی سے لے کر تیرہویں صدی عیسوی تک ایشیائے وسطیٰ اور ایشیائے کوچک (روم) کے وسیع خطوں پر حکومت کی۔ غزنوی سلطنت کے انتشار کی بنیاد پر سلجوقی ترکوں نے اپنی سلطنت قائم کی، خراسان میں اپنی سلطنت مستحکم کرنے کے بعد انہوں نے دھیرے دھیرے مغرب کی طرف بڑھنا شروع کیا اور ایران و عراقِ عجم و عرب پر قبضہ کر کے اپنی فرمانروائی قائم کر دی۔ ان کے دورِ اقتدار میں یوں تو چھ عباسی خلفاء ہوئے، لیکن ان

میں دو خلیفہ اول و آخر پہلے اور آخری دور میں مشترک ہیں، ان خلفاء کے نام یہ ہیں: قائم، مقتدی، مستظہر، مسترشد، راشد اور مقتفی۔

سلجوقی سلطنت دولتِ عباسیہ کے خاتمے کے بعد عالم اسلام کو ایک مرکز پر جمع کرنے والی آخری حکومت تھی۔ اس کی سرحدیں ایک جانب چین سے لے کر بحرِ متوسط (Mediterranean Sea) اور دوسری جانب عدن سے لیکر خوارزم و بخارا تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کا عہد تاریخ اسلام کا آخری عہدِ زریں کہلا سکتا ہے، اسی لئے سلاجقہ کو اسلامی تاریخ میں خاص درجہ و مقام حاصل ہے۔ زوالِ سلاجقہ کے ساتھ امت مسلمہ سیاسی انتشار سے دوچار ہوئی۔ اہالیانِ یورپ نے مسلمانوں پر صلیبی جنگیں مسلط کیں اور بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ سلاجقہ کے مندرجہ ذیل خاندان خاص طور پر ممتاز ہیں: (1) سلجوقیانِ اعظم (2) سلجوقیانِ عراق (3) سلجوقیانِ کرمان (4) سلجوقیانِ شام (5) سلجوقیانِ ایشیائے کوچک (روم)۔

9.3 سلجوقی خاندان کی ابتدائی تاریخ

سلجوقیوں کی نئی طاقت کا ظہور عباسی خلیفہ قادر باللہ ہی کے زمانہ میں ہو چکا تھا، لیکن اس وقت ان کی حیثیت خانہ بدوش قبائل سے زیادہ نہیں تھی۔ البتہ عباسی خلیفہ قائم بامر اللہ کے زمانہ میں انہوں نے ایک منظم طاقت کی حیثیت حاصل کر لی۔ سلجوق نسلاً ترک تھے۔ ان کا آبائی وطن ترکستان اور چین کا درمیانی علاقہ تھا۔ سلجوقی قبائل کی تعداد ہزاروں نفوس پر مشتمل تھی۔ ترکستان کی غیر مسلم حکومت میں ان کے سردار دُقاق یا تُقاق کو بڑی قدر و منزلت حاصل تھی، بیغو فرمانروائے ترک اسے بہت مانتا تھا۔ دُقاق کو بڑا ہونہار سلجوق نامی لڑکا پیدا ہوا۔ بیغو نے سلجوق کی صلاحیتوں اور کارناموں کے سبب اسے سپہ سالار بنایا، سارے ترک اس کے مطیع ہو گئے۔ اس کے اثر و رسوخ کو دیکھ کر بیغو کی ملکہ نے اپنے شوہر کو اس کے قتل پر آمادہ کیا، ملکہ کی مخالفت کو دیکھ کر 362ھ / 972ء میں سلجوق اپنے زیرِ اثر ترکمان قبائل کو لے کر ترکستان سے ترک وطن کر کے ماوراء النہر کے علاقہ بخارا کے قریب اسلامی قلمرو جُند میں قیام پذیر ہوا، وہاں ان لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ قبولِ اسلام کے بعد سلجوقی ایک منظم قوت بن گئے اور ماوراء النہر کے ان سرحدی مقامات پر جو بیغو کے قبضہ میں تھے اور جہاں کے مسلمانوں سے وہ خراج وصول کیا کرتا تھا، قبضہ کر لیا۔

9.3.1 اولادِ سلجوق

سلجوق (وفات بعمر 107 برس) کے چار لڑکے ارسلان (یا اسرائیل)، میکائیل، یونس اور موسی تھے۔ ان سب سے نسل چلی، یونس اور موسی کی اولاد نے تاریخ میں اپنی کوئی یادگار نہیں چھوڑی۔ البتہ میکائیل اور ارسلان کی اولاد نے بڑی عظمت و ناموری حاصل کی۔ ایران اور عراق کے سلجوقی فرمانروا میکائیل کی نسل سے تھے۔ ارسلان کی اولاد نے ایشیائے کوچک (روم) میں اپنی حکومت قائم کی، ترکانِ عثمانی ان ہی کی یادگار تھے۔

سلجوق کی موت کے بعد اس کے چاروں لڑکے ماوراء النہر کے نور بخارا، سغد اور سمرقند کے مرغزاروں جیسے مختلف حصوں میں پھیل گئے، ارسلان اپنے قبیلہ کے ساتھ بخارا کے قریب مقیم ہوا اور ایلک خانی اور غزنوی حکومت کی سرحدوں پر تاخت شروع کر دی۔ ایلک کے

بھڑ کانے سے محمود غزنوی نے ارسلان کو عہدِ بھائی چارہ کے بہانہ سے بلا کر قید کر لیا اور اسے ملتان کے قریب ہندوستان کے کالنجر کے قلعہ میں نظر بند کر دیا، اس کے قبیلہ کو قتل و قید کر کے مختلف سمتوں میں منتشر کر دیا۔ ارسلان سات برس تک محمود کی قید میں رہ کر یا تو قید ہی میں مر گیا یا دو ترکمانی کی مدد سے بھاگنے کے بعد مرا۔ ارسلان کی موت کے بعد محمود غزنوی نے سلجوقیوں کو خراسان کے حدود میں پُرامن اور خموش قیام کی اجازت دے دی۔

9.3.2 سلطان طُغرِل بیگ

میکائیل نے غیر مسلم ترکوں کے ساتھ مقابلہ میں شہادت پائی۔ اس کے تین نامور لڑکے طغرل بیگ محمد، چغری بیگ داؤد اور بیغو تھے۔ طغرل بیگ محمد اپنے بھائی چغری بیگ داؤد کے ساتھ خراسان پہنچ گیا، پہلے غزنوی فرمانرواؤں کی ملازمت اختیار کی، پھر جب ان کی حکومت کمزور ہونے لگی تو طغرل اور اس کے بھائی داؤد کی زیر قیادت سلجوقیوں نے غزنوی سلطنت سے علیحدگی اختیار کرنے کی کوشش کی۔ ابتداء میں سلجوقیوں کو محمود غزنوی کے ہاتھوں شکست ہوئی اور وہ خوارزم تک محدود ہو گئے۔ لیکن طغرل اور چغری داؤد کی زیرِ قیادت انہوں نے 421ھ / 1028ء اور 422ھ / 1029ء میں مرو اور نیشاپور پر قبضہ کر لیا، غزنویوں کے ساتھ مسلسل جنگ کے تین سال بعد پورے خراسان پر جس کا پایۂ تخت علم و علماء کا شہر نیشاپور تھا، اپنے پنجے گاڑ دئے اور وہاں خود اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا، اور بغداد میں عباسی خلیفہ قائم بامر اللہ سے سندِ تصدیق چاہی۔ اس نے طغرل بیگ کے موقف کی تائید کی، پھر وہ بلخ، جرجان، طبرستان، خوارزم، ہمدان، ریؔ اور اصفہان کے بھی مالک بن بیٹھے۔ 428ھ / 1037ء میں غزنی پر حملہ کیا، 430ھ / 1039ء میں جنگ دندانیقان میں انہوں نے غزنوی سلطنت کے بادشاہ مسعود اول کو شکست دے دی اور مسعود سلطنت کے تمام مغربی حصے سلجوقیوں کے ہاتھوں گنوا بیٹھا۔ طغرل بیگ نے شمال مشرقی اور مغربی ایران کے علاوہ ایران اور عراق کے مابین پہاڑی گذر گاہوں کے بشمول دیگر بعض اہم ممالک پر قبضہ کر لیا۔ چنانچہ اب بلاد الجبل، تبریز، حلوان اور شیراز بھی اس کے زیر تسلط آ گئے۔ 447ھ / 18 / دسمبر 1055ء کو طغرل بغداد کے دروازے پر اپنے ترکمانوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا، ان کو دیکھ کر بویہ قیادت کے عہد کا ترکی سپہ سالار اور بغداد کا فوجی گورنر بساسیری بھاگ گیا۔ خلیفہ قائم (468ھ 423ھ- / 1031-1075-ء) نے طغرل اور اس کی فوج کا خیر مقدم کیا۔ طغرل نے بغداد کے اپنے اس دورے میں ملک الرحیم دیلمی بویہی کا استیصال کیا اور بغداد سے بنی بویہ کی سلطنت کی بیخ کنی کی۔

الغرض طغرل بیگ نے غزنوی اور بویہی سلطنتوں کو بے دخل کر کے مشرق اسلامی میں اپنی وسیع حکومت قائم کی۔ طغرل بک کی فتوحات سے حوصلہ پا کر عباسی خلیفہ نے اسے بغداد بلایا اور مشرق و مغرب کے شہنشاہ کے لقب سے نوازا، بغداد اور بیرونِ بغداد میں اس کے نام کا خطبہ جاری کیا اور سکہ پر اس کا نام کندہ کروایا۔

مشرقی مسلم ممالک کی تاریخ میں طغرل (455ھ 428-ھ / 1063-1037ء)، اس کے بھتیجے الپ ارسلان (465ھ 455-ھ / 1072ء 1063-ء) اور الپ ارسلان کے بیٹے جلال الدین ملک شاہ (485ھ 465-ھ / 1092ء-1072-ء) کی حکومتوں کا زمانہ نہایت درخشاں ہے۔ ان نو مسلموں نے مسلمانوں کو از سر نو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کر کے مغربی ایشیاء میں پھر سے مسلم قیادت منوائی۔

طغرل نے 455ھ / 1063ء میں بعمر ستّر سال انتقال کیا۔ اس کا پایۂ تخت مرو تھا۔ مدتِ حکومت 26 سال اور خلافتِ بغداد کی تولیت کی مدت 8 سال تھی۔ اس نے ایک ایسے خاندان کی بنیاد ڈالی جو عظمت و ہیبت کے علاوہ علم دوست اور عمدہ اوصاف کے لئے آج تک چار دانگ عالم میں مشہور ہے۔ اس نے تمام مفتوحہ ملکوں کو اپنے بھائی بھتیجوں میں تقسیم کر دیا۔ وہ ایک راسخ العقیدہ، دیندار، پاکباز اور متقی فرمانروا تھا۔

9.3.3 سلطان اَلپ اَرسلان

طغرل خود لا ولد تھا۔ اپنے بھتیجے سلیمان بن داؤد کو اپنا جانشیں بنا گیا تھا۔ چنانچہ وہ تخت نشیں بھی ہوا، لیکن والیٔ قونیہ قتلمش بن اسرائیل بعض دیگر امراء اور پھر طغرل کے وزیر عمید الملک کندری کے اختلاف کے بعد الپ ارسلان (اپنے چچا طغرل بیگ کے بعد) سلجوقی سلطنت کے تخت پر بیٹھا۔

الپ ارسلان بڑا اولوالعزم، حوصلہ مند، بیدار مغز اور بہادر حکمراں تھا۔ فتح و نصرت اس کے ہم رکاب تھی، کسی مہم میں ناکام نہیں رہا۔ اپنے زمانہ میں اس نے ایران کی سلجوقی حکومت کو مشرق کا امپائر بنا دیا۔ اس کی حکومت کا ایک سرا ترکستان سے ملتا تھا اور دوسرا سرا شام سے۔ مشہور مدبر و عالم نظام الملک حسن طوسی کو اپنے باپ چغری بیگ کی سفارش پر وزیرِ سلطنت مقرر کیا، اس کے وقت میں نیشا پور رشکِ بغداد بن گیا۔ اس میں شمشیرِ ترکی کے ساتھ حکمتِ نظام الملکی ایک قابل لحاظ شئے تھی۔ الپ ارسلان کے دو کارنامے زیادہ اہم اور قابل ذکر ہیں، ایک حکومتِ قسطنطنیہ کے خطرہ کا انسداد اور دوسرے حرمین میں فاطمیوں کے بجائے عباسی خطبہ کا اجراء۔

اَلپ اَرسلان نے سلطنت کی توسیع کے ساتھ اسے انتظامی اور تمدنی حیثیت سے بھی ترقی دی، امن و امان قائم کیا۔ وہ فطری طور پر نہایت نرم دل، غریب پرور، علم و فن کا قدرداں اور سرپرست تھا۔ 459ھ / 1067ء میں بغداد میں زائد خرچ سے مدرسہ نظامیہ قائم کرنے کے علاوہ ایک دوسرا عظیم الشان مدرسہ قائم کیا تھا۔ اس کا دار الحکومت اِصفہان تھا۔

خوارزمی گورنر یوسف الخوارزمی، خوارزمی ترکوں کے خلاف سلجوقیوں کی ایک مہم میں قیدی بنا کر اَلپ اَرسلان کے پاس لایا گیا، اس نے اَلپ ارسلان پر اپنی تلوار سے حملہ کیا، اس حملہ میں الپ ارسلان شدید زخمی ہوا اور 4 دن بعد 25 / نومبر 1072ء / 465ھ کو محض 42 سال کی عمر میں انتقال کر گیا۔ اسے مرو میں اس کے والد چغری بیگ کی قبر کے برابر میں دفن کیا گیا۔

مؤرخینِ اسلام نے سلطان اَلپ ارسلان کے عہد کو اسلام کا دورِ ترقی و عروج کہا ہے۔

9.3.4 سلطان جلال الدین ملک شاہ

اَلپ ارسلان نے اپنی زندگی ہی میں ملک شاہ اول کو ولی عہد (Crown Prince) بنا دیا تھا، چنانچہ اس کی وفات کے بعد ربیع الاول 465ھ / 1072ء میں وہ تخت نشیں ہوا، عباسی خلیفہ قائم نے بھی اس کی تصدیق کر دی، تخت نشینی کے بعد اس نے نظام الملک طوسی کو اتابک اور عماد الدولہ کا لقب عطا کر کے سلطنت کا مختارِ کل بنا دیا۔ ملک شاہ اول (وفات 485ھ / 1092ء) اور اس کے دو ایرانی وزراء نظام

الملک طوسی(وفات 485ھ /1092ء)اور تاج الملک کی زیر قیادت سلجوقی سلطنت اپنے عروج پر پہنچ گئی، جس کی مشرقی سرحدیں چین اور مغربی سرحدیں بازنطینی سلطنت سے جا ملی تھیں، یعنی اس کی حکومت کاشغر سے یروشلم تک اور قسطنطنیہ سے بحرِ خزر / بحرِ قزوین (Caspean Sea)تک قائم تھی۔ ملک شاہ نے دار الحکومت رے(مرو) سے اِصفہان منتقل کیا۔ اسی عہد میں نظام الملک نے بغداد میں مدرسہ نظامیہ قائم کیا، جس میں ابو الفرج ابن الجوزی اور ابو الحامد غزالی جیسے اساطینِ علم و فن درس دیا کرتے تھے۔

ملک شاہ بڑا روشن خیال تھا۔ رفاہِ عام پر اس نے کافی رقم خرچ کی، سڑکیں اور مسجدیں بنوائیں، نہریں صاف کروائیں، شہروں کی دیواریں مرمت کی گئیں، حج کے راستوں پر کارواں سرائیں تیار کرائی گئیں۔ اس کے عہدِ حکومت میں ملک خوش حال اور پُر امن تھا۔ بغداد کے حماموں کا گندہ پانی بجائے دجلہ میں گرنے دئے جانے کے خاص موریوں کے ذریعہ باہر منتقل کیا جاتا تھا۔ وہ خود بھی صاحبِ علم اور علم و فن اور اہلِ علم وارباب کمال کا قدرداں تھا۔ اس نے سلجوقی حکومت کے جغرافیہ پر خود ایک رسالہ لکھا تھا۔

عمر خیّام نیشاپوری جو رباعیات کی وجہ سے مشہور ہے، مگر وہ نجوم و ہیئت (یعنی فلکیات) کا بڑا ماہر تھا۔ اسے بلند پایہ ہیئت دانوں اور علمِ نجوم کے ماہرین میں مقامِ بلند حاصل تھا۔ اس نے شمسی اور قمری تقویموں (کیلنڈرس) میں اصلاح کی، ان میں ہم آہنگی کے طریقے ایجاد کئے، موسمیات پر تحقیقات پیش کیں اور لوند سال (Leap Year) کا جدید طریقہ نکالا اور سال کے دنوں کی صحیح تعداد مقرر کی۔ 468ھ -467ھ / 1075ء-1074ء کے عرصہ میں ملک شاہ نے نظام الملک طوسی کے مشورہ سے ریّ (نیشاپور) میں ایک رصدگاہ (Observatory) قائم کی، جس کا اہتمام عمر خیّام نیشاپوری(517ھ-429ھ / 1123ء-1038ء) کے سپرد تھا۔ ملک شاہ، نظام الملک اور عمر خیام نے رصد گاہ میں عرب و عجم کے مشہور ماہرانِ فلکیات کو جمع کیا۔ ملک شاہ کے نام سے عمر خیّام نے فارسی زبان میں ایک کیلنڈر ''تقویمِ جلالی'' تیار کیا۔ یہ کیلنڈر، عیسوی کیلنڈر / گری گورین کیلنڈر(Gregorian Calendar) سے بھی زیادہ صحیح تھا، ایک رائے کے مطابق ایامِ کبیسہ (Leap years) کی پیچیدگیوں کی وجہ سے یہ کیلنڈر زیادہ دنوں تک استعمال میں نہ آیا۔

9.3.5 نظام الملک حسن بن علی طوسی

ایران کے ضلع نوقان میں واقع طوس ایک مردم خیز جگہ ہے۔ خواجہ ابو علی حسن نظام الملک طوسی 10 / اپریل 1018ء / 408ھ کو یہیں پیدا ہوا، اس کے علاوہ امام غزالی اور فردوسی جیسی دو بڑی مشہور شخصیتیں بھی یہاں گزری ہیں۔ عباسیوں کے زمانہ میں جس طرح ایرانی برامکہ خاندان شہرت و ناموری کی بلندی پر تھا، اسی طرح کچھ دنوں کے لئے سلجوقیوں کے وقت میں نظام الملک کا خاندان عروج پر تھا۔ الپ ارسلان نے اپنی تخت نشینی کے بعد قلمدانِ وزارت اس کے سپرد کیا اور جب ملک شاہ کو نظام الملک کی تدبیروں سے تاج و تخت ملا تو اس نے نظام الملک کو نہ صرف منصبِ وزارت عطا کیا، بلکہ سلطنت کا مختارِ کُل بنا دیا۔ نظام الملک نے جاہ و جلال کے ساتھ 30 سال وزارت کی اور ایسے ایسے کارنامے انجام دئے کہ اس کے سامنے برامکہ کی داستانیں ماند پڑ گئیں۔ ملک شاہی دور کی ساری درخشانی جو سلجوقیوں کا دورِ زریں شمار کیا جاتا ہے، نظام الملک ہی کی ضیاپاشیوں کا نتیجہ تھی۔

خلافت بغداد سے نظام الملک کے تعلقات بہت خوشگوار تھے اور وہ خلفاء کا دل سے احترام کرتا تھا، عباسی خلیفہ مقتدی بھی اس کی

بہت عزت کرتا تھا۔ اس نے سیاسیات اور قانونِ مملکت پر اپنی کتاب ''سیاست نامہ''(سِیَرُ المُلوک) ملک شاہ ہی کے کہنے پر لکھا جو اپنے موضوع پر لاجواب تصنیف ہے اور کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ ذاتی فضل و کمال کے ساتھ وہ بڑا علم پرور اور علماء نواز تھا۔ اس کا دربار علماء ومشائخ کا مرجع تھا۔ اس کی مجلس میں امام الحرمین، شیخ ابو اسحق شیرازی، ابو القاسم قشیری اور ابو علی فارمذی جیسے جلیل القدر علماء اور ائمہ تشریف لاتے تھے، نظام الملک ان کی بڑی عزت و تکریم کرتا تھا، امام الحرمین اور ابو القاسم قشیری کے لئے اپنی مسند خالی کر دیتا تھا۔ اپنے زمانے میں اس نے علم و فن کی بڑی خدمت اور تعلیم کی اشاعت کی بڑی کوشش کی۔ بلخ، نیشاپور، ہرات، اصفہان، بصرہ، مرو، موصل، آمل اور عراق کے تمام شہروں میں مدرسے قائم کئے، بغداد کا شہرہ آفاق مدرسہ نظامیہ اسی نے قائم کیا۔ اس نے ملک بھر میں بکثرت مسجدیں تعمیر کرائیں اور پُل بنوائے۔ قیام عدل کا اس کے نزدیک بڑا اہتمام تھا، غرباء پروری اس کا خاص وصف تھا، بڑا دیندار اور عابد وزاہد تھا۔

9.3.6 مدرسہ نظامیہ، بغداد

نظام الملک نے بڑے اہتمام سے بغداد کا مدرسہ نظامیہ تعمیر کرایا تھا۔ اس کی تعمیر پر دو لاکھ دینار یعنی تقریباً دس لاکھ روپے صرف ہوئے، دو سال میں اس کی عمارت تعمیر ہوئی، ذیقعدہ 459ھ / 1067ء میں بڑے اہتمام سے اس کا افتتاح عمل میں آیا، کئی لاکھ روپے سالانہ اس کا خرچ تھا، اس سے متعلق دارالاِ قامۃ (Hostel) بھی تھا، تمام طلبہ کو وظائف (Scholarships) ملتے تھے۔ اس دور کے منتخب علماء درس و تدریس کے لئے فراہم کئے گئے تھے، امام ابو اسحق شیرازی، ابو نصر صباغ، ابن الخطیب شارحِ حماسہ، ابو الحسن فصیحی، قطب الدین شافعی اور امام غزالی جیسے یگانۂ عصر علماء مختلف اوقات میں اس مدرسہ کی تعلیم و تدریس کی مسند پر بیٹھے۔

9.3.7 سلجوقی دور کے عباسی خلفاء

خلافت بنی عباس پر سلجوقی اقتدار کا آغاز 447ھ / 1055ء سے ہوا۔ چنانچہ یہ اقتدار خلیفہ قائم کے دور خلافت میں شروع ہو کر خلیفہ ناصر (622ھ576-ھ / 1225ء1180-ء) کے عہد تک جاری رہا، اس کا بیشتر حصہ صلیبی جنگوں میں گذرا۔ سلجوقی اقتدار کے خلفائے بنی عباس کا شجرہ حسب ذیل ہے:

قائم، مقتدی، مستظہر، مسترشد، راشد، راشد کے بعد اس کا چچا، مقتفی، اس کے بعد اس کا بیٹا، مستنجد، پھر اس کا بیٹا، مستضی اور اس کا بیٹا، ناصر خلیفہ مانا گیا۔ سلجوقیوں کے زمانہ میں خلفاء بنی عباس کو وہ تکالیف جھیلنی نہ پڑیں جو بویہہ کے زمانہ میں برداشت کرنی پڑی تھیں۔

9.3.8 سلجوقی سلطنت مابعدِ تقسیم

سلجوقی حکومت کی تعمیر و توسیع میں میکائیل کی تمام اولاد شریک تھی، اس لئے جب دولت آلِ سلجوق کا قیام عمل میں آگیا اور 443ھ / 1051ء میں خلافت بغداد نے اس سلطنت کی تصدیق کر دی تو طُغرِل بیگ نے اپنے بڑے بھائی داؤد کے ذریعہ، مفتوحہ ممالک کو اپنے تمام بھائیوں اور بھتیجوں میں تقسیم کرا دیا۔

خراسان کا بڑا حصہ داؤد نے خود لیا اور بست، ہرات اور سِیستان بیغو کو ملے، طبس و کرمان داؤد کے لڑکے قاروت کے حصہ میں آیا

اور عراق عجم طغرل بیگ کے حصہ میں پڑا، اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً بقدر حصہ رسدی تقسیم کا سلسلہ جاری رہا، چنانچہ بعد میں طُغرِل بیگ کے دوسرے بھائی ابراہیم نیال کو ہمدان، امیر یاقوتی بن چغری بیگ کو ابہر، رنگان اور نواحِ آذر بائیجان اور قتلمش بن ارسلان کو گرگان اور دامغان ملے۔

485ھ / 1092ء میں نظام الملک طوسی شہید کیا گیا۔ اس کی وفات کے بعد سلجوقیوں کا روشن ترین عہد ختم ہو گیا۔ ملک شاہ بھی اسی سال یعنی 485ھ / 1092ء میں مر گیا، اس کے بعد اس کے بیٹوں میں لڑائیاں ہونے لگیں۔ 480ھ / 1087ء میں نظام الملک نے فوجی ضروریات کے مدّ نظر مقامی سپاہ کے اخراجات کی پابجائی کے لئے صوبہ جات کی مال گذاری حاکموں کو سپرد کر دی تھی، اگر مرکزی حکومت ان کے حساب کتاب پر اچھی طرح نگرانی رکھتی اور حکّام اسے اپنی موروثی جائیداد تصور نہ کرتے تو یہ طریقۂ عمل مضر نہ ثابت ہوتا۔ مُلک شاہی خاندان کے افراد میں تقسیم ہونے کے ساتھ ہی طاقتور مرکزی حکومت باقی نہ رہی، ایران کے سلجوقیانِ کبیر برائے نام 552ھ / 1157ء تک سب کے صدر تصور کئے گئے۔ عراق کا سلجوقی خاندان بھی سلاجقہ کے مابین بڑی اہمیت رکھتا تھا۔

9.3.9 سلجوقیانِ اعظم

اس طبقہ میں طغرل بیگ، الپ ارسلان، ملک شاہ، محمود اور بَرکیارُوق، ملک شاہ ثانی، محمد اور سنجر کے نام شامل ہیں۔ سلاجقۂ عظام کی حکومت خلفائے بغداد کی سابقہ مملکت کے مشرقی صوبوں پر، باستثنائے کرمان، مشتمل تھی، وہ اپنی سکونت اصفہان اور بغداد میں رکھتے تھے، جب کہ سلاجقۂ عظام کے آخری تاجدار سنجر کے عہد میں ان کا مرکز مرو بن گیا۔ جب 552ھ / 1157ء میں سنجر بے اولاد مر گیا تو سلاجقۂ عظام کے حکمراں خاندان کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ سلجوقیانِ اعظم کا عہدِ حکومت 429ھ / 1038ء سے 552ھ / 1157ء تک رہا۔

9.3.10 سلاجقۂ عراق

محمد سلجوقی کی وفات (511ھ / 1118ء) کے بعد اس کا تیرہ سالہ بیٹا محمود خراسان اور شمال مشرقی سرحدی صوبوں کے سوا پوری سلطنت کا وارث و جانشین ہوا۔ اس کے بعد سلطان کا خطاب اس کے بیٹے داؤد (527ھ-526ھ / 1132ء-1131ء) نے اختیار کیا، پھر طُغرِل اول، مسعود، ملک شاہ دوم، محمد دوم، سلیمان شاہ، ارسلان شاہ اور پھر طُغرِل دوم (591ھ / 1194ء) برسر اقتدار رہے، ان کا عہدِ حکمرانی 511ھ / 1118ء سے 592ھ / 1194ء تک ہے۔ قریب قریب یہ سب سلاطین کم عمری ہی میں تخت نشیں ہوئے اور اکثر قبل از وقت متشدّدانہ موت کا شکار ہوئے، ان میں سے بیشتر نے مشکل ہی سے حکومت کی، وہ اپنے اتابکوں اور امراء کے ہاتھوں میں محض آلہ کار تھے، محمود کے بعد ہی سے یہ سلاطین محض نام کے حکمراں رہ گئے تھے۔

9.3.11 سلاجقہ کِرمان (جنوبی فارس)

اس سلسلے کا بانی اور مورث اعلیٰ چَغری بیگ کا بیٹا قاوُرد قَرہ ارسلان بیگ تھا، جس نے اپنے اوغوزوں کے ساتھ 433ھ / 1041ء کے قریب کرمان (جنوبی ایران) کی طرف کوچ کیا اور چند ہی سال بعد، یعنی 441ھ-440ھ / 1049ء-1048ء میں اس نے کرمان کے

صدر مقام بَردسیر پر قبضہ کر لیا، پھر اس نے اپنے ہی بل بوتے پر گرم سیر (گرم ساحلی علاقہ) میں شَبانکاروں اور قُفسوں کے ساتھ لڑائیاں چھیڑ دیں اور طُغرل بیگ کی پرواہ کئے بغیر عُمّان کا مالک بن بیٹھا۔

قاوُرد کے بعد اس کے بیٹوں کرمان شاہ اور بعد میں سلطان شاہ نے حکومت کی، اس کے بعد تُوران شاہ تخت و تاج کا وارث ہوا۔ بعد ازاں ایران شاہ، ارسلان شاہ، محمد، طُغرِل شاہ، بہرام شاہ اور ارسلان شاہ دوم، تُوران شاہ دوم اور محمد شاہ تخت نشیں ہوئے۔ سلاجقۂ کرمان کی حکمرانی کی مدت 582ھ-433ھ / 1186ء-1041ء ہے۔

9.3.12 سلاجقۂ شام

464ھ-463ھ / 1071ء-1070ء میں نَصر مَرْوانی حلبی نے جب الپ ارسلان کی اطاعت اختیار کر لی تو آتِسیز بن اَبَق (یا اَوَق) کی زیر قیادت ترکمانوں کے ایک جتھے نے فلسطین پر چڑھائی کی اور رَملہ، بیت المقدس اور عسقلان کے سوا جہاں فاطمی جمے رہے، یہودیہ کے سارے علاقے فتح کر لئے۔ وہ 468ھ / 1076ء تک دمشق فتح نہ کر سکا، پھر مصر میں فاطمی سپہ سالار بدرالجمالی کے مقابلہ میں شکست کھانے کے بعد شام میں اس کا قافیہ اس قدر تنگ ہوا کہ اس نے تُتُش بن اَلپ ارسلان سے مدد طلب کی، تُتُش 470ھ / 1077ء میں شام آیا اور دمشق اس کے حوالہ کر دیا گیا، تُتُش نے غدّاری کر کے آتِسیز (Atsis) کو قتل کر دیا اور خود شہر کا مالک بن بیٹھا، عُقَیلی مُسلم بن قریش حلب پر قابض تھا، عُقیلی ایشیائے کوچک (روم) کے سلجوقی فرمانروا سلیمان کے ساتھ لڑتا ہوا مارا گیا تو ملک شاہ نے خود بعجلت حلب پہونچ کر زنگیوں کے مورث اعلیٰ اور اپنے ترکی غلام آق سنقر کو وہاں کا گورنر مقرر کر دیا۔ ملک شاہ کی موت (485ھ / 1092ء) کے بعد سلاجقۂ شام کا بانی اور مورثِ اعلیٰ اَلپ ارسلان کا بیٹا، تُتُش حلب کا بادشاہ بنا، اس کے بعد اس کا بیٹا رضوان حلب کا بادشاہ اور اس کا دوسرا بیٹا دُقاق دمشق کا مالک بن گیا۔ دُقاق کی موت (497ھ / 1104ء) کے بعد اس کے اتابک مختار کل تُغتگین نے پہلے ایک معصوم بچے کے نام پر، پھر دُقاق کے بھائی ارتاش کے نام پر خطبہ پڑھوایا، اور بعد ازاں خود مختار بن بیٹھا اور بوری خاندان کا بانی بنا۔ حلب کے بادشاہ رضوان کی وفات (507ھ / 1114ء) کے بعد اس کا بیٹا اَلپ ارسلان اخرس صرف ایک سال کے لئے تخت نشیں ہوا، لیکن اس کے خادم لولوٴ نے جلد ہی اسے قتل کرنے کے بعد اس کے بھائی سلطان شاہ کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا، لیکن وہ خود 511ھ / 1117ء میں مارا گیا، اس پر اہل شہر نے شہر کو۔ ایلغازی کے حوالہ کر دیا۔ اس طرح شاہی سلسلہ کے چوتھے سلطان پر سلجوقی حکومت شام سے ختم ہو گئی۔

9.3.13 سلاجقۂ روم (اناطولیہ)

اس خاندان کا بانی اور مورث اعلیٰ سلیمان بن قُتُلمش بن ارسلان بن سلجوق تھا، سلیمان دیگر ترکی امراء کی طرح ملازکرد کی جنگ (464ھ / 1071ء) کے بعد ایشیائے کوچک (روم) میں وارد ہوا، اسے 470ھ / 1077ء کے قریب نائیسیا (Nicaea) کے فرمانروا کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے، بازنطینی سلطنت پر Alexius comnenus کی تخت نشینی کی وجہ سے مایوس ہو کر اس نے مشرق میں ارمنی بادشاہ Philaretus سے 477ھ / 1085ء میں انطاکیہ کا شہر چھین لیا، سلیمان کے بعد اس کے بیٹے قلیج ارسلان اول اور پھر اس کے جانشیں ملک شاہ اور مسعود، قلیج ارسلان دوم، رکن الدین سلیمان دوم، قلیج ارسلان سوم اور غیاث الدین کَیخُسرو اول، عزّالدین کیکاوٴس اول،

علاؤالدین کیقباد، عزالدین کَیخُسرو دوم، عزالدین کیکاؤس دوم، رکن الدین قلیج ارسلان چہارم، غیاث الدین کیخسرو سوم، غیاث الدین مسعود دوم اور علاؤالدین کیقباد سوم نے عنانِ حکومت سنبھالی۔ ان کا عہد حکمرانی 470ھ / 1077ء سے 702ھ / 1302ء تک رہا۔

قونیہ میں روم کے سلجوقیوں کی جگہ 700ھ / 1300ء اور اس کے بعد کے زمانہ میں اوغوز ترکمانوں کا ایک دوسرا قبیلہ (عثمانی ترکوں کا) برسرِ اقتدار آیا اور اسلام کی علم برداری میں سب سے زیادہ پیش پیش رہا، وہ 1529ء میں مغربی یورپ ویٓنا (Vienna) میں گھس گئے اور عرب خلفاء کی مملکت کے تقریباً مساوی ہی وسیع ممالک پر اسلامی حکومت قائم کرلی، صرف پہلی عالمی جنگ کے بعد ہی ان کی یہ پوری حکومت ختم ہوگئی اور وہ اپنے سابقہ ایشیائی علاقوں ہی کو سنبھال سکے۔

9.3.14 اتابکین سلاجقہ

سلاطینِ دولتِ سلجوقیہ اپنے نوعمر اور کم سن شہزادوں کی اتالیقی پر مملوک سرداروں کو مامور کرتے اور انہی غلاموں کی نگرانی میں سلجوقی شہزادوں کی تربیت ہوتی، اس لئے ان مملوکوں یعنی ترک غلاموں کو اتابک) اتالیق (Tutor / کے نام سے پکارا جانے لگا۔ اتابک کے معنی ترکی زبان میں ایسے امیر کے ہیں جو باپ کے قائم مقام سمجھا جائے۔ اتا بمعنی پدر اور بک بیگ کا مخفف ہے جس کے معنی سردار کے ہیں۔

جب سلاطین سلجوقیہ آپس میں لڑلڑ کر کمزور ہوگئے تو ان مملوکوں یعنی اتابکوں نے موقعہ پاکر اپنی مستقل حکومتیں جابجا قائم کرلیں۔ ظہیر الدین طُغتگین جو سلجوق تُتُش الپ ارسلان کا مملوک تھا، وہ تتش کے نوعمر بیٹے وفاق سلجوقی کا اتابک مقرر ہوا اور وفاق کے بعد تتش سلجوقی کی سلطنت کا مالک ہوگیا اور دمشق میں حکومت کرنے لگا، اس خاندان میں تقریباً چھ حکمراں ہوئے، 549ھ / 1155ء میں زنگیوں نے ان سے یہ حکمرانی چھین لی، صرف سیف الدولۃ کے خاندان میں 52 برس حکومت رہی۔

عمادالدین زنگی سلطان ملک شاہ سلجوقی کے مملوک کا بیٹا تھا۔ اس نے موصل اور حلب میں اتابکی سلطنت قائم کی۔ عراق کے سلجوقی سلطان مسعود کا ایک قپچاقی غلام تھا، اس نے آذربائیجان میں اتابکی سلطنت قائم کی، 531ھ / 1137ء سے 622ھ / 1225ء تک اس کے خاندان میں حکومت رہی۔ آخر میں یہ حکومت شاہانِ خوارزم کے مقبوضات میں شامل ہوگئی۔ سلطان ملک شاہ سلجوقی کا انوشتگین نامی ایک مملوک تھا، اس کی اولاد میں شاہانِ خوارزم شاہیہ تھے۔

اسی طرح سَلغُر ایک اتابک سردار تھا جس نے فارس میں اتابکی سلطنت قائم کی۔ 543ھ / 1149ء سے 686ھ / 1287ء تک یہ حکومت اس خاندان میں رہی، اس خاندان میں نو بادشاہ ہوئے، تاتاریوں کے ہاتھوں یہ حکومت ختم ہوئی۔ مشہور ایرانی شاعر شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی اسی عہد کے تھے، انہوں نے فارسی زبان میں حکمت و دانائی پر مبنی ایک شاہکار کتاب ''گلستاں'' کے نام سے تصنیف کی۔

امیر سقمان قطبی جو قطب الدین اسماعیل سلجوقی کا غلام تھا، نے شہر غلاط میں اپنی حکومت قائم کی، 493ھ / 1099ء سے 604ھ / 1207ء تک امیر سقمان کی اولاد میں حکمرانی قائم رہی، یہ لوگ شاہانِ ارمن کہلائے، اس خاندان کا آخری حکمراں عزیزالدین ایلیان تھا، اس حکومت کے وارث سلاطینِ ایوبی ہوئے۔

ملک شاہ کا غلام سپہ سالار ارتق ترکمان تھا، اس کے لڑکے معین الدین سقمان نے سلطان برکیاروق کے عہدِ حکومت (495ھ / 1101ء) میں قلعہ کیفا پر قبضہ کر لیا اور حکمرانی شروع کر دی۔ کچھ عرصہ بعد اس نے علاقہ ماردین پر بھی قبضہ کیا اور اپنی حکمرانی کے حدود وسیع کر لئے، 502ھ / 1109ء میں اس کی حکومت کے دو حصے ہو گئے، ایک کا مرکز قلعہ کیفا تھا اور دوسرے کا ماردین۔ قلعہ کیفا میں تقریباً دس حکمراں ہوئے، 620ھ / 1223ء میں ایوبیوں نے ان سے حکومت چھین لی۔ ماردین میں تقریبا چودہ امراء ہوئے، 811ھ / 1409ء میں آلِ عثمان نے ان سے حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس خاندان کی حکومت دولتِ ارتقیہ کہلائی۔

الغرض چھٹی صدی ہجری میں تمام سلجوقی سلطنت پر سلجوقیوں کے افسرانِ فوج قابض و متصرف ہو کر اپنی اپنی مستقل بادشاہتیں قائم کر چکے تھے۔

9.4 اکتسابی نتائج

آلِ بویہ (سلاطینِ دیالمہ) خلافتِ عباسیہ پر متولی رہے، 447ھ 322-ھ / 1055ء934-ءیعنی تقریبا سوا سو سال تک یہ لوگ خلیفۂ بغداد اور عراق وفارس پر قابض و متصرف رہے۔ آل بویہ میں معزالدولہ اور عضدالدولہ جیسے قابل حکمراں اور ابن العمید اور صاحب ابن عباد جیسے زیرک وزراء گذرے ہیں۔ بویہی دور میں بعض علم دوست بھی رہے ہیں اور بعض مدارس بھی قائم کئے گئے۔ ان کے زمانے میں عربی سیادت کے تمام نقوش مٹ گئے۔ آل بویہ نے اپنے لئے امیر الأمراء کا خطاب تجویز کیا، جب کہ سلاجقہ نے سلطان کا خطاب۔ اسی عہد میں فوجی سرداروں کو جاگیریں دینے کا قاعدہ بڑے پیمانہ پر ایجاد ہوا۔

آل بویہ کے بعد سلجوقیوں نے ان کی جگہ لی اور وہ برسر اقتدار آئے۔ سلجوقیوں نے خاندان عباسیہ کے ساتھ عقیدت مندی کا برتاؤ کیا، سلجوقیوں کی طاقت بنی بویہ سے بدرجہا زیادہ اور بہتر تھی۔ ان کے زمانہ میں مسلمانوں کی ضائع شدہ طاقت و عظمت پھر بحال ہوئی، ان کی حکومت 430ھ / 1039ء سے 700ھ / 1300ء تک یعنی کم وبیش ڈھائی سو سال قائم رہی۔ ابتدائی زمانہ جس میں طغرل بیگ، الپ ارسلان اور جلال الدین ملک شاہ جیسے شہرہ آفاق سلاطین اور نظام الملک حسن طوسی جیسے مدبّر وزیر تھے، بڑا شاندار تھا۔ آخر میں ان کے بہت سے ٹکڑے ہو گئے، شروع ہی سے ان میں سلاجقۂ ایران، سلاجقۂ عراق، سلاجقۂ شام اور سلاجقۂ روم وغیرہ جیسے کئی طبقات قائم ہو چکے تھے، پھر ان میں اتابکوں کی سلطنتیں قائم ہوئیں۔ سلاجقہ نو مسلم سنی تھے انہوں نے عیسائیوں سے مقابلے کئے اور ان کے دلوں پر مسلمانوں کی شمشیر خارشگاف کی دہشت وہیبت پھر قائم کر دی، لیکن آخری دور میں آپس کی نااتفاقی اور خانہ جنگی نے دولتِ سلجوقیہ کا خاتمہ کر دیا۔

9.5 نمونہ امتحانی سوالات

9.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. بغداد سے بنی بویہ کا خاتمہ کس حکومت نے کیا؟

(a). سلجوقی (b). صفوی (c). پہلوی (d). قاچاری

2. سلجوقی حکمراں الپ ارسلان نے اپنا دارالحکومت کس شہر کو بنایا؟

(a). اصفہان (b). ترکستان (c). غزنہ (d). لاہور

3. نظام الملک طوسی کو عماد الدولہ کا لقب کس سلطان نے دیا؟

(a). جلال الدین ملک شاہ (b). طغرل بیگ (c). شاہ اسماعیل (d). شاہ طہماسپ

4. مدرسہ نظامیہ کس نے قائم کیا؟

(a). نظام الملک طوسی (b). ابن تیمیہ (c). عمر خیام (d). سب غلط

5. تقویم جلالی کو کس نے تیار کیا؟

(a). عمر خیام (b). ملا صدرا (c). ابو نصر فارابی (d). ابن رشد

6. سیاست نامہ کس کی تصنیف ہے؟

(a). نظام الملک طوسی (b). عمر خیام (c). ملا صدرا (d). ابن تیمیہ

7. نظام الملک طوسی کی وفات کب ہوئی؟

(a). 1092ء (b). 1102ء (c). 1111ء (d). 1258ء

8. ان میں سے کس نے مدرسہ نظامیہ میں درس و تدریس کو زینت بخشی؟

(a). امام غزالی (b). شاہ ولی اللہ (c). امام ابو یوسف (d). سب غلط

9. نظام الملک نے بطور وزیر کتنے سال تک اپنی خدمات انجام دی؟

(a). 30سال (b). 50سال (c). 10سال (d). 15سال

10. سلجوقی حکومت کا بانی کون ہے؟

(a). طغرل بیگ (b). نظام الملک طوسی (c). امام غزالی (d). سب غلط

9.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. جلال الدین ملک شاہ کے بارے میں اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔
2. سلجوقی خاندان کی ابتدائی تاریخ بیان کیجیے؟
3. سلطان طغرل بیگ کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔
4. مدرسہ نظامیہ بغداد پر مختصر نوٹ لکھیے۔
5. سلجوقی سلطنت مابعد تقسیم پر روشنی ڈالیے۔

9.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. نظام الملک حسن طوسی کی شخصیت اور اس کے کارناموں پر روشنی ڈالیے؟
2. الپ ارسلان کا تعارف کرائیے۔
3. سلاطینِ سلاجقہ پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

9.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

.1	موسوعۃ الأدیان (المیسرۃ)	:	متعدد مصنفین (کویت)
.2	العالم الإسلامی فی العصر العباسی	:	دکتور حسن أحمد محمود، أحمد إبراہیم الشریف (قاہرہ)
.3	محاضرات تاریخ الأمم الإسلامیۃ (الدولۃ الإسلامیۃ)	:	الشیخ محمد الخضری بک (قاہرہ)
.4	اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد 11,5	:	متعدد مصنفین (پاکستان)
.5	تاریخ اسلام، ج 3 (خلافت عباسیہ، جلد دوم)	:	شاہ معین الدین احمد ندوی
.6	تاریخ اسلام، ج 2	:	اکبر شاہ خان نجیب آبادی
.7	تاریخ اسلام پر ایک نظر	:	عبد الرحمن خان ایم اے
.8	تاریخ ملت، جلد 6 (خلافت بنی عباس، جلد 2)	:	مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی
.9	تاریخ تہذیبِ اسلامی (حصہ سوم و چہارم)	:	پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی۔

اکائی 10: سلجوقی دور میں علمی خدمات

اکائی کے اجزا:

10.0 تمہید
10.1 مقاصد
10.2 سلجوقی سلطنت
10.3 طغرل بیگ
10.4 الپ ارسلان
10.5 ملک شاہ سلجوقی
10.6 ملک سنجر
10.7 نظام الملک طوسی (وزیر)
10.8 سلجوقی دور کا عظیم علمی کارنامہ
10.9 سلجوقی دور کے نامور اہل علم اور ان کی علمی خدمات
10.10 اکتسابی نتائج
10.11 نمونہ امتحانی سوالات
10.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
10.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
10.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
10.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

10.0 تمہید

اس اکائی میں سلجوقی دور میں علمی ترقی کا تعارف کرایا جائے گا، اس میں سلجوقی دور کے قیام واستحکام، اس کے اہم حکمراں کا مختصر سوانحی خاکہ، سلجوقی دور کے اہم اور مشہور علماء کا تذکرہ، ان کا علمی مقام، ان کی علمی خدمات اور اہم تصانیف وغیرہ کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

10.1 مقاصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد سلجوقی سلطنت کے قیام واستحکام اور اس دور کے علماء، ان کا علمی مقام، ان کی علمی خدمات اور اہم تصانیف وغیرہ کے حوالے سے معلومات حاصل کر سکیں گے۔

10.2 سلجوقی سلطنت

سلجوقیوں کا جد امجد سلجوق بن یکاک تھا، اسی کی طرف نسبت کرتے ہوئے اس کی نسل کو سلجوقی یا آلِ سلجوق یا سلاجقہ کہا جاتا ہے۔ سلجوق ترکستان کے خان اعظم کے یہاں ملازم تھا۔ اس کا قبیلہ اور خاندان فطرتاً جنگجو تھا۔ کاتب تقدیر نے اس غیر مسلم خاندان کے نصیب میں اسلام کی بقاء اور اسلامی سلطنت کی سلامتی کی خدمت لکھ دی تھی، اس لئے اس خاندان کو قبول اسلام کی توفیق ملی۔ اس قبیلہ کے قبول اسلام کا قصہ اس طرح ہے کہ سلجوق بن یکاک نے خان ترکستان کی ملازمت چھوڑ دی اور اپنے خاندان کے ساتھ بخارا چلا گیا۔ اس کا قبیلہ بھی اس کے ساتھ ہی ہجرت کر گیا۔ بخارا میں وہ اسلام سے متعارف ہوا اور اسلام قبول کر لیا، اس کے بعد اس کے قبیلے اور خاندان نے بھی اپنے سردار کی اتباع میں اور اس کے حکم پر اسلام قبول کر لیا۔

سلجوقی سلطنت کا آغاز پانچویں صدی ہجری (گیارہویں صدی عیسوی) کی ابتدا سے ہوتا ہے اور ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) کے ساتھ اس کا اختتام ہو جاتا ہے۔ سلجوقی سلطنت مشرق وسطیٰ (Middle East) اور وسط ایشیاء (Central Asia) میں قائم ایک مسلم سلطنت تھی، اور سلجوق نسلاً اوغوز ترک تھے۔ مسلم تاریخ میں اسے بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس کی سرحدیں ایک جانب چین سے لے کر بحیرۂ متوسط اور دوسری جانب عدن کے ساتھ خوارزم و بخارا تک پھیلی ہوئی تھی۔ طغرل بیگ، الپ ارسلان، ملک شاہ، برکیارق، محمد اور سنجر اس سلطنت کے بہترین فرمانروا تھے۔ تاریخ میں انہیں سلاجقہ عظام کہا جاتا ہے۔ ان کے بعد یہ عظیم الشان سلطنت منتشر ہو جاتی ہے اور مختلف اسلامی ممالک پر کچھ سلجوقی غلام اور کچھ سلجوقی شہزادے اپنی خود مختار ریاستیں قائم کر لیتے ہیں۔ ان میں سے خالص سلجوقی ریاستیں کرمان، عراق، شام اور روم کی ہیں، جن کو بالترتیب سلاجقہ کرمان، سلاجقہ عراق، سلاجقہ شام اور سلاجقہ روم کہا جاتا ہے۔ یہ سب ریاستیں سلاجقہ عظام کے عہد میں مختلف تاریخوں سے شروع ہوتی ہیں اور اس کے بعد مختلف تاریخوں پر ختم ہو جاتی ہیں۔ ذیل میں ان میں سے چند اہم سلاجقہ عظام (سلجوقی حکمرانوں) کا مختصر تذکرہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد سلجوقی دور کی اہم علمی خدمات کو بیان کیا جائے گا۔

10.3 طغرل بیگ

طغرل بیگ سلجوق کا پوتا تھا۔اسی نے سلجوقی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ طغرل بڑا قابل سپہ سالار تھا۔ اس نے 1037ء/ 429ھ میں دندانیقان کی جنگ میں غزنوی حکمران مسعود کو شکست دے کر خراسان میں سلجوقی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ خراسان میں حکومت مضبوط ہو جانے کے بعد طغرل نے مغرب کا رخ کیا اور ایران فتح کرتا ہوا 447 ہجری میں بغداد میں داخل ہو گیا، جو اس وقت بنی بویہ کے قبضے میں تھا۔ طغرل کا شمار تاریخ کے بڑے بڑے فاتح اور سپہ سالاروں میں ہوتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں اتنی بڑی سلطنت قائم کر دی جو سامانیوں، بنی بویہ اور بنی فاطمہ کی حکومتوں سے بڑی تھی۔ اس نے وسیع سلطنت پر 26 سال تک بڑی اچھی حکومت کی۔

10.4 الپ ارسلان

طغرل کے بعد اس کا بھتیجا الپ ارسلان تخت نشیں ہوا۔ الپ ارسلان اپنے چچا طغرل بیگ کی طرح ایک نہایت مدبر، تجربہ کار لیڈر، جرأت مند شخصیت کا مالک اور مخلص قائد تھا۔ اس نے ملکی سرحدوں کو وسیع کرنے کے لئے نہایت ہی دانشمندانہ پالیسی اختیار کی۔ جو علاقے سلجوقی سلطنت کے زیرِ نگیں تھے پہلے ان کے استحکام کو یقینی بنایا، اس کے بعد بیرونی دنیا کی طرف پیش قدمی کی۔ سلطان الپ ارسلان ہمیشہ جہاد فی سبیل اللہ اور اپنے پڑوسی مسیحی سلطنتوں میں اسلام کی اشاعت کے لئے بے قرار رہتا تھا۔ دراصل وہ ایک مخلص مجاہد تھا اور اسلامی جہاد کی روح ہی وہ واحد عامل تھا جس کی بدولت الپ ارسلان کو شاندار کامیابیاں نصیب ہوئیں اور اس کی جہادی سرگرمیوں نے دینی رنگ اختیار کر لیا۔

الپ ارسلان نے 1064ء میں آرمینیا اور جارجیا کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس کے علاوہ س نے ایشیائے کوچک، شمالی شام اور ماوراالنہر کو فتح کر کے سلجوقیوں کی سلطنت کو اور وسیع کر دیا۔ مشہور مدبر نظام الملک طوسی کو اپنے باپ چغری بیگ کی سفارش پر وزیرِ سلطنت مقرر کر لیا۔ اس کے عہد میں سلجوقی سلطنت کی حدود بہت وسیع ہوئیں۔ پہلے ہرات اور ماوراء النہر کو اپنی سلطنت میں شامل کیا پھر فاطمی حکمران کو شکست دے کر مکہ اور مدینہ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور اس کے نام کا خطبہ مکہ اور مدینہ میں بھی پڑھا جانے لگا۔ اس سے اسلامی دنیامیں سلجوقیوں کا اثر و رسوخ بڑھ گیا۔

رومیوں نے جب یہ دیکھا کہ سلجوقیوں نے ایک بڑی سلطنت قائم کر لی ہے، جو رومی سلطنت کے لیے خطرہ ہو سکتی ہے، تو رومی شہنشاہ ارمانوس دو لاکھ فوج لے کر الپ ارسلان سے لڑنے کے لیے چلا۔ الپ ارسلان کے پاس صرف 15 ہزار فوج تھی اور وہ مقابلے کے لیے تیار نہ تھا، اس لیے اس نے سب سے پہلے صلح کی کوشش کی، لیکن ارمانوس نے جواب دیا کہ ”صلح تمہارے پائے تخت رے میں پہنچ کر ہو گی“ رومی بادشاہ کے جواب کے بعد الپ ارسلان بھی لڑائی کے لیے تیار ہو گیا۔ جمعہ کا دن تھا سلطان نے پہلے نماز پڑھی اور خدا سے فتح کی دعا مانگی۔ اور بالآخر 26 اگست 1071ء کو بازنطینیوں کو ملازکرد کے مقام پر عبرت ناک شکست دی۔ اور قیصر روم رومانوس چہارم کو گرفتار کر لیا۔ قیصر روم نے نہ صرف تاوانِ جنگ ادا کیا اور خراج دینے پر رضا مند ہوا بلکہ اپنی بیٹی کی شادی سلطان کے بیٹے سے کر دی اور آرمینیا اور

جارجیا کے علاقے اس کو دے دیئے۔ اس فتح کی وجہ سے اس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔

الپ ارسلان نے 10 سال حکومت کی۔ وہ بڑا فیاض نیک اور عادل بادشاہ تھا۔ اس کے زمانے میں سارے ملک کے فقیروں اور محتاجوں کے نام رجسٹر میں درج تھے اور حکومت کی طرف سے ان کی مدد کی جاتی تھی۔ اس کے دور میں سارے ملک میں امن و امان تھا اور جرائم ختم ہو گئے تھے۔

10.5 ملک شاہ سلجوقی

الپ رسلان کے بعد اس کا لڑکا ملک شاہ 18 سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ سلطان ملک شاہ کے دور میں سلجوق سلطنت کو بڑی وسعت نصیب ہوئی۔ سلطان ملک شاہ اور مشہور مدبر وزیر سلطنت نظام الملک طوسی کی زیر قیادت سلجوقی سلطنت اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ یہ لائق اور بہادر باپ کا سچا جانشیں اور اوصاف و کمالات میں اسی کے مشابہ تھا۔ اس کا عہد سیاسی عروج، علمی ترقی اور دینی عظمت کے لحاظ سے بہت اہم تھا۔ اس کے عہد میں ہر جگہ فارغ البالی اور امن و عافیت تھی۔ تجارت اور صنعت کو فروغ حاصل تھا۔ راستے محفوظ تھے اور اس کا عہد ہر اعتبار سے سنہری کہلانے کا مستحق تھا۔ علمی ترقی، دینی عظمت، معاشی خوشحالی اور تمدنی عروج سب کچھ اپنے نکتہ کمال تک جا پہنچا تھا۔ وہ بلا کا بہادر تھا اور جس طرف رخ کیا کامیابی اس کا مقدر بنتی چلی گئی۔ ہر دشمن کو زیر کیا اور سلجوقی حکومت کو وسعت دی۔

ملک شاہ نے 20 سال حکومت کی۔ ملک شاہ سلجوقی سلطنت کا سب سے بڑا اور سب سے اچھا حکمران تھا۔ اس نے رعایا کی آسائش کے لیے رفاہ عام کے بہت سے کام انجام دیے۔ بہت سے ٹیکس ختم کر دیے۔ جگہ جگہ سڑکیں بنوائیں۔ سرائے اور پل تعمیر کیے۔ اس کو انصاف کا بڑا خیال تھا۔ اس کے زمانے میں کسی پر ظلم نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر کسی پر ظلم ہو جاتا تو مظلوم خود آ کر ملک شاہ سے فریاد کر سکتا تھا۔

10.6 ملک سنجر

ملک شاہ کے بعد اس کے لڑکوں محمود اور برکیارق میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اس آپس کی لڑائی میں سلطنت کمزور ہو گئی اور شام، حجاز اور ایشیائے کوچک یا تو سلجوقیوں کے قبضے سے بالکل نکل گئے یا مرکزی حکومت کے تسلط سے آزاد ہو گئے۔ سلجوقیوں کی یہ خانہ جنگی اسلامی سلطنت کے لیے بڑی نقصان دہ ثابت ہوئی۔ سلجوقیوں کا آخری طاقتور حکمران محمد کا بھائی سنجر تھا۔ اس نے 40 سال سے زیادہ حکومت کی۔ ترکستان اور خراسان کا علاقہ اس کی براہ راست حکومت میں تھا۔ باقی مملکت یعنی مغربی ایران اور عراق میں اس کے بھائی اور ان کی اولاد سنجر کی طرف سے حکومت کرتے تھے۔ سنجر ایک عادل اور نیک طبیعت حکمران تھا۔ وہ علم و ادب کا بہت بڑا سرپرست تھا۔ اس کے دربار میں ادب اور شاعری کا ویسا ہی چرچہ رہتا تھا جیسا ہارون رشید اور محمود غزنوی کے درباروں میں رہتا تھا۔ ثروت صولت اپنے ایک ہم عصر مورخ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ سنجر علماء کا احترام کرتا تھا۔ اولیاء اللہ سے عقیدت رکھتا تھا۔ اس کے زمانے میں خراسان دارالعلم بن گیا اور وہاں کے بڑے بڑے شہر مدرسوں، کتب خانوں، علماء اور ارباب کمال سے بھر گئے۔ امیر معزی اور فارسی کا سب سے بڑا قصیدہ گو شاعر انوری اس کے درباری شاعر تھے۔

10.7 نظام الملک طوسی (وزیر)

سلجوق کی تاریخ نامکمل رہے گی اگر اس سلطنت کے عظیم الشان وزیر نظام الملک طوسی کے حالات نہ پڑھے جائیں۔ ملک شاہ نے اپنی سلطنت کا سارا انتظام اپنے وزیر نظام الملک کے سپرد کر دیا تھا۔ یہ وزیر اپنی خوبیوں میں برامکہ پر بھی بازی لے گیا۔ سلطان الپ ارسلان کے زمانے میں وہی وزیر تھا۔ اس کی بزرگی کی وجہ سے ملک شاہ اسے بابا کہا کرتا تھا۔ نظام الملک کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے تعلیم کی ترقی پر بہت توجہ دی۔ اس نے سلطنت کے ہر حصے میں بڑے بڑے مدرسے قائم کیے، جو اس کے نام پر نظامیہ کہلاتے تھے۔ ان میں سب سے بڑا مدرسہ بغداد کا مدرسہ نظامیہ تھا۔ اس مدرسے کے خرچ کے لیے بہت بڑی جائیداد وقف تھی۔ تعمیر پر دولاکھ دینار خرچ ہوئے تھے اور تمام طلبہ کو وظیفہ دیا جاتا تھا۔ ملک شاہ نے جب دیکھا کہ نظام الملک مدرسوں پر بے شمار دولت صرف کر رہا ہے تو ایک دن اس نے کہا بابا آپ مدرسوں پر جو روپیہ خرچ کر رہے ہیں اگر وہ فوج پر خرچ کیا جائے تو دنیا فتح کی جا سکتی ہے۔ نظام الملک نے جواب دیا بیٹا تم جو فوج بھرتی کرو گے اس کے تیر چند گز سے زیادہ دور نہیں جا سکیں گے، لیکن میں اہل علم کی جو فوج تیار کر رہا ہوں اس کی دعاؤں کے تیر آسمان کے بھی پار چلے جائیں گے۔ علماء اور ادیبوں کی قدر دانی کے علاوہ نظام الملک غریبوں اور محتاجوں کی بھی امداد کرتا تھا۔ وہ خیرات بھی بہت کرتا تھا اور اذان سنتے ہی سارا کام بند کر کے نماز کے لیے اٹھ جاتا تھا۔ نظام الملک کی عادت تھی کہ جب وہ گھر سے نکلتا تو پیسوں کی تھیلیاں غلاموں کے ساتھ ہوتی تھی اور راستے میں جس محتاج پر نظر پڑتی تھی اس کو انعام دیتا جاتا تھا۔

10.8 سلجوقی دور کا عظیم علمی کارنامہ

سلجوقیوں نے سیاسی اور عسکری میدان کے علاوہ علمی میدان میں بھی بڑے کارنامے انجام دیئے۔ ان کے علمی کارناموں میں ایک بہت بڑا کارنامہ مدرسوں کا قیام ہے۔ پہلے تعلیم کا انتظام مسجدوں کے اندر ہوتا تھا۔ لیکن سلجوقی دور میں ایک قابل وزیر اعظم نظام الملک نے مدرسوں کے لیے باقاعدہ عمارتیں بنانا شروع کیں۔ چنانچہ چند سال کے اندر اندر سرکاری امداد سے ساری سلطنت میں مدرسوں کا جال بچھا دیا گیا۔ سلجوقیوں سے پہلے دنیا کے کسی حصے میں اس کثرت سے مدرسے کبھی قائم نہیں کیے گئے تھے۔ سلجوقی دور میں علم و ادب کی بھی خوب سرپرستی کی گئی اور اسلامی دنیا علمی حیثیت سے اس عہد میں اپنے انتہائی نقطہ عروج پر پہنچ گئی۔ فارسی زبان کو خوب ترقی ہوئی اور فارسی نثر میں بھی کتابیں لکھی جانے لگیں۔ فارسی شاعری کے لحاظ سے یہ دور عہد زریں ہے۔ امیر معزی، انوری، نظامی اور خاقانی وغیرہ جیسے فارسی زبان کے درجہ اول کے شعراء کا تعلق اسی دور سے ہے۔

10.9 سلجوقی دور کے نامور اہل علم اور ان کی علمی خدمات

سلجوقی دور کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے اس عہد میں علم کے فروغ کے لئے سرکاری طور پر بڑی کوششیں کی گئیں، جگہ جگہ مدرسے قائم کئے گئے، اہل علم کی سرکاری طور پر قدر کی گئی، یہی وجہ ہے اس دور میں بڑے بڑے نامور علماء اور مسلم سائنسدان پیدا ہوئے۔ ذیل میں ان میں سے چند مشہور اور نامور اہل علم کا تذکرہ اور ان کی علمی خدمات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

1. امام غزالی

سلجوقی دور کے علماء میں امام غزالی کا مقام بہت بلند ہے۔ وہ ایک بلند پایا عالم دین، صوفی اور فلسفی تھے۔ وہ نیشاپور کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ لیکن انہوں نے اپنی محنت اور لگن سے 28 سال کی عمر میں ہی وہ مقام حاصل کر لیا کہ ان کے علم و فضل کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی۔ وہ ابھی 34 سال کے بھی نہیں ہو پائے تھے کہ وزیر اعظم نظام الملک نے ان کو بغداد کے مدرسہ نظامیہ کا صدر مدرس مقرر کر دیا۔ بغداد میں امام غزالی کی بڑی قدر ہوئی اور بڑے بڑے امراء اور رؤساء ان کے عقیدت مندوں میں داخل ہو گئے۔ ان کا اثر و رسوخ اتنا بڑھ گیا تھا کہ ان کے جاہ و جلال کے سامنے امراء وزراء اور خود دربار خلافت کی شان و شوکت بھی ماند پڑ گئی۔ امام غزالی کو اگرچہ دنیاوی حیثیت سے بڑا عروج حاصل ہو گیا تھا، لیکن ان کا دل مطمئن نہیں تھا۔ وہ اس زمانے کے طور طریقوں، رسم و رواج اور خیالات سے مطمئن نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اخلاقی اور ذہنی حیثیت سے مسلمانوں کی حالت انتہائی خراب ہو گئی اور مسلمانوں کی زندگی دور اول کی طرح مثالی نہیں رہی۔ امام غزالی کو امیر اور غریب دونوں سے شکایت تھی۔ وہ حق کی تلاش کرنا چاہتے تھے۔ ان کی بے اطمینانی اتنی بڑھی کہ ایک دن سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بغداد سے نکل کھڑے ہوئے۔ انہوں نے گیارہ سال تک شام، فلسطین اور حجاز کے مقدس مقاموں میں، مسجدوں میں اور صحراؤں میں تنہائی کی زندگی گزار کر عبادت و ریاضت کی اور غور و فکر میں وقت گزارا۔ خدا نے ان کی یہ محنت قبول کی اور ان کے دل کو مطمئن کر دیا۔ وہ آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ دنیا میں نبوت کے علم سے بڑھ کر کوئی علم نہیں، جس سے روشنی حاصل کی جائے۔ اس کے بعد انہوں نے ریاضت اور صحرا نوردی ختم کر دی اور بغداد واپس آکر لوگوں کی اصلاح اور تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے بہت سی اہم کتابیں لکھ کر ان گمراہیوں کو دور کیا، جن میں بہت سے مسلمان اہل علم یونانی فلسفہ کے اثر کی وجہ سے مبتلا تھے۔ امام غزالی نے فلسفہ سے مفید کام لیا اور اس سے اسلامی عقائد اور نظریات کو تقویت دی۔ انہوں نے بتایا کہ حکومت میں، بادشاہوں میں، سرکاری عہدے داروں میں، تاجروں میں، علماء میں اور عوام میں کیسی کیسی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں اور یہ سب لوگ اسلام کی صحیح تعلیم سے کس قدر دور جا چکے ہیں۔ امام غزالی کی کتابوں نے ایک انقلاب پیدا کر دیا اور ان سے لوگوں کو اپنی زندگی سنوارنے میں بڑی مدد ملی۔

امام غزالی نے تفسیر، حدیث، علم کلام، فقہ، اُصول فقہ، تصوف و اَخلاق، منطق اور فلسفہ جیسے تمام موضوعات پر کتابیں لکھیں۔ ان کی سب سے مشہور کتاب "احیاء العلوم" ہے۔ اس کتاب کا مسلمانوں کی زندگی پر صدیوں تک اثر رہا۔ یورپ کے فلسفیوں اور دانشوروں کے خیالات بھی اس کتاب سے متاثر ہوئے۔ اصل کتاب عربی میں ہے، لیکن اس کا اردو میں ترجمہ ہو گیا ہے۔ امام غزالی نے ایرانیوں کے لیے فارسی زبان میں بھی ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب کا بھی اردو میں کیمیائے سعادت کے نام سے ترجمہ ہو گیا ہے۔ اس کتاب میں احیاء العلوم کے خیالات کو مختصر اور آسان طریقے پر بیان کیا گیا ہے۔

امام غزالی نے اپنی ابتدائی عمر میں ہی تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ علامہ شبلی نعمانی اپنی کتاب "الغزالی" میں امام نووی کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے امام غزالی کی تصنیفات کا اُن کی عمر کے مطابق حساب لگایا تو پتہ چلا کہ آپ ہر روز آٹھ صفحات تصنیف کرتے تھے۔ اس کے علاوہ درس و تدریس سے بھی وابستہ رہے اور مدرسہ نظامیہ کے شیخ الجامعہ بھی تھے، جو اس وقت اسلامی دنیا کی

سب سے بڑی یونیورسٹی تھی۔ ان تمام مصروفیات کے باوجود ہر روز اتنا لکھنا بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔

فقہ میں آپ کی تصانیف البسیط، الوسیط، الوجیز وغیرہ ہیں۔ کتاب الوجیز پر امام فخر الدین رازی سمیت تمام علماء نے ستر کے قریب شروحات لکھیں۔ امام ابن الملقن نے الوجیز میں بیان کی گئی احادیث کی تخریج پر سات جلدوں پر مشتمل کتاب البدر المنیر لکھی۔ آپ کی فقہ پر دوسری کتاب الوسیط ہے جسے بعض کتابوں میں رسائل کا نام دیا گیا ہے۔ امام غزالی نے فلسفہ اور شریعت کے اصولوں میں باہم تطبیق پر جو کتابیں لکھیں اور عقلیات کے مسائل کو جس اَحسن پیرائے میں بیان کیا وہ کتب آج بھی یورپ کے پاس محفوظ ہیں جن سے استفادہ کرنے کے لیے کئی یورپین زبانوں میں ان کا ترجمہ بھی کیا جا چکا ہے۔ جن میں سرِ فہرست **مقاصد الفلاسفہ، المنقذ من الضلال، تهافة الفلاسفة، میزان العمل** وغیرہ شامل ہیں۔

2. شیخ عبد القادر جیلانی

سلجوقی دور کی علمی دنیا میں دوسری بڑی شخصیت مشہور ولی اور بزرگ شیخ عبد القادر جیلانی کی ہے۔ ایران کے شمالی مغربی حصہ کے ایک صوبہ جیلان یا گیلان میں 470ھ (78۔1077ء) کو ان کی ولادت ہوئی۔ ان کے بچپن کا قصہ بہت مشہور ہے اور اسلامی دنیا کا بچہ بچہ اس سے واقف ہے کہ انہوں نے اپنی ماں کے حکم پر کس طرح عمل کیا اور ڈاکوؤں کے سامنے بھی جھوٹ بولنے سے گریز کیا۔ عبد القادر جیلانی ولی ہونے کے علاوہ ایک بہت بڑے مصلح بھی تھے۔ انہوں نے تعلیم اور تقریر کے ذریعے ہزاروں لوگوں کی اصلاح کی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ہاتھ پر پانچ ہزار عیسائیوں اور یہودیوں نے اسلام قبول کیا اور ایک لاکھ مسلمانوں نے ان کے سامنے گناہوں سے توبہ کی۔ وہ بڑے بے باک اور باہمت شخصیت کے مالک تھے۔ خلافِ شریعت کام پر بڑے سے بڑے آدمی کو بھی ٹوک دیتے تھے۔ ایک مرتبہ بغداد میں خلیفہ نے ایک ظالم شخص کو قاضی مقرر کر دیا۔ شیخ عبد القادر جیلانی کو جب معلوم ہوا تو عام جلسے میں اس پر اعتراض کیا اور خلیفہ سے کہا کہ تم نے ایک ظالم کو قاضی مقرر کر دیا، جب تم سے خدا پوچھے گا تو کیا جواب دوگے؟ خلیفہ کو جب معلوم ہوا تو اس نے قاضی کو فوراً برطرف کر دیا۔

شیخ عبد القادر جیلانی کا میدان کار تصوف اور طریقت تھا، اس لئے ان کے علمی کارنامے بھی زیادہ تر اسی میدان کے ہیں۔ انہوں نے جو تصنیفی یادگار چھوڑیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

غنية الطالبين، فتوح الغيب، مراتب الوجود، بشائر الخيرات، الفتح الربانی والفيض الرحمانی، آداب السلوک و التوصل الی منازل ملک الملوک، سر الاسرار و مظهر الانوار، تحفة المتقين و سبيل العارفين، جلاء الخاطر فی الباطن و الظاهر۔

عالمِ اسلام میں دین کی دعوت، اصلاح و ارشاد اور رجوع الی اللہ کی دعوت دینے کے بعد 561ھ (1166ء) میں 90 سال کی عمر وفات پائی۔

3. عمر خیام

عمر خیام کی پیدائش 18 مئی 1048ء کو نیشاپور میں ہوئی۔ ان کی قابلیت اور مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اس وقت کے سلجوقی سلطان

ملک شاہ نے انہیں اپنے دربار میں طلب کر لیا تھا اور انہیں اصفہان میں ایک عظیم الشان رصد گار تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ جب رصد گاہ کی تعمیر مکمل ہو گئی تو عمر خیام کو یہاں کا انچارج مقرر کر دیا گیا۔ عمر خیام ایک عظیم مسلم سائنس داں تھے۔ علم و سائنس کی دنیا میں انہوں نے بڑے کارنامے نجام دیئے۔ ان کے کارناموں میں ایک عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک شمسی کیلنڈر تیار کیا تھا جس کو جلالی کیلنڈر کہا جاتا ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ یہ کیلنڈر آج کے موجودہ انگریزی یا گریگورین کیلنڈر سے زیادہ درست ہے۔ اصفہان کی لائبریری سے انہوں نے بہت استفادہ کیا۔ یہاں انہوں نے علم الحساب کا بغور مطالعہ کیا اور اس سلسلے میں کئی اہم تصانیف چھوڑیں۔ ریاضی کے میدان میں مکعب اور متوازی کے نظریہ پر ان کی خدمات کو سراہا جاتا ہے۔ انہیں اقلیدس کے نظریے پر جو اشکالات نظر آئے ان پر عربی زبان میں ایک کتاب تحریر کی جس کا عنوان" **رسالہ فی شرح اشکال مصدرات کتاب اقلیدس** "تھا۔ عمر خیام کا اصل میدان علم ہیئت یا علم نجوم، ریاضی اور فلسفہ رہا۔ لیکن ان کی عالمی شہرت کی وجہ ان کی شاعری ہے۔ ان کی شاعری کا ایک انگریز شاعر اور مصنف ایڈورڈ ڈفٹلز جیر الڈ نے 1859ء میں "رباعیات آف خیام" کے نام سے انگریزی میں ترجمہ کر کے اس کی شاعری کو یورپ میں بھی متعارف کرا دیا۔ ریاضی کی ایک شاخ علم جبر و مقابلہ (الجبرا) میں مسلمانوں میں آخری اضافہ عمر خیام ہی نے کیا۔ سائنس کی دنیا میں عمر خیام کی کارکردگی اور عالمی پذیرائی کی وجہ سے 1970ء میں چاند کے ایک گڑھے کا نام عمر خیام رکھا گیا اور 1980ء میں ایک سیارے کو عمر خیام کے نام سے موسوم کیا گیا۔ سلجوقی دور کے اس عظیم مسلم سائنسدان کا انتقال 4 دسمبر 1121ء کو ایران میں ہوا۔

4. مولانا جلال الدین رومی

سلجوقی دور کی ایک عظیم شخصیت جلال الدین رومی کی ہے۔ ان کی پیدائش 604ھ میں بلخ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد شیخ بہاء الدین سے حاصل کی۔ شیخ بہاء الدین کے مریدوں میں سید برہان الدین بڑے پایہ کے محقق اور فاضل تھے۔ مولانا کے والد نے مولانا کو ان کی آغوشِ تربیت میں دے دیا۔ مولانا روم کا تعلق سلجوقیوں کے اس زمانے سے ہے جب ان کی حکومت صرف ایشیائے کوچک میں رہ گئی تھی۔ مولانا روم بلخ میں پیدا ہوئے تھے، لیکن 18 یا 19 سال کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ ایشیائے کوچک کے شہر قونیہ میں جاکر آباد ہو گئے تھے۔ ایشیائے کوچک کا علاقہ اس زمانے میں روم کے نام سے مشہور تھا، اس لیے وہ مولانا روم یا رومی کہلاتے ہیں۔ والد کے انتقال کے بعد دوسرے سال 629ھ میں تکمیل علوم و فنون کے لئے شام کا سفر کیا۔ اس وقت ان کی عمر 25 سال کی تھی۔ 15 سال تک شام کے مختلف شہروں حلب اور دمشق وغیرہ میں رہ علوم حاصل کئے۔ اس کے بعد دوبارہ قونیہ آ گئے۔ مولانا روم کا انتقال 672ھ کو قونیہ ہی میں ہوا۔

5. مولانا روم کی علمی خدمات

شمس تبریز سے ملاقات کے بعد مولانا روم کی حالت بالکل بدل گئی تھی۔ عشق حقیقی کی ایسی آگ روشن ہو گئی جس نے مولانا روم کو بے چین کئے رکھا۔ اس لیے انہوں نے تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔ ان کی صرف تین تصانیف ہی کے نام کتابوں میں ملتے ہیں۔ فیہ مافیہ، دیوان اور مثنوی۔ ذیل میں ان تصانیف کا مختصر تذکرہ پیش ہے:

فیہ ما فیہ : یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مولانا روم نے وقتاً فوقتاً معین الدین پروانہ کے نام لکھے۔ یہ کتاب بالکل نایاب ہے۔

دیوان: اس میں تقریباً50 ہزار اشعار ہیں۔ غزلوں کے مقطع میں عموماً شمس تبریز کا نام ہے، اس لیے عوام اس کو شمس تبریز ہی کا دیوان سمجھتے ہیں۔ چنانچہ مطبوعہ دیوان کے سرورق پر شمس تبریز ہی کا نام لکھا ہوا ہے۔ علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ یہ نہایت فاش غلطی ہے۔ اس دیوان میں صرف غزلیں ہیں، قصیدہ وغیرہ نہیں ہے۔ مولانا کی شاعری کا دامن بادشاہ اور امراء کی مدح سرائی کے داغ سے بالکل پاک ہے۔ حالانکہ ان کے معاصرین میں سے عراقی اور سعدی جو کہ صاحب طریقت اور صاحب حال بزرگ شاعر ہیں، لیکن ان کا دامن بھی اس عیب سے پاک نہیں ہے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ تمام اہل تذکرہ متفق ہیں کہ جن لوگوں نے غزل کو غزل بنایا وہ شیخ سعدی، عراقی اور مولانا روم ہیں۔ لیکن غزل گوئی کی حیثیت سے مولانا روم کا سعدی اور عراقی کے ساتھ کوئی مقابلہ نہیں۔ البتہ مولانا کے کلام میں جو وجد، جوش اور بے خودی پائی جاتی ہے وہ اوروں کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ مولانا روم فطرتاً پرجوش طبیعت رکھتے تھے۔ شمس تبریز کی صحبت نے اس نشہ کو اور تیز کر دیا تھا۔

مثنوی: مولانا روم کی یہ وہ کتاب ہے جس نے آج تک ان کے نام کو زندہ رکھا ہے اور جس کی شہرت و مقبولیت نے ایران کی تمام تصنیفات کو پیچھے چھوڑ دیا۔ صاحب کشف الظنون کے مطابق مثنوی کے اشعار کی تعداد 26660 ہے۔ ان کی ایک کتاب مثنوی دوسروں کی ہزاروں کتابوں پر بھاری ہے۔ مولانا کی تصنیفات میں سے آج صرف دیوان اور مثنوی ہی موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایران میں چار کتابیں جس قدر مقبول ہوئیں کوئی اور کتاب نہیں ہوئی۔ شاہ نامہ، گلستاں، مثنوی مولانا روم، دیوان حافظ۔ ان چاروں کتابوں میں بھی مقبولیت کے لحاظ سے مثنوی کو ترجیح حاصل ہے۔ مثنوی کو جس قدر مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی فارسی کی کسی کتاب کو آج تک حاصل نہیں ہوئی۔ یہ کتاب شاہنامہ کی طرح آج تک شوق سے پڑھی جاتی ہے۔ لیکن مثنوی میں شاہنامہ کی طرح بے سروپا باتیں نہیں ہیں، بلکہ اس میں عقلمندی اور حکمت کی باتیں ہیں۔

6. جاراللہ زمخشری

ان شخصیتوں کے علاوہ سلجوقی دور میں اور بھی کئی عظیم مصنف اور اہل قلم پیدا ہوئے، جنہوں نے علم و فن کی دنیا میں نئی راہیں نکالیں اور جن کا نام ان کے علمی کارناموں کی وجہ سے آج بھی زندہ ہے۔ ان میں ایک نام جاراللہ زمخشری کا بھی ہے جو لغت اور ادب کے امام تھے۔ انہوں نے کشاف کے نام سے قرآن کریم کی ایک تفسیر لکھی جو عقلی اور ادبی نقطہ نظر سے ایک بلند پایہ تفسیر سمجھی جاتی ہے۔

علامہ زمخشری کا نام محمود بن عمر، کنیت ابو القاسم اور نسبت خوارزمی ہے۔ وہ مسلکاً حنفی اور عقیدۃً معتزلی تھے اور اس کا برملا اظہار بھی کرتے تھے۔ آپ عرصہ دراز تک مکہ مکرمہ میں مقیم رہے، اس لیے جار اللہ (اللہ کا پڑوسی) کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ماہ رجب 467ھ میں زمخشر کے مقام پر پیدا ہوئے۔ آپ جہاں بھی جاتے تھے لوگ جوق در جوق جمع ہو کر آپ سے علمی استفادہ کرتے تھے۔ جو شخص بھی آپ سے مناظرہ کرتا وہ آپ کے علم فضل کا معترف ہو جاتا۔ آپ تفسیر، حدیث اور ادب میں مہارت تامہ رکھتے تھے، اس لیے آپ بالاتفاق اپنے عہد کے یکتائے روزگار عالم اور امام فن تسلیم کیے گئے۔ اس دور میں کوئی شخص آپ کا حریف و مثیل نہ تھا۔ آپ کی وفات شب عرفہ 538ھ میں خوارزم کے قریب جرجان میں ہوئی۔

آپ کی مشہور تصانیف حسب ذیل ہیں:

1. **تفسیر الکشاف**
2. **المفصل فی النحو**
3. **اساس البلاغۃ فی اللغۃ**
4. **المفرد و المرکب فی العربیۃ**

آپ کی تصانیف میں سب سے اہم تصنیف آپ کی تفسیر ہے۔ اس کا مکمل نام "الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل" ہے، جو دار الکتاب العربیہ بیروت سے چار جلدوں میں طبع ہو چکی ہے۔ یہ تفسیر دو سال تین ماہ میں مکمل ہوئی۔ اس تفسیر میں قرآن کریم کے وجوہِ اعجاز، ادبی محاسن اور فصاحت و بلاغت کو انتہائی عمدہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زمخشری صحیح معنی میں اس کے اہل تھے، کیونکہ وہ متعدد علوم و فنون میں اپنے ہم عصروں پر فائق تھے۔ وہ عربی زبان و اشعار کے یکتائے روزگار عالم تھے۔ علوم بلاغت، بیان و اعراب اور ادب میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ان کے علمی تفوق کی جھلک ان کی تفسیر کشاف میں دیکھی جا سکتی ہے۔

علامہ زمخشری اپنی اسی مہارت اور علمی تفوق کی بنا پر نہایت قلیل مدت میں ایسی گراں قدر تفسیر مرتب کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ اور تفسیر کشاف کے ان ہی پہلوؤں نے علماء و مفسرین کو اس کا گرویدہ بنا دیا ہے۔ علامہ زمخشری کو اپنی تفسیر پر بڑا ناز تھا۔ وہ اکثر یہ اشعار پڑھا کرتے تھے:

ان التفاسیر في الدنیا بلا عدد
ولیس فیها لعمري مثل کشافي
ان کنت تبغي الهدی فالزم قراءته
فالجهل کالداء والکشاف کالکشافي

(دنیا میں تفسیر کی لاتعداد کتابیں ہیں، مگر میری زندگی کی قسم کشاف جیسی ایک بھی نہیں۔ اگر تو ہدایت کا طلبگار ہے تو اسے پڑھتا رہ، اس لیے کہ جہالت ایک بیماری ہے اور کشاف اس سے شفا بخشی ہے۔)

زمخشری کا یہ فخر بالکل بجا ہے۔ اس لیے کہ یہ تفسیر اپنے باب میں منفرد ہے، حتی کہ زمخشری کے مخالفین بھی اس کے تفوق و برتری کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔

7. محمد بن عبد الکریم شہرستانی

محمد بن عبد الکریم شہرستانی کی پیدائش صحیح روایت کے مطابق 479ھ میں ہوئی۔ وہ ایک علمی خانوادے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن شہرستان میں حاصل کرنے کے بعد مدرسہ نظامیہ نیشاپور چلے گئے۔ وہاں قیام کے دوران انہوں نے عربی زبان و ادب، فقہ و اصول فقہ، تفسیر و حدیث اور فلسفہ و علم کلام کی تحصیل کی۔ یہاں کے علماء سے استفادہ کے علاوہ انہوں نے نیشاپور کے عظیم کتب خانہ سے بطور خاص استفادہ کیا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد اپنے وطن شہرستان واپس آ گئے اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ ان کی وفات ستر سال

کی عمر میں 548ھ / 1153ء میں اپنے وطن شہرستان میں ہوئی اور یہیں پیوند خاک ہوئے۔

علمی خدمات

محمد بن عبدالکریم شہرستانی سلجوقی دور کے بہت بڑے مصنف اور ماہر علم کلام تھے۔ فقہ، علم کلام، تفسیر، فلسفہ اور تاریخ الادیان والفرق جیسے مختلف موضوعات پر انہوں نے قلم اٹھایا اور بہت سی کتابیں تحریر فرمائیں۔ شہرستانی کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ انہوں نے گوشہ نشینی کی زندگی گزاری اور عمر کے آخری سالوں تک تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ ان کی تصانیف کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: ایک قسم ان کی کتابوں کی ہے جن کا ذکر مختلف تذکروں میں تو ملتا ہے، مگر ان کا وجود مفقود ہے۔ ممکن ہے ایسی کتابیں یا تو صفحہ ہستی سے نابود ہو چکی ہوں، یا وہ موجود ہوں لیکن ہم ان کی موجودگی سے واقف نہیں ہیں۔ دوسری قسم ان کتابوں کی ہے جو موجود ہیں، شائع ہو چکی ہیں یا اگر شائع نہیں ہوئی ہیں تو ان کے خطی نسخے ایران، روس اور یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

شہرستانی کی مفقود الخبر اور غیر موجود کتابیں:

1. **"تلخیص الاقسام لمذہب الانام فی علم الکلام"** یہ کتاب بعض تذکروں میں "تلخیص الاقسام لمذہب الاعلام" کے نام سے بھی موسوم کی گئی ہے۔
2. **" کتاب العیون و الانہار"** اس کتاب کا ذکر بھی تذکرہ نگاروں نے کیا ہے، لیکن اس کا وجود کہیں نہیں ہے۔ اسی طرح یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کا موضوع کیا تھا۔
3. **" کتاب المناهج والآیات "** شہرستانی نے اس کتاب میں شیخ الرئیس حکیم ابو علی سینا کے عقائد و افکار پر سخت نکیر کی ہے۔
4. **" کتاب الارشاد عقائد الی عقائد العباد"** کتاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کتاب کا موضوع عقائد و کلام ہے۔
5. **" کتاب دقائق الاوهام"۔**
6. **" کتاب المبدء والمعاد "۔**
7. **" شرح سورة یوسف"۔**
8. **" کتاب الاقطار فی الاصول"۔**
9. **"کتاب غایة المرام فی علم الکلام"۔**
10. **"قصه موسی و خضر"۔**
11. **"کتاب اسرار العباده"۔**

شہرستانی کی موجود کتابیں

1. "الملل والنحل"۔
2. "نهاية الاقدام فى علم الكلام" یہ کتاب آکسفور سے شائع ہو چکی ہے۔ کتاب بیس قاعدوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ہر قاعدے میں علم کلام کے کسی اہم مسئلے کو بیان کیا گیا ہے۔ اس سے متعلق متکلمین کی آرا اور ان کے اختلافات کو بیان کرنے کے بعد اپنے اشعری مسلک کی رائے کا ذکر کیا ہے اور اس کی ترجیح کے دلائل قائم کیے ہیں۔
3. "مصدعة الفلاسفه" شہرستانی نے کتاب "الملل النحل" کی تالیف کے بعد امام مجد الدین ابو القاسم علی نقیب ترمذ کی فرمائش پر لکھی۔ اس میں الہیات کے سات مسائل کے متعلق شیخ الرئیس بو علی سینا کے افکار کی تردید کی گئی ہے۔
4. "مجلس فى الخلق والامر"
5. "بحث فى الجوهرالفرد"
6. "شبهات ارسطووبرقلس و ابن سينا"
7. "مفاتيح الاسرارو مصابيح الابرار" یہ کتاب تفسیر قرآن ہے، مگر مکمل نہ ہو سکی۔

شہرستانی کی تمام کتابوں میں سب سے مشہور اور شہرہ آفاق کتاب " الملل والنحل" ہے اور اہل علم میں اس کو نہایت نمایاں مقام حاصل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علمی دنیا میں ان کی شہرت اسی کتاب کی مرہون منت ہے اس لاجواب کتاب کی تحسین و تعریف میں علماء و فضلا نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا اور ہر دور میں اس کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔ انہوں نے اپنی یہ کتاب نقیب ترمذ امام مجد الدین ابو القاسم علی موسوی کی فرمائش پر 521ھ / 1127ء میں تصنیف کی۔ کتاب کے آغاز میں مصنف نے پانچ مقدمات قائم کیے ہیں، جو مذاہب و مسالک کے قیام اور افتراق و انشعاب کے اسباب کی نشاندہی کرتے ہیں۔

8. خازنی

سلجوق دور کے حکماء میں عمر خیام کے بعد سب سے اہم شخصیت خازنی کی ہے۔ اس کا پورا نام عبد الرحمن بن منصور خازنی ہے۔ خازنی نے عربی، یونانی، فارسی زبانوں میں مہارت حاصل کی اور اپنے دور میں رائج کئی دوسرے علوم بھی سیکھے۔ اس کی کتاب "**میزان الحکمت**" قرون وسطی میں علم طبعیات پر لکھی ہوئی کتابوں میں درجہ اول کی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ خازنی نے فلکی مشاہدے بھی کیے اور اپنے تجربات کو ایک کتاب میں قلم بند کیا جو زیچ سنجری کہلاتی ہے۔ خازنی سنجر کے زمانے میں تھا۔

ایک پہاڑ کی چوٹی پر اس نے ایک رصد گاہ(Observatory) قائم کی تا کہ فلکیات کے سلسلے میں اہم معلومات حاصل کی جا سکیں۔ وہ اپنے تمام مشاہدات و تجربات تحریر کرتا تھا، اس طرح اس نے "سنجر کی معتبر جنتری" تیار کی۔ قدیم علم فلکیات میں اس سے بڑی مدد لی گئی۔ اٹلی کے ایک مشہور سائنسدان فلکینو نے اس کے ذریعہ تاریخ فلکیات پر ایک کتاب لکھ دی۔

خازنی نے انکشاف کیا کہ کسی چیز کا وزن سطح زمین پر جتنا ہوتا ہے وہ ہوا میں اس سے کم ہو جاتا ہے۔ اس طرح ہر چیز کا وزن پانی میں کم

ہو جاتا ہے۔ اس نے یہ بھی انکشاف کیا کہ زمین کے چاروں طرف ہوا کا غلاف اس لئے ہے، کیونکہ زمین اس کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ چنانچہ زمین سے جتنا اوپر ہوتے جاتے ہیں ہوا بھی کم ہوتی جاتی ہے۔

خازنی کی کتابیں دستیاب نہیں ہیں، صرف تاریخی حوالے ملتے ہیں۔ اس لئے ان کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کا صحیح تعین کرنا مشکل ہے۔

9. حریری

سلجوقی دور میں یوں تو بڑے بڑے ادباء پیدا ہوئے، لیکن ان میں ایک ممتاز اور نمایاں نام حریری کا ہے۔ اس کی کتاب مقامات عربی انشاء پردازی کا شاہکار سمجھی جاتی ہے۔ عہد غزنوی میں ہمدانی نے مقامات لکھنے کا جو طرز شروع کیا تھا، حریری نے اس کو عروج پر پہنچا دیا۔ حریری عراق کا باشندہ تھا۔

مقامات مقامہ کی جمع ہے جس میں عام طور پر ایک ہیرو ہوتا ہے جو نئے نئے تجربات سے لوگوں کو چونکاتا رہتا ہے اور یہ سب کچھ زبان کی جادوبیانی اور سحر آفرینی سے ہوتا ہے۔ مقامات میں سب سے زیادہ مقبولیت ان پچاس مقامات کو ہے جو "مقامات حریری" کے نام سے معروف ہیں۔ یہ ادب کی بلند پایہ تصنیف مانی جاتی ہے۔ مقامات نویسی میں سارا اہتمام عبارت آرائی، زور بیان اور لفظی شعبدہ بازی پر ہوتا ہے۔

مقامات حریری میں علامہ حریری نے عربی زبان و ادب اور الفاظ کا نمونہ پیش کیا ہے۔ یہ کتاب جتنی زیادہ مغلق ہے اتنی زیادہ دلچسپ بھی ہے۔ مقامات حریری کا موازنہ "ہمدانی کے مقامات" سے کیا جاتا ہے۔ چونکہ مقامات میں کلیدی اہمیت لفظی بازی گری کی ہوتی ہے۔ اس نقطہ نظر سے اگر مطالعہ کیا جائے تو حریری کے مقامات اپنے پیشرو بدیع الزمان الھمدانی کے مقامات سے یقیناً فائق و برتر ہیں۔ زمخشری نے مقامات حریری کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا ہے کہ "حریری کے مقامات آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں"۔ مقامات حریری اپنی گوناگوں خوبیوں کی بنیاد پر عربی ادب کا ایک نادر سرمایہ ہے۔ اس نے عربی کے نادر اور قلیل الاستعمال الفاظ کو جمع کر کے زبان وادب کی گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔

10.10 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- سلجوقیوں کا جد امجد سلجوق بن یکاک تھا۔ اس نے اپنے پورے قبیلے اور خاندان سمیت اسلام قبول کیا۔
- سلجوقی سلطنت گیارہویں صدی سے چودھویں صدی عیسوی کے درمیان مشرق وسطی (Middle East) اور وسط ایشیاء (Central Asia) میں قائم ایک مسلم بادشاہت تھی جو نسلاً اوغوز ترک تھے۔
- سلجوقیوں کے تین بڑے نامور حکمراں ہوئے۔ طغرل، الپ ارسلان اور ملک شاہ سلجوقی۔
- الپ ارسلان اور ملک شاہ کے دور میں نظام الملک طوسی ان دونوں کا وزیر رہا۔ یہ وزیر اپنی خوبیوں میں برامکہ کو بھی پیچھے چھوڑ گیا۔

- سلجوقی دور کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس کے وزیر نظام الملک نے پورے اسلامی ممالک میں مدارس کا جال پچھا دیا۔ اور اسی کے نام پر یہ مدرسے مدرسہ نظامیہ کہلائے۔
- امام غزالی، شیخ عبد القادر جیلانی، مولانا روم اور عمر خیام جیسے علماء، صوفیاء اور سائنسدانوں کا تعلق سلجوقی دور سے تھا۔
- امام غزالی کی اہم کتابیں احیاء علوم الدین، مقاصد الفلاسفہ اور تہافۃ الفلاسفہ ہیں۔
- شیخ عبد القادر جیلانی کی مشہور کتابیں غنیۃ الطالبین، فتوح الغیب، الفتح الربانی والفیض الرحمانی ہیں۔
- مسلم سائنسدانوں میں عمر خیام ایک مشہور نام ہے جس نے ریاضی کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ الجبرا کا موجد خیام کو ہی مانا جاتا ہے۔
- سائنس کی دنیا میں عمر خیام کی کارکردگی اور عالمی پذیرائی کی وجہ سے 1970ء میں چاند کے ایک گڑھے کا نام عمر خیام رکھا گیا اور 1980ء میں ایک سیارے کو عمر خیام کے نام سے موسوم کیا گیا۔
- مولانا رومی کا تعلق سلجوقی دور سے ہی ہے۔ ان کی کتاب مثنوی جیسی کوئی کتاب آج تک فارسی زبان میں نہیں لکھی گئی۔ مثنوی آج بھی شوق سے پڑھی جاتی ہے۔
- جاراللہ زمخشری اپنے وقت کے لغت اور ادب کے امام تھے۔ انہوں نے کشاف کے نام سے قرآن کریم کی ایک تفسیر لکھی جو عقلی اور ادبی نقطہ نظر سے ایک بلند پایہ تفسیر سمجھی جاتی ہے۔
- محمد بن عبد الکریم شہرستانی کی پیدائش بھی سلجوقی دور میں ہوئی۔ ان کی کتاب الملل والنحل اپنے موضوع کی انتہائی اہم اور منفرد کتاب ہے۔
- کتاب مقامات حریری کو کون نہیں جانتا؟ ہندوستان کے مدارس میں درس نظامی کے نصاب کا حصہ ہے۔ یہ کتاب جتنی زیادہ مغلق ہے اتنی زیادہ دلچسپ بھی ہے۔

10.11 نمونہ امتحانی سوالات

10.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. سلجوقیوں کا تعلق کس نسل اور خاندان سے تھا؟

(a). مغل (b). اوغوز ترک (c). بربر (d). عرب

2. سلجوقی سلطنت کا پہلا حکمران کون تھا؟

(a). ملک سنجر (b). طغرل (c). الپ ارسلان (d). ملک شاہ

3. سلجوقی دور کا سب سے عظیم کارنامہ کیا ہے؟

(a). مدارس کا قیام (b). مکہ و مدینہ کی فتح (c). آرمینیا کی فتح (d). ملاز کرد کی فتح

4. امام غزالی کی مشہور کتاب کون سی ہے ؟

(a). میزان العمل (b). مقاصد الفلاسفہ (c). تہافتۃ الفلاسفۃ (d). احیاء العلوم

5. غنیۃ الطالبین کس کی تصنیف ہے ؟

(a). مولانا روم (b). امام غزالی (c). شیخ عبد القادر جیلانی (d). عمر خیام

6. سلجوق دور کے کس مسلم سائنسدان کے نام پر ایک سیارے کا نام رکھا گیا؟

(a). ادریسی (b). عمر خیام (c). ابن سینا (d). ابن رشد

7. خیام کا زیادہ تر علمی کام کس موضوع سے متعلق ہے ؟

(a). حساب (b). ادب (c). فقہ (d). تفسیر

8. مثنوی کس کی تصنیف ہے ؟

(a). مولانا روم (b). شیخ جیلانی (c). غزالی (d). خازنی

9. جار اللہ زمخشری کی سب سے اہم کتاب کا نام کیا ہے ؟

(a). تفسیر کشاف (b). المفصل فی النحو (c). اساس البلاغۃ فی اللغۃ (d). المفرد و المرکب فی العربیہ

10. الملل و النحل کس کی تصنیف ہے ؟

(a). ابن عربی (b). شہرستانی (c). البیرونی (d). خازنی

10.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. مثنوی مولانا روم کا تعارف پیش کیجیے۔
2. تفسیر کشاف پر مختصر نوٹ لکھیے۔
3. شہرستانی کی علمی خدمات بیان کیجیے۔
4. خازنی کی علمی خدمات بیان کیجیے۔
5. مقامات حریری کا تعارف کیجیے۔

10.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. امام غزالی کی علمی خدمات خاص کر ان کی کتاب احیاء العلوم کا تفصیلی تعارف لکھیے۔
2. عمر خیام کی علمی و سائنسی سے خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

3. سلجوق دور کی علمی خدمات کا ایک جائزہ پیش کیجیے۔

10.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.	نظام الملک طوسی	:	عبد الرزاق کانپوری
2.	تذکرہ شیخ عبد القادر جیلانی	:	سید ابوالحسن علی ندوی
3.	سوانح مولانا روم	:	شبلی نعمانی
4.	سوانح مولانا روم	:	سید میاں اصغر حسین
5.	ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ جلد اول	:	ثروت صولت
6.	تاریخ دعوت وعزیمت حصہ اول	:	سید ابوالحسن علی ندوی
7.	تاریخ اسلام حصہ چہارم	:	شاہ معین الدین احمد ندوی
8.	شعر العجم حصہ اول	:	شبلی نعمانی
9.	سلاجقہ	:	مولانا ابوالاعلی مودودی
10.	الغزالی	:	شبلی نعمانی

اکائی 11: غزنوی حکومت کا قیام واستحکام

اکائی کے اجزا:

11.0 تمہید

11.1 مقاصد

11.2 غزنوی حکومت کا تعارف اور وجہ تسمیہ

11.3 غزنوی حکومت کے قیام کا پس منظر

11.4 امیر الپتگین و امیر سبکتگین اور غزنوی حکومت کا قیام

11.5 محمود غزنوی اور حکومت کا استحکام

11.5.1 محمود غزنوی حیات

11.5.2 محمود غزنوی بہ حیثیت حکمراں اور فاتح

11.6 اکتسابی نتائج

11.7 نمونہ امتحانی سوالات

11.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

11.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

11.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

11.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

11.0 تمہید

خلافت عباسیہ اپنے عہد عروج میں دنیا کی وسیع ترین اور بڑی مضبوط حکومت تھی۔ دنیا کے مختلف گوشوں کے مسلمان سوائے اسپین کے خلافت عباسیہ کے تحت ایک سیاسی وحدت کا حصہ تھے لیکن عباسی خلافت کے زوال کے بعد اس سیاسی وحدت اور امت کے اتحاد کا

کا خاتمہ ہوگیا۔ جس صوبے دار کو جہاں موقع ملا۔ اس نے ایک خود مختار حکومت قائم کرلی۔ اس طرح ایک مرکزی حکومت کی جگہ کئی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ یہ حکومتیں یکے بعد دیگرے بھی اور بیک وقت بھی مختلف علاقوں میں قائم ہوئیں۔ انہی میں سے ایک حکومت غزنوی حکومت تھی۔ جس کا قیام سامانی حکومت کے بعد عمل میں آیا۔

11.1 مقاصد

اس اکائی میں غزنوی کے بارے میں مکمل تعارف حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی اور متعدد ضروری معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ مثلاً غزنوی حکومت کب، کیسے اور کس کے ذریعے قائم ہوئی۔ حکومت کس خطے میں قائم ہوئی اور اس کی حدود کہاں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس حکومت کے اہم سلاطین کون کون ہیں۔ جنہوں نے اس کے قیام واستحکام میں اہم کردار ادا کیا۔ اس حکومت کی بنیادی امتیازی خوبیاں کیا تھیں جس کی بدولت تاریخ اسلام کی اہم حکومتوں میں اس کا شمار کیا جاتا ہے۔

11.2 غزنوی حکومت کا تعارف اور وجہ تسمیہ

چوں کہ اس حکومت کے سلاطین نے غزنی کو اپنا دارالحکومت بنایا اس لیے یہ حکومت غزنوی حکومت کہلائی۔ دراصل غزنی مشرقی افغانستان کا ایک شہر ہے۔ اسے غزنیں، غزنہ اور غزنو بھی کہا جاتا ہے۔ اس شہر کو اولیاء کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ اس شہر کے جنوب مغرب میں قلات، شمال مشرق میں کابل، اور مشرق میں گردیز شہر آباد ہیں۔ یہ شہر غزنی کے بادشاہوں کے عروج کے عہد میں دارالخلافہ رہا ہے۔ خاص کر اس کی شہرت اس حکومت کے ایک اہم سلطان محمود غزنوی کے ذریعہ زیادہ عام ہوئی۔ اس کے عہد میں اسے حضرت غزنی کہا جاتا تھا۔ اس دور میں یہ شہر قوت وشوکت اور اسلامی عظمت کا بے مثال نمونہ تھا۔ موجودہ دور کے غزنی سے شمال مشرق میں تقریباً پانچ کلو میٹر کے فاصلے پر قدیم غزنی کے کھنڈرات اور غزنی شہر کے آثار کافی اچھی شکل میں موجود ہیں۔ موجودہ دور کا غزنی عہد قدیم میں خراسان کا اہم شہر تھا جو اب افغانستان کہلاتا ہے۔ 962ء سے 1187ء تک سلطنت غزنویہ کا دارالحکومت رہا اس لیے یہ حکومت حکومت غزنویہ کہلائی۔ اس کے اہم سلاطین درج ذیل ہیں۔

سبکتگین	محمود	مسعود	ابراہیم	مسعود دوم	ارسلان شاہ
بہرام شاہ	خسرو ملک				

یہ غزنوی حکومت کے اہم سلاطین شمار کیے جاتے ہیں۔

11.3 غزنوی حکومت کے قیام کا پس منظر

غزنوی حکومت کے قیام سے پہلے ان احوال وکوائف اور اسباب کا جاننا ضروری ہے جن کی بدولت غزنوی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ غزنوی حکومت سے پہلے ماوراء النہر میں سامانی حکومت قائم تھی۔ سامانی حکومت کا عہد (874ء-1005ء/261ھ-395ھ) ہے۔ یہ

اپنے عہد کی ایک مضبوط، مستحکم اور مستقل آزاد مسلم حکومت تھی۔ ماوراء النہر کے علاوہ موجودہ افغانستان اور خراسان کے خطے اس حکومت کا حصہ تھے۔ اپنے آخری عہد میں سامانی حکومت بھی عباسی خلافت کی طرح کمزور ہوتی چلی گئی۔ اس کے بہت سے صوبے داروں نے بغاوت کا علم بلند کیا۔ امیر الپتگین کا غلام سبکتگین جو اس کا داماد بھی تھا۔ الپتگین کے بعد سامانی فوجوں کا امیر الجیش مقرر ہوا۔ جب ہر طرف بغاوت ہونے لگی تو سبکتگین نے بغاوت کا علم بلند کیا اور سامانیوں سے آزاد ایک مستقل حکومت قائم کرلی۔ یہ حکومت تاریخ میں دولت غزنویہ اور دولت آل سبکتگین کے نام سے موسوم ہوئی۔ امیر الپتگین اور سبکتگین کے بعد محمود غزنوی اس حکومت کا ایک بڑا حکمراں ہوا جس نے اس حکومت کے استحکام میں اہم کردار ادا کیا۔

11.4 امیر الپتگین و امیر سبکتگین اور غزنوی حکومت کا قیام

امیر الپتگین در اصل ایک ترکی غلام تھا جو سامانی حکومت کے عہد میں اپنے تماشے وغیرہ دکھا کر سامانی حکومت کا قرب حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ سامانی خاندان کے لوگ بالعموم اس دستور کے پابند تھے کہ وہ امانت کے عہدوں پر اپنے بھروسے کے غلاموں کو سرفراز کرتے تھے اور بادشاہوں کے حاجب ہوتے تھے۔ بسااوقات قرب اور صلاحیت کی بناپر دور دراز کے صوبوں کے حاکم بھی مقرر کر دیے جاتے تھے۔ غلام الپتگین بھی نہایت ہوشیار، جواں مرد، دیانت دار اور سامانیوں کا امانت دار شخص بن چکا تھا۔ سامانی حکمراں عبدالملک بن نوح سے اسے خراسان کا حاکم مقرر کر دیا۔ سلطان عبدالملک کی وفات کے بعد بخارا (سامانی حکومت کا دارالخلافہ) سے امراء نے قاصد کو الپتگین کے پاس بھیجا کہ وہ اس سے سلطان کے جانشین کے سلسلے میں مشورہ کرے کہ کون سلطان بنالیا جائے۔ الپتگین نے قاصد کو کو عبدالملک کے بعد اس کے بیٹے منصور کے بجائے اس کے چچا کی تاج پوشی کا مشورہ دیا۔ اور کہا کہ منصور باوجود اہلیت ولیاقت کے ابھی کم عمر ہے۔ ابھی قاصد اس کی یہ رائے لے کر امرائے بخارا کے پاس نہیں پہونچا تھا کہ لوگوں نے منصور کو سلطان کے طور پر مسند حکومت پر بٹھا دیا۔ منصور کو سلطان بننے کے بعد جب الپتگین کی رائے کے بارے میں معلوم ہوا تو اس نے غصے میں الپتگین کو خراسان کی حکومت سے معزول کر کے دربار میں طلب کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ الپتگین اگر منصور کے دربار میں آتا تو عتاب وعذاب کا شکار ہوتا اور شاید پوری عمر قید وبند کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتا۔ الپتگین نے منصور کے ارادوں کو بھانپ لیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ خراسان چھوڑ کر غزنی کوچ کرے گا۔ اس نے تین ہزار غلام سپاہ کا لشکر اپنے ہمراہ لیا اور امیر انوک سے غزنی چھین لیا اور راستے کے علاقے بلخ، ہرات اور سیستان وغیرہ فتح کرتا ہوا غزنی کے علاقے کا خود مستقل بادشاہ بن گیا۔ سامانی امیر منصور نے دوبار لشکر بھیجے۔ مگر الپتگین کے سامنے ان دونوں لشکروں کو پسپائی نصیب ہوئی۔ الپتگین کی اس فتح وکامرانی میں جہاں اس کے ساتھ ہمراہ آئے تین ہزار غلام کی سپاہ کا اہم کردار تھا وہیں افغانستان کے قوی ہیکل، جنگجو اور بہادر باشندوں کا بھی اہم کردار تھا۔ جنہوں نے پورے طور پر الپتگین کا ساتھ دیا۔ ان ترک غلاموں کی بدولت دوسرے بہت سے ترک غلاموں کی آمدورفت کا الپتگین کے دربار میں سلسلہ شروع ہوا۔ اس طرح افغان جوانوں اور ترک غلاموں کی بدولت الپتگین ایک مضبوط حکومت قائم کرنے اور تقریباً پندرہ برس تک پورے شان وشوکت اور اقبال کے ساتھ حکومت کرنے میں کامیاب رہا۔ وہ نہایت انصاف پسند اور رعایا پرور حکمراں تھا۔

الپتگین کے غلاموں میں ایک غلام تھا سبکتگین۔ سبکتگین دراصل ایران کا امیر زادہ تھا اور یزدجرد کی نسل سے تھا۔ مگر وہ الپتگین کا غلام تھا۔ لیکن محمد قاسم فرشتہ نے اسے ترکی نژاد غلام قرار دیا ہے یہ تضاد شاید اس لیے پیدا ہوا ہے کہ سبکتگین کو نصر حاجی نامی ایک سوداگر نے ترکستان سے لاکر امیر الپتگین کے ہاتھوں فروخت کر دیا تھا۔ اس طرح وہ یزدجرد کی نسل کا امیر زادہ ہونے کے باوجود ترکی النسل غلام بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ تاریخ فرشتہ میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ سبکتگین کی فہم و فراست، شجاعت و بہادری دیکھ کر امیر الپتگین نے اسے بلند مرتبے پر پہنچایا۔ الپتگین کے لشکر کا سپہ سالار اور دربار کا بڑا اہل کار سبکتگین ہی تھا۔ وہ اپنے آقا کے ساتھ ہمیشہ جنگوں میں شریک رہا اور بہادری کے کارنامے انجام دیتا رہا۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ الپتگین نے اس سے اپنی بیٹی کا نکاح بھی کر دیا تھا اور اسے تخت و تاج کا وارث بنا دیا تھا۔ لیکن اس کی جانشینی کے سلسلے میں تاریخ فرشتہ کے مصنف محمد قاسم فرشتہ کی رائے مختلف ہے۔ "وہ کہتے ہیں کہ الپتگین کا بیٹا تھا ابو اسحق۔ الپتگین کی وفات کے بعد سبکتگین ابو اسحق کو لے کر بخارا گیا اور وہاں سے غزنی حکومت کی سند اجازت دلا لایا اور سارے ملکی و مالی کاموں کا خود ذمہ دار بنا رہا۔ لیکن امیر ابو اسحق کے بعد بلکاتگین اور اس کے بعد امیر پرسی کو تخت نشینی کے بعد امیر سبکتگین نے اسے قتل کر دیا اور غزنی کا خود حاکم بن گیا اور اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس طرح سامانیوں کے قبضے سے غزنی الپتگین کے ذریعے آزاد ہوا۔ لیکن بعد میں وہاں سبکتگین نے 366ھ / 977ء میں آل سبکتگین یا غزنوی حکومت کی بنیاد رکھی اور بعد میں خراسان پر بھی قبضہ کر لیا۔ یہ غزنوی حکومت آزاد اور خود مختار حکومت تھی۔ اس طرح غزنوی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔

سبکتگین نے (977ء-997ء / 366ھ-387ھ) تقریباً بیس سال حکومت کی اس کے بعد اس کا بیٹا محمود غزنوی تخت نشین ہوا۔ جو غزنوی خاندان کا سب سے بڑا مشہور نامور حکمراں ہوا ہے۔ اس کا شمار تاریخ اسلامی کے مشہور عظیم حکمرانوں میں ہوتا ہے۔

11.5 محمود غزنوی اور حکومت کا استحکام

سبکتگین کا بیس سال کی حکومت کے بعد 977ء / 387ھ میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا محمود غزنوی تخت نشین ہوا۔ محمود غزنوی سبکتگین خاندان کا سب سے بڑا حکمراں ہوا ہے۔ اس کا شمار تاریخ اسلامی کے بڑے اور عظیم سلاطین میں ہوتا ہے۔ محمود بچپن سے ہی بڑا انڈر اور بہادر تھا۔ وہ اکثر و بیشتر اپنے باپ کے ساتھ لڑائیوں میں شریک ہوتا تھا اور بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ اس چیز نے اس کو جنگی مہارت کی خوبی سے بھی آراستہ کر دیا تھا۔ جو ہر دور میں سلاطین کی کامیابی کی اولین شرط ہوا کرتی ہے۔

جب امیر سبکتگین کی لاہور کے راجا جے پال سے ملتان میں معرکہ آرائی ہوئی تو اس معرکے میں کم سنی کے باوجود امیر محمود غزنوی نے بہادری کے ایسے جوہر دکھائے کہ ان کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے۔ اسی معرکے میں امیر محمود کو سفارتی گفتگو کے دوران اس بات کا اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ اہل ہند اور خاص طور پر راج پوت کی خاص منفی صفت یہ ہے کہ ان پر جب کوئی مصیبت آتی ہے اور اس سے نجات کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا تو وہ آخر کار یہ قدم اٹھاتے ہیں کہ اپنا تمام مال و اسباب اور بیش قیمت اشیاء مایوس ہو کر آگ کی نذر کر دیتے ہیں حتیٰ کہ اپنی عورتوں اور حرم سراؤں کو بھی نذر آتش کر دیتے ہیں اور جب ہر طرح کے دنیاوی مال و متاع سے مکمل محروم ہو جاتے ہیں تو دشمن

سے زبردست معرکہ آرائی کرتے ہیں اور خود کو معرکے میں فنا کر دیتے ہیں اور برباد ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا محمود نے راجا جے پال کی صلح کی پیش کش قبول کر لی۔ جس کو بعد میں چل کر جے پال نے عہد شکنی کر کے باقی نہیں رکھا اور پھر جنگ کے نتیجے میں شکست خوردہ ہو کر مارا گیا۔ امیر محمود نے والد سبکتگین کی موجودگی میں ان تجربات سے بہت کچھ سیکھا۔ اس چیز نے محمود کے اندر قائدانہ صلاحیتوں اور جنگی مہارتوں کو پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور محمود غزنوی ایک اہم سلطان اور ماہر جنگ حکمراں کی حیثیت سے روئے زمین پر نمودار ہوا۔

11.5.1 محمود غزنوی حیات

بالعموم مورخین نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ سلطان محمود دنیاوی اور دینی خوبیوں کا مجموعہ تھا۔ وہ اپنی دلیری، شجاعت، عدل وانصاف اور انتظام سلطنت اور فتوحات کے لیے پوری دنیا میں معروف ومشہور تھا۔ وہ سلطنت غزنویہ کا پہلا آزاد حکمراں تھا جس نے غزنوی سلطنت کی توسیع واستحکام کے لیے زبردست اقدامات کیے۔ اور شاید پہلا حکمراں تھا جس نے اپنے لیے سلطان کا لقب اختیار کیا۔ اس نے 999ء سے لے کر 1030ء تک حکومت کی اور اپنی حکومت کو ایک وسیع فوجی سلطنت میں تبدیل کر دیا۔ جو شمال مغرب میں ایران سے لے کر مشرق میں پنجاب تک، اور شمال میں ماوراء النہر میں خوارزم اور مکران تک پھیلی ہوئی تھی۔

سلطان محمود غزنوی 2/نومبر 971ء کو غزنی میں پیدا ہوا۔ اسے یمین الدولہ ابوالقاسم محمود غزنوی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس کے والد امیر سبکتگین تھے۔ اس کا ایک بھائی اسماعیل غزنوی تھا۔ جب کہ اس کے چار بیٹے تھے۔ محمد غزنوی، مسعود غزنوی، عزالدولہ اور عبدالرشید۔

اس کی ابتدائی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ محمود کی والدہ امیر الپتگین کی بیٹی تھیں۔ اور زابلی شریف گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ اسی لیے محمود کو بھی محمود زابلی کے نام سے پکارا گیا ہے۔ وہ احمد میماندی کا اسکول کا ساتھی تھا۔ جو اس کا رضاعی بھائی بھی تھا۔ احمد میماندی فارس کے دارالحکومت زابلستان کا باشندہ تھا۔

سلطان محمود 971ء/357ھ میں عاشورہ کی رات کو پیدا ہوا تھا۔ اس کے پیدا ہونے سے ایک گھڑی قبل اس کے باپ سبکتگین نے خواب میں دیکھا کہ اس کے مکان میں آتش دان کے اندر سے ایک درخت نکلا اور اس قدر بلند ہوا کہ ساری دنیا اس کے سائے میں آگئی۔ سبکتگین کی جب آنکھ کھلی تو وہ اس خواب کی تعبیر کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اسے محمود کی پیدائش کی خبر سننے کو ملی۔

سلطان محمود غزنوی بڑے عاشقین رسول میں سے تھا۔ نبی اکرمؐ کی تعلیمات پر عمل کرنے اور قرآن وسنت کی پاس داری رکھنے والا عظیم حکمراں تھا۔ اس نے اپنے عہد میں قابل قدر اصلاحات کیں۔ اس کی معرکہ آرائیوں کی وجوہات بتاتے ہوئے مورخین نے ایک اہم وجہ یہ بھی لکھی ہے کہ وہ اسلام اور انصاف کو عام کرنا چاہتا تھا اور ظلم وتعدی کی بنا پر قائم حکومتوں سے عوام نجات دلانا چاہتا تھا۔ اس کی انصاف پسندی کا ہر طرف بول بالا تھا۔ ان اوصاف حمیدہ کے باوجود مورخین نے اسے حریص اور لالچی لکھا ہے۔ تاہم محمد قاسم فرشتہ نے مورخین کی اس رائے کو مورخین کی کم توجہی کا ثبوت قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسے دولت سے محبت تھی۔ وہ حتی الامکان اسے جمع کرنا چاہتا تھا لیکن اسے دولت فراخ دلی سے خرچ کرنا بھی آتا تھا۔ وہ خرچ بھی کرتا تھا۔ اس امر کی شاہد یہ بات ہے کہ اس کے دربار میں شعراء،

اہل علم اور ماہرین علوم وفنون نیز باکمال روز گار کے ماہرین اس قدر جمع تھے کہ اس عہد میں شاید ہی کسی اور کے دربار میں اس قدر جمع رہے ہوں۔ اور بغیر عنایات بخششوں کے دربار میں ایسے لوگوں کو جمع کرنا ممکن نہیں۔ وہ ہمیشہ باکمال لوگوں کی قدر کرتا اور ان سے دوستی رکھتا تھا۔ تاہم بخیل اور حریص ہونے کا الزام شاید اس لیے لگانا آسان ہو گیا کہ اس نے فردوسی طوسی کے ساتھ جو کیا، وہ مناسب نہیں تھا۔ شاید اس کے فردوسی کے ساتھ ناروا سلوک سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس نے اپنی آخری عمر میں بلاضرورت اپنی رعایا اور دولت مندوں سے روپیہ طلب کیا۔

محمود غزنوی کے بارے میں آتا ہے کہ وہ شکل وصورت کا اچھا نہیں تھا، لیکن سیرت کے اعتبار سے نہایت اعلیٰ مقام پر فائز تھا۔

11.5.2 محمود غزنوی بہ حیثیت حکمران اور فاتح

محمود غزنوی ایک احسان شناس حکمران تھا۔ وہ امیر منصور سامانی کے عہد میں چاہتا تو بغاوت کرکے مستقل حکومت کی بنا رکھ سکتا تھا۔ لیکن احسان فراموشی کے بدنما داغ سے خود کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ اس کا اندازہ اس کے اس خط سے ہوتا ہے جس کا تذکرہ تاریخ فرشتہ میں محمد قاسم فرشتہ نے کہا ہے:

"سلطان محمود نے اپنا قاصد بہت سارے تحفوں کے ساتھ امیر منصور کے پاس بھیجا تو اسے پیغام لکھا کہ بادشاہ کی دوراندیشی سے مجھے توقع ہے کہ ہماری دیرینہ دوستی اور خلوص کی مضبوط بنیادیں بے رخی کی وجہ سے کمزور نہ ہوں گی۔ میرے والد کے حقوق خدمت جو آل سامان پر ہیں نظر انداز نہ کیے جائیں گے اور دنیا کی کوئی بھی چیز ہمارے آپس کے رشتہ اخوت ومحبت کو توڑ کر فرماں برداری کی بنیادوں کو مسمار نہ کر سکے گی"۔ لیکن امیر منصور نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ لہٰذا اس نے نیشاپور پر حملہ کیا اور فتح کر لیا۔ تاہم احسان فراموشی کے داغ سے بچنے کے لیے اس نے نیشاپور چھوڑ دیا اور مرغاب چلا گیا۔ اسی زمانے میں بکتوزن نے جو خراسان کا آل سامان کی طرف سے امیر تھا، سامانیوں سے غداری کی۔ امیر منصور کو قید کر لیا اور اس کی آنکھوں میں سلائیاں پھیر وادیں۔ اس کے چھوٹے بھائی امیر عبدالملک کو تخت پر بٹھا دیا اور خود سلطان محمود کے ڈر سے مرو بھاگ گیا۔ سلطان محمود کو جب اس کی خبر لگی تو سلطان محمود نے اس کا تعاقب کیا اور اس سے اس کی غداری کی سزا دینے کے لیے معرکہ آرائی کی اور محمود کامیاب ہوا۔ لیکن بکتوزن فرار ہو گیا اور اس نے سلطان سے جنگ کرنے کی تیاری کی۔ ابھی سلطان محمود سے جنگ کی تیاری میں مصروف تھا کہ بکتوزن کی موت ہو گئی۔ اور کچھ ہی عرصے بعد عبدالملک کی موت کے بعد آل سامان کا خاتمہ ہو گیا۔ اس طرح سلطان محمود کو اطمینان کے ساتھ بلخ اور خراسان پر حکومت کا موقع مل گیا۔ اور اس کی شان وشوکت اور قوت وطاقت کا ہر طرف شہرہ ہو گیا۔ یہیں سے اسے یمین الدولہ اور امین الامت کا خطاب ملا۔ جو اسے بغداد عباسی خلیفہ کے قادر باللہ نے عطا کیا تھا۔

398ھ کو محمود بلخ سے ہرات آیا اور پھر ہرات سے سیستان آیا اور وہاں کے حاکم کو مطیع بنا کر واپس غزنی آ گیا۔ غزنی پہنچ کر وہ ہندوستان کی طرف متوجہ ہوا۔ اور ہندوستان کے چند قلعوں کو فتح کرکے اپنے دارالسلطنت آ گیا۔ دوسری طرف ایلک خاں نے ماوراء النہر کو آل سامان کے قبضے سے نکال کر سلطان محمود کی خدمت میں فتح نامہ ارسال کیا اور مملکت خراسان پر قبضہ کرنے کی خوش خبری سنائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایلک خاں سے تعلقات بہتر اور پختہ ہوئے اور سلطان محمود کا رشتہ ایلک خاں کی بیٹی سے طے ہو گیا۔ لیکن مرور ایام کے ساتھ

بد خواہوں کی وجہ سے یہ تعلق قائم نہ رہ سکا۔ اور یہ رشتہ بھی ادھورا رہ گیا۔

سلطان محمود کو ہندوستان کے علاقوں کو فتح کرنے میں کچھ زیادہ دل چسپی تھی۔ پہلی بار اس نے 391ھ میں پشاور آکر لاہور کے راجہ جے پال سے معرکہ آرائی کی اور کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد ہی وہ اسلامی فاتح ہونے کی وجہ سے محمود غازی کہلایا۔ جے پال گرفتار ہوا۔ محمود کو اس جنگ میں زبردست مال و دولت ہاتھ لگی۔ جو لگ بھگ ایک لاکھ اسی ہزار دینار کے برابر تھی۔ بعد میں جے پال کو باج گزار بنا کر رہا کر دیا۔

393ھ میں سلطان محمود نے ایک بار پھر سیستان کا رخ کیا اور وہاں سے غزنی واپس آکر ہندوستان کو فتح کرنے کی غرض سے 395ھ میں غزنی سے بھاطنہ کی طرف روانہ ہوا۔ بھاطنہ دراصل بھائیہ ہے جو ملتان کے قریب ایک مقام ہے اور ایک ہندو راجا بجے راؤ کا دارالسلطنت تھا۔ وہ فوج کی کثرت، ہاتھیوں کی قوت اور طاقت کی بنا پر کسی کو خاطر میں نہ لاتا۔ نہ اس نے سبکتگین کی پروا کی اور نہ کبھی جے پال سے ڈرا۔ سلطان محمود نے اس پر چڑھائی کی اور کافی جدوجہد اور مشقت کے بعد فتح یاب ہوا۔ بجے راؤ نے راہ فرار اختیار کی اور جنگل میں جا چھپا۔ لیکن محمود کے فوجی وہاں بھی جا پہنچے تو اس نے خودکشی کر لی۔

اس کے بعد سلطان محمود نے ہندوستان کے متعدد شہروں اور علاقوں کو فتح کیا۔ ان میں ملتان بہت اہم ہے جہاں اس نے ابوالفتح حاکم لاہور کو شکست دی۔ ابوالفتح دراصل لاہور کے حاکم شیخ حمید لودھی کو پوتا تھا۔ شیخ حمید امیر سبکتگین کے بہی خواہوں میں سے تھا۔ لیکن پوتے ابوالفتح نے محمود سے بغاوت کی تو اس نے اس پر لشکر کشی کی۔ راستے میں راجا انند پال کو شکست دی جو راہ میں روڑا بن کر ابوالفتح کی مدد کر رہا تھا۔ ابوالفتح نے انند پال کی شکست دیکھ کر محمود سے معافی کی درخواست کی اور باج گزار بن کر رہنے پر معاہدہ کر لیا دوسری طرف محمود نے ایلک خان کی وجہ سے پیدا شدہ حالات کی بنا پر واپس غزنی جانے کا فیصلہ کیا۔ اور اس علاقے کی ذمہ داری راجہ سکھ پال کے سپرد کی جو مسلمان ہو گیا تھا۔ سکھ پال تاریخ میں باشا کے نام سے مشہور ہے۔

سلطان محمود ادھر ملتان کے علاقے میں مصروف جنگ تھا، اسی دوران کے اس کے دوست رہے ایلک خان نے لالچ کیا اور خراسان فتح کر کے محمود سے چھین لینے کا منصوبہ بنایا۔ سلطان محمود نے غزنی آکر فوج جمع کی اور ایلک خاں سے مقابلے کے لیے بلخ روانہ ہو گیا۔ محمود کی آمد کی خبر پا کر ایلک خاں کا سالار جعفر تگین بھاگ کھڑا ہوا۔ ایلک خاں نے چین کے بادشاہ قدر خاں سے مدد طلب کی۔ اور محمود کے مقابلے کے لیے بلخ کے قریب مقیم ہوا۔ جنگ میں محمود کو کامیابی ملی۔ ایلک خاں اور قدر خاں جان بچا کر بھاگے اور دریائے جیحون پار کر کے اپنے ملک میں دم لیا۔

جب محمود ملتان فتح کرنے کے لیے آیا تو راجا انند پال نے ہندوستان کے دوسرے راجاؤں سے مدد لے کر محمود کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ اجین، گوالیار، کالنجر، قنوج، دہلی اور اجمیر وغیرہ راجاؤں نے اس کی زبردست مدد کی۔ یہ فوج اب تک کی سب سے بڑی فوج تھی جو سلطان محمود سے مقابلے کے لیے پشاور میں جمع ہوئی۔ پشاور کے جنگل میں مقابلہ ہوا۔ چالیس روز جنگ چلتی رہی اس میں محمود نے خندق کھود کر جنگ کی اور کامیابی محمود کو ملی۔

اس عظیم الشان کامیابی کے بعد سلطان محمود نے نگر کوٹ فتح کیا جہاں کا قلعہ بھیم بہت مشہور تھا۔ اس کے علاوہ سلطان محمود نے ہندوستان کی طرف غور، تھانیسر، نندنہ (نندونہ)، قنوج، میرٹھ، مہاون، متھرا، منج، قلعہ چندپال وغیرہ کو فتح کیا یا ان پر لشکر کشی کی۔ ان فتوحات اور کامیابیوں نے بعد علماء و زاہدوں کے ایک گروہ نے سلطان محمود سے گزارش کی آپ اسلام کے لیے غیروں سے نبرد آزمائی تو کرتے ہیں لیکن آپ کی بیت اللہ کے راستے پر نظر نہیں پڑتی جہاں ایک مدت سے بدویوں اور قرامطہ نے راہزنی کا طریقہ اختیار کر کے حاجیوں کے لیے راستے کو بند کر دیا ہے۔ مسلمان اس کی وجہ سے حج کے فریضے سے محروم ہیں۔ سلطان محمود نے ان کی بات قبول کی اور اس جانب توجہ دی اور بدویوں کی سرزنش بھی کی اور راستے کو مامون بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس سرزنش کے اثرات قرامطہ پر بھی پڑے۔ شاید اسی وجہ سے سلطان محمود پر سنی حمایتی سلطان ہونے اور شیعہ مخالف ہونے کا الزام بھی لگا دیا گیا۔

سلطان محمود نے غزنی کی حکومت مضبوط و وسیع بنانے کے لیے خوارزم پر حملہ کیا اور کامیاب ہوا۔ ہندوستان میں ایک بار پھر راجا انند پال سے جنگ ہوئی۔ جو قنوج کے راجا نندا کی مدد کے لیے محمود کی راہ میں حائل ہوا۔ انند پال کئی بار شکست کھا چکا تھا۔ ایک بار پھر شکست کھائی۔ پھر محمود نندا کی طرف بڑھا اور فتح یاب ہوا۔ لیکن وہ پنجاب اور آگے کے دیگر علاقوں سے مطمئن نہ تھا، اس لیے غزنی واپس چلا گیا۔ اس نے قیرات، ناردین اور ایک بار پھر لاہور کو فتح کیا۔

ان تمام فتوحات کے علاوہ سومنات (گجرات) کی فتح محمود کی ایک اہم فتح تھی۔ کہا جاتا ہے کہ محمود اسلامی عقائد کی پختگی کی مثال تھا۔ سومنات کے بارے میں ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ سومنات ہی روحوں کو اعمال کے مطابق نیا جسم عطا کرتا ہے یعنی تناسخ ارواح کا تصرف سومنات کے پاس ہے۔ ایک عقیدہ یہ بھی تھا سمندر کا مدوجزر در اصل سومنات کی عبادت ہے جو سمندر کرتا ہے۔ ان غلط عقائد کی بدولت محمود کو سومنات پر حملہ کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس نے تیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ 415ھ کو سومنات کے لیے روانگی کی۔ راستے کے بہت سے قلعے فتح کرتے ہوا محمود پٹن گجرات پہنچا۔ وہاں کے باشندوں نے محمود کے خوف سے شہر خالی کر دیا۔ اور محمود مال غنیمت وغلہ وغیرہ لے کر سومنات پہونچا۔ محمود اور اس کی فوج کی اولوالعزمی دیکھ کر مضبوط قلعے کے باوجود سومنات کے لوگ شکست خوردہ ہوئے۔ فتح سومنات کے بعد جب محمود نے سومنات کا بت دیکھا تو اسے توڑنے کا ارادہ کیا لیکن معزز ہندوؤں کی درخواست اور اپنے بعض مصاحبین کی سفارش پر کہ بت توڑا نہ جائے بلکہ اسے چھوڑ دیا جائے اور اس کے بدلے معاوضہ لے لیا جائے۔ محمود نے اس کا جواب دیا کہ تمہاری بات صحیح ہے لیکن اگر میں نے معاوضہ لے کر بت چھوڑ دیا تو میرے مرنے کے بعد دنیا مجھے محمود بت فروش پکارے گی۔ اور اگر توڑ دیا تو محمود بت شکن کے نام سے یاد کرے گی۔ لہٰذا مجھے بت شکن کہلانا عزیز ہے نا کہ بت فروش۔ چناں چہ جب اس نے بت توڑا۔ تو اس میں سے بیش بہا جواہر اور موتی نکلے جن کی قیمت ہندوؤں کے پیش کردہ معاوضہ سے سو گنا زائد تھی۔

ان فتوحات کے علاوہ محمود نے جٹائی قوم پر بھی حملہ کیا اور فتح یاب ہوا۔ ترکمانی سلجوقیوں سے معرکہ کیا اور زبردست شکست دی اور اس طرح فتوحات میں مصروف پوری زندگی گزار دی۔ 421ھ میں 23 ربیع الثانی بروز جمعرات مرض سل (ایک متعدی مرض) کے سبب وفات پا گیا۔

اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ محمود غزنوی نے اپنے باپ سبکتگین کے بعد غزنی کا بادشاہ بنا اور بادشاہ بننے کے بعد اپنی سلطنت کو زبردست وسعت دی اور استحکام بخشا۔ محمود ایک بڑا کامیاب سپہ سالار اور عظیم فاتح تھا۔ شمال میں اس نے خوارزم اور بخارا پر قبضہ کیا اور سمرقند کے علاقے چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کو اپنا مطیع و باج گزار بنالیا۔ جنوب میں اس نے رے، اصفہان، ہمدان کے علاقے فتح کر لیے جو بنوبویہ کے قبضے میں تھے۔ مشرق میں اس نے وہ تمام علاقہ قریب قریب اپنی سلطنت میں شامل کر لیا جو اب مغربی پاکستان کہلاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی فوجیں دہلی، متھرا، قنوج، کالنجر اور سومنات تک پہنچیں۔ ان علاقوں کے راجا بار بار باغی ہو جاتے اور بدعہدی کرتے لہٰذا محمود کو بار بار واپس آنا پڑتا۔ اگرچہ محمود ان حملوں کو تبلیغ اسلام کے مقصد کے تحت انجام دینے کا دعویٰ کرتا تھا۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ ان کا اسلام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا، محمود کو فاتح کی حیثیت سے شہرت ضرور حاصل ہوئی۔ محمود کی لشکر کشی خلافت راشدہ اور بنی امیہ کے زمانے کی فتوحات سے بالکل مختلف تھی۔ ان کے زمانے میں جو ملک اور علاقے فتح ہوئے ان پر مسلمانوں نے باقاعدہ حکومت قائم کر دی اور وہاں کی عوام کو پہلے سے بہتر سیاسی نظام دیا لیکن محمود نے سوائے پنجاب کے کسی علاقے کو اپنی سلطنت کا حصہ نہیں بنایا اور بار بار جنگیں کر کے مالی و جانی توانائی کا نقصان کیا۔ اس کا ایک منفی اثر یہ بھی پڑا کہ ہندو مسلمانوں کو لٹیرا اور جنگجو سمجھنے لگے۔

البتہ محمود غزنوی کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے شہر غزنی کو بڑی ترقی دی۔ اس نے اپنے تیس سالہ حکومت کے دوران اس معمولی سے شہر غزنی کو دنیا کا ایک عظیم الشان شہر بنا دیا۔ یہاں اس نے ایک عظیم الشان مسجد، ایک بڑا مدرسہ اور ایک عجائب گھر بنوایا۔ اس نے قنوج کی یادگار کے بطور ایک مینار بنوایا جو غزنی میں آج بھی موجود ہے۔ محمود غزنوی کے بعد غزنی سلطنت زوال پذیر ہو گئی۔ محمود کے بیٹے مسعود کے آخری دور میں سلجوقی ترکوں نے جو وسط ایشیا سے آئے تھے غزنوی سلطنت کے شمال اور مغربی دو حصوں پر قبضہ کر لیا۔ اور اب غزنی حکومت کے قبضے میں صرف دو علاقے رہ گیے جو اب مشرقی افغانستان اور مغربی پاکستان پر مشتمل ہیں۔ بعد کے غزنوی حکمرانوں میں صرف سلطان ابراہیم کا چالیس سالہ دور بہت نمایاں ہے۔ اس نے بچی ہوئی سلطنت کو مستحکم کیا۔ سلجوقیوں سے تعلقات اچھے کیے اور ہندوستان میں فتوحات کیں اور دہلی تک کے تمام علاقے غزنوی حکومت میں شامل کر دیے بلکہ اس کی فوجوں نے بنارس تک کامیاب حملے کیے۔

غزنوی حکمرانوں میں محمود غزنوی کو علم و فن کی سرپرستی اور ادب پروری کے لیے بھی جانا جاتا ہے۔ اس کے عہد میں فارسی زبان نے کافی ترقی حاصل کر لی۔ جس کا سہرا محمود کے سر ہے۔ اس نے فارسی علماء و ادباء کی زبردست سرپرستی کی۔

11.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- امیر سبکتگین کے ذریعہ غزنوی حکومت کا قیام عمل میں آیا لیکن استحکام و توسیع کا سارا سہرا اس کے بیٹے سلطان محمود کو جاتا ہے۔ چوں کہ محمود کے بعد اس کے بیٹے مسعود نے غزنوی حکومت کے بعض علاقے گنوا دیے اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ محمود کے بعد ہی

غزنوی حکومت کا دور زوال شروع ہوا۔

- سلطان محمود نے ہر چہار سو فتوحات حاصل کیں لیکن اس کی زیادہ تر فتوحات جذبہ جہاد سے زیادہ مال و دولت کے حصول کے مقصد کے تحت انجام دی گئی معلوم ہوتی ہیں۔ جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ اس نے کثیر فتوحات کے باوجود ہندوستان کے بے شمار مفتوحہ علاقوں میں کوئی سیاسی نظم قائم نہیں کیا بلکہ حکومت انہی راجاؤں کے حوالے کر کے ان سے صرف مال وصول کیا اور جب وہ بغاوت پر اتر آتے تو اسے دوبارہ حملہ آور ہونا پڑتا۔ فتح سومنات سے قبل اس کے سترہ حملے اس کا واضح ثبوت ہیں۔
- محمود کی لشکر کشی خلافت راشدہ اور بنی امیہ کے زمانے کی فتوحات سے بالکل مختلف تھی۔ ان کے زمانے میں جو ملک اور علاقے فتح ہوئے ان پر مسلمانوں نے باقاعدہ حکومت کر دی اور وہاں کی عوام کو پہلے سے بہتر سیاسی نظام دیا لیکن محمود نے سوائے پنجاب کے کسی علاقے کو اپنی سلطنت کا حصہ نہیں بنایا اور بار بار جنگیں کر کے مالی و جانی توانائی کا نقصان کیا۔ اس کا ایک منفی اثر یہ بھی پڑا کہ ہندو مسلمانوں کو لٹیرا اور جنگجو سمجھنے لگے۔
- تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ جتنے علاقے پر اس نے حکومت قائم کی ایک مضبوط اور عدل وانصاف پر مبنی حکومت قائم کی۔ اس کے عدل وانصاف کے قصے تاریخ میں بہ کثرت درج ہیں۔
- محمود میں رعایا پروری کا جذبہ بھی بہت تھا۔ بالعموم وہ اور اس کے بعد سلطان ابراہیم بھی رعایا کی خبر گیری کے لیے راتوں کو بھیس بدل کر گشت کرتے اور عوام کے حالات معلوم کرتے۔
- غزنوی حکمرانوں میں محمود غزنوی کو علم وفن کی سرپرستی اور ادب پروری کے لیے بھی جانا جاتا ہے۔ اس کے عہد میں فارسی زبان نے کافی ترقی حاصل کر لی۔ جس کا سہرا محمود کے سر ہے۔ اس نے فارسی علماء وادباء کی زبردست سرپرستی کی۔
- محمود غزنوی کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے شہر غزنی کو بڑی ترقی دی۔ اس نے اپنے تیس سالہ حکومت کے دوران اس معمولی سے شہر غزنی کو دنیا کا ایک عظیم الشان شہر بنا دیا۔ یہاں اس نے ایک عظیم الشان مسجد، ایک بڑا مدرسہ اور ایک عجائب گھر بنوایا۔ اس نے قنوج کی یادگار کے بطور ایک مینار بنوایا جو غزنی میں آج بھی موجود ہے۔ محمود غزنوی کے بعد غزنی سلطنت زوال پذیر ہو گئی۔

11.7 نمونہ امتحانی سوالات

11.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. شہر غزنی کہاں واقع ہے؟

(a). مشرقی افغانستان (b). مغربی افغانستان (c). ہندوستان (d). مشرقی ایران

2. افغانستان کے کس شہر کو اولیاء کا شہر کہا جاتا ہے؟

(a). غزنہ	(b). قندھار	(c). ہرات	(d). سب غلط

3. وہ کون سا پہلا حکمراں ہے جس کے زمانے میں مسلمان درہ خیبر سے پہلی بار ہندوستان میں داخل ہوئے؟

(a). سبکتگین	(b). شہاب الدین غوری	(c). مسعود دوم	(d). ارسلان شاہ

4. غزنی میں آل سامان کے اقتدار سے آزاد حکومت کس نے قائم کی؟

(a). سبکتگین	(b). ارسلان شاہ	(c). مسعود دوم	(d). مسعود اول

5. غزنوی حکومت کی بنیاد کس نے رکھی؟

(a). سبکتگین	(b). شہاب الدین غوری	(c). شاہ اسماعیل	(d). معزالدولہ

6. غزنوی حکومت کی بنیاد کب رکھی گئی؟

(a). 977ء	(b). 1171ء	(c). 1206ء	(d). سب غلط

7. سبکتگین کے بعد اس کا جانشین کون سا حکمراں ہوا؟

(a). محمود غزنوی	(b). ارسلان شاہ	(c). مسعود دوم	(d). مسعود اول

8. سبکتگین کس قوم سے تھا؟

(a). ترکی النسل	(b). عربی النسل	(c). ایرانی النسل	(d). سب صحیح

9. محمود غزنوی کس سنہ میں تخت نشین ہوا؟

(a). 999ء	(b). 1111ء	(c). 1250ء	(d). 1186ء

10. سبکتگین کا امیر الپتگین سے کیا تعلق تھا؟

(a). غلام	(b). بھائی	(c). چچا	(d). بیٹا

11.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. الپتگین کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ مختصر طور پر بیان کریں۔
2. امیر سبکتگین کے عہد میں درہ خیبر کے راستے مسلمانوں کے ہندوستان داخلے پر روشنی ڈالیے۔
3. عہد غزنوی کی امتیازی خصوصیات لکھیے۔
4. محمود غزنوی نے کون کون سے علاقے فتح کیے؟ مختصر بیان کیجیے۔
5. محمود غزنوی کے علاوہ کون کون سے غزنوی حکمراں زیادہ معروف ہوئے ہیں۔ مختصر روشنی ڈالیے۔

11.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. غزنوی حکومت کا قیام کس طرح عمل میں آیا؟ تفصیل سے روشنی ڈالیے۔
2. غزنوی حکومت کے استحکام میں محمود غزنوی کے کردار کا جائزہ لیجیے۔
3. محمود غزنوی کی حیات اور اس کے کارناموں کا جائزہ لیجیے۔

11.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. تاریخ ہندوستان، سلطنت اسلامیہ کا بیان، مولوی ذکاء اللہ دہلوی، مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ، 1915
2. تاریخ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ، ترجمہ عبدالحی خواجہ، مکتبہ ملت دیوبند، 1983، جلد اول
3. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، ثروت صولت، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، نئی دہلی 1984ء، جلد اول
4. The Ghaznavids-The Empire in Afghanistan and Eastern Iran, by Clifford Edmund Bosworth, Edinburgh, University Press.
5. The later Ghaznavids: Splendour and Decay by Clifford Edmund Bosworth, The Dynasty in Afghanistan and Northern India, Colombia University Press. New York. 1977.

اکائی 12: غزنوی دور میں فتوحات اور علمی خدمات

اکائی کے اجزا:

12.0 تمہید

12.1 مقاصد

12.2 غزنویوں کی فتوحات

12.3 غزنوی فتوحات کے اثرات ونتائج

12.3.1 سیاسی اور انتظامی اثرات

12.3.2 ثقافتی اثرات

12.3.3 معاشرتی اثرات

12.3.4 دوررس اثرات

12.3.5 فتوحات کا تنقیدی جائزہ

12.4 علم وادب کی سرپرستی

12.4.1 غزنوی دور کے مشہور علماء اور فنکار

12.5 ترجمہ کی تحریک

12.5.1 لائبریریوں کا قیام

12.5.2 غزنہ ایک علمی وثقافتی مرکز

12.5.3 مشہور شعراء

12.5.4 بعد کی سلطنتوں پر اثر

12.6 اکتسابی نتائج

12.7 نمونہ امتحانی سوالات

12.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
12.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
12.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
12.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

12.0 تمہید

غزنوی دور اسلامی تاریخ کا ایک سنہرا دور ہے جس میں علم و ادب اور فتوحات دونوں میں بڑی ترقی ہوئی۔ اس دور میں غزنہ ایک عظیم علمی و ثقافتی مرکز بن گیا اور اس سے نکلنے والے علماء اور فنکاروں نے دنیا بھر میں اپنا نام روشن کیا۔ غزنویوں نے ہندوستان پر بھی کئی فوجی مہمات کیں اور اس خطے میں اسلام کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ غزنویوں کا تعلق ترک نسل سے تھا اور ان کا آبائی وطن ترکستان تھا۔ نویں صدی میں وہ غزنی کے علاقے میں آباد ہوئے اور یہاں سے انہوں نے اپنی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ غزنویوں کے پہلے حکمران سبکتگین تھے جنہوں نے 977ء میں غزنی کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ سبکتگین کے بعد ان کے بیٹے محمود غزنوی تخت نشین ہوئے۔ محمود غزنوی خاندان کے سب سے مشہور حکمراں تھے۔ انہوں نے اپنی فوجی مہمات کے ذریعے غزنوی سلطنت کو وسیع کیا اور ہندوستان کے کئی علاقوں کو فتح کیا۔ محمود غزنوی علم و ادب کا بھی بڑا سرپرست تھا۔ اس کے دربار میں ملک کے نامور علماء اور شعراء جمع ہوتے تھے۔ سلطان محمود غزنوی کی دور اندیش قیادت اور اس کے جانشینوں کی علم و ادب کی سرپرستی میں غزنہ علم و فن کا مرکز بن گیا۔ یہاں بڑے بڑے علماء، مفکرین، شعراء اور دانشور جمع ہوئے جنہوں نے اپنی علمی و ادبی کاوشوں سے دنیا کو منور کیا۔ دوسری جانب غزنوی حکمرانوں نے ہندوستان کی طرف کئی فوجی مہمات بھیجیں، وسیع علاقوں کو فتح کیا اور اسلامی تہذیب کی روشنی پھیلائی۔

12.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ یہ جان سکیں گے کہ:

- غزنوی فتوحات کے اسباب اور ان کے علاقائی اور تاریخی نتائج کیا تھے؟
- غزنوی دور میں علم و ادب کی ترقی کے اسباب اور عوامل کیا تھے؟
- اس دور کے مشہور علماء، مفکرین، شعراء اور دانشوروں نے کیا کارنامے انجام دیے؟

12.2 غزنویوں کی فتوحات

غزنوی دور فتوحات کے اعتبار سے خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ سلطان محمود غزنوی اور اس کے جانشینوں نے ہندوستان میں کئی فوجی مہمات بھیجیں اور وسیع علاقوں کو فتح کیا۔ ان فتوحات کا مقصد سیاسی توسیع کے ساتھ ساتھ اسلامی تہذیب و ثقافت کو پھیلانا بھی تھا۔ غزنوی حکمرانوں کی انتظامی صلاحیت کی بدولت ان فتح شدہ علاقوں میں امن و امان قائم ہوا اور وہاں تجارت و تعلیم کو فروغ ملا۔ غزنویوں نے ہندوستان پر سترہ سے زیادہ فوجی مہمات کیں، جو 997 عیسوی سے 1027 عیسوی تک جاری رہیں۔ ان مہمات کی قیادت سبکتگین اور ان کے بیٹے سلطان محمود غزنوی نے کی۔

امیر ناصر الدین سبکتگین: جب امیر سبکتگین غزنی میں تخت نشین ہوا تو اس وقت کابل اور پیشاور کا علاقہ پنجاب کے راجا جے پال کے ماتحت تھا۔ افغانستان میں دونوں کی سرحدیں ملتی تھیں۔ جے پال کو سبکتگین کی تخت نشینی ناگوار گزری تو وہ ایک لشکر لے کر غزنی کی طرف بڑھا۔ جے پال اور سبکتگین کے درمیان 979ء میں جنگ ہوئی جس میں جے پال نے شکست کھائی اور اسے صلح کے لئے آمادہ ہونا پڑا۔ صلح ان شرائط پر ہوئی کہ جے پال اپنے ملک میں واپس جا کر گھوڑے، ہاتھی، مال و جواہر جن کی تعداد عہد نامہ میں معین ہوئی تھی امیر سبکتگین کے کارندوں کے ہاتھ غزنی بھیجے گا۔ لیکن لاہور پہنچ کر جے پال اپنا وعدہ بھول گیا اور سبکتگین کے آدمیوں کو قتل کر دیا۔ سبکتگین کو یہ پتا چلا تو اسے بڑا طیش آیا اس نے فوجیں جمع کیں اور جے پال کے علاقے پر ہلہ بول دیا۔ سبکتگین کو بہت سامال و اسباب اور بے شمار لونڈی غلام ہاتھ آئے لیکن جے پال بھی غافل نہ بیٹھا اس نے چٹھیاں بھیج کر ہندوستان کے تمام ہندو راجاؤں سے مدد مانگی اور جب پیشاور کے مقام پر دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو دہلی، اجمیر، کانجر اور قنوج کی منتخب فوجیں راجا جے پال کے ساتھ تھیں۔

یہ پہلا موقع تھا جب شمالی ہندوستان کے تمام حکمرانوں نے متحد ہو کر مسلمان حملہ آوروں کو روکنا چاہا اور ہندوستانی فوج کی اتنی کثرت تھی کہ سبکتگین کے سردار بھی گھبرا گئے۔ لیکن سبکتگین نے جنگی داؤ پیچ اپنائے اور اپنی فوج کو پانچ پانچ سو کی ٹکڑیوں میں تقسیم کر دیا کہ پہلے پانچ سو سپاہی میدان میں لڑیں گے جب وہ تھک جائیں تو دوسرے پانچ سو سپاہی میدان میں جائیں۔ جب اس طرح کچھ وقت جنگ چلی اور دشمن کی فوجیں تھک گئیں تو یکبارگی پوری فوج نے جے پال کی فوج پر حملہ کر دیا۔ لھذا دشمن کو راہ فرار اختیار کرنا پڑی۔

محمود غزنوی: محمود نے 1001 سے اپنی مہمات شروع کیں اور 1026 تک جاری رکھیں۔ اس کی مہم ہندوستان میں پنجاب اور شمالی ہندوستان سے شروع ہو کر جنوب میں سومناتھ پر ختم ہوئیں۔ محمود کا پہلا مقابلہ ہندوستان میں راجہ جے پال سے 1001 میں پیشاور کے قریب ہوا۔ اس مقابلے میں جے پال کو شکست ہوئی۔ دوسرا مقابلہ جے پال کے بیٹے آنند پال سے 1008 میں ہوا جس میں محمود غزنوی کو نمایاں کامیابی ملے اور شمالی ہندوستان پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ یہاں غزنوی دور کی کچھ اہم فوجی مہمات پر نیچے روشنی ڈالی جاتی ہے:

999ء میں محمود نے خراسان، بلخ، ہرات اور مرو سامانیوں سے حاصل کیا۔

1000ء میں سیستان صفاریوں سے حاصل کیا۔

1001ء میں راجہ جیپال کو پیشاور کی جنگ میں ہرایا۔

1008ء سلطان محمود غزنوی کی پہلی بڑی مہم 1008ء میں دیبل، سندھ پر ہوئی۔ اس وقت دیبل ایک اہم تجارتی بندرگاہ تھا اور اسے فتح کر کے غزنویوں نے جنوبی ہندوستان کی طرف اپنی پیش قدمی کا آغاز کیا۔ فوجی قوت اور حکمتِ عملی سے دیبل فتح کر لیا گیا۔ اس فتح سے سندھ پر ایک بڑے علاقے پر غزنویوں کا کنٹرول قائم ہو گیا اور ہندوستان میں مزید فتوحات کی راہ ہموار ہوئی۔

1005-6ء میں محمود نے ملتان کو فتح کیا۔

1013-14 میں تھانیسر پر قبضہ کیا-

1015 میں کشمیر پر ناکام حملہ کیا۔

1017-18ء میں قنوج پر حملہ کیا اور چندیل کے راجہ کو شکست دی۔ میرٹھ بنا جنگ کے حاصل ہو گیا۔

1022-23ء میں شمالی ہندوستان میں اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے لیے غزنویوں نے لاہور کی طرف پیش قدمی کی۔ سلطان محمود غزنوی نے لاہور کو فتح کیا اور پھر اجمیر، کاٹھیاواڑ 1024 میں فتح ہوئے۔

1025ء کے سومناتھ پر حملے نے عالمی سطح پر توجہ حاصل کی۔ سومنات مندر ہندوؤں کے لیے ایک اہم مذہبی مقام تھا اور اس پر حملہ سے ہندوؤں کے جذبات شدید متاثر ہوئے۔ سلطان محمود غزنوی اس مندر کو بت پرستی کا مرکز سمجھتا تھا اور اسے منہدم کر کے اسلام پھیلانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ حملے کے بعد مندر کی دولت غنیمت کے طور پر لی گئی، لیکن کہا جاتا ہے کہ مندر کی مورتی کو نقصان نہیں پہنچایا گیا۔ اس حملے کے اثرات طویل المدت تھے۔ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات خراب ہوئے اور ہندو غزنویوں کے خلاف متحد ہو گئے۔ تاہم، اس واقعے نے ہندو مذہب اور اسلامی حکومت کے درمیان کشیدگی کو بھی بڑھا دیا۔

ان فتوحات کے بعد غزنویوں کا شمال اور وسطی ہندوستان تک رسائی ہو گئی اور یہ علاقے کچھ عرصے تک ان کی حکومت کے ماتحت رہے۔ تاہم، وقت کے ساتھ ساتھ مقامی قوتوں کی مزاحمت بڑھتی گئی اور ان علاقوں پر ان کا کنٹرول کمزور ہوتا گیا۔

محمود کے جانشین: محمود کی وفات 1030ء میں 59 سال کی عمر میں ہوی ہوئی۔ اس کے بعد محمود کے بیٹوں میں جنگ ہوئی جس میں مسعود کو غلبہ حاصل ہوا، لیکن اس کو حکومت کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ اس نے ہندوستان میں ہانسی کا قلع فتح کیا لیکن اس کی غیر موجودگی میں سلجوقیوں نے غزنی کا علاقہ تباہ و برباد کر دیا اور اس کے ترکی و ہندو غلاموں نے اس کے خلاف بغاوت کر کے اس کے بھائی محمد کو تخت نشین کیا۔ اس کے بعد غزنی میں کئی کمزور حکمراں آئے جو مزید فتوحات سے قاصر رہے۔

12.3 غزنوی فتوحات کے اثرات و نتائج

غزنوی فتوحات کے نتیجے میں ہندوستان کے متاثرہ علاقوں میں وسیع پیمانے پر تبدیلیاں آئیں۔ ان تبدیلیوں کا تعلق سیاسی، انتظامی، ثقافتی اور معاشرتی شعبوں سے تھا۔

12.3.1 سیاسی اور انتظامی اثرات

- غزنوی حکمرانی: فتح شدہ علاقوں میں غزنوی حکمرانی قائم ہوئی۔ ان علاقوں میں سلطان محمود غزنوی اور اس کے جانشینوں کے نام سے خطبہ اور سکہ جاری کیا گیا۔
- انتظامی ڈھانچہ: غزنویوں نے ان علاقوں میں ایک انتظامی ڈھانچہ قائم کیا جس میں صوبے، اضلاع اور قصبات شامل تھے۔ ہر علاقے کے لیے ایک امیر یا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔
- قانون اور انصاف: غزنویوں نے ان علاقوں میں اسلامی قانون نافذ کیا۔ عدالتیں قائم کی گئیں اور قاضیوں کو تعینات کیا گیا۔

12.3.2 ثقافتی اثرات

- اسلامی تہذیب: غزنوی فتوحات کے ذریعے اسلامی تہذیب، ثقافت، زبان اور فن ہندوستان میں پھیلے۔ نئے تعلیمی ادارے قائم ہوئے، فن تعمیر اور ادب میں نئے رجحانات سامنے آئے اور لوگوں کے طرز زندگی پر بھی اسلامی اثرات مرتب ہوئے۔۔ مختلف تہذیبوں کے امتزاج سے ایک منفرد ثقافتی ورثہ تخلیق ہوا۔
- فارسی زبان: فارسی زبان سرکاری زبان کے طور پر متعارف کرائی گئی۔ اس زبان نے ہندوستان کی مقامی زبانوں پر اثرات مرتب کیے اور اردو زبان کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا۔
- فن تعمیر: غزنویوں نے ہندوستان میں فن تعمیر کے نئے انداز متعارف کرائے۔ ان اندازوں میں فارسی اور ترک اثرات کا امتزاج نظر آتا ہے۔

12.3.3 معاشرتی اثرات

- معاشرتی تبدیلیاں: غزنوی فتوحات کے نتیجے میں ہندوستان کے معاشرے میں بھی تبدیلیاں آئیں۔ مسلمانوں کی آمد سے ہندو معاشرے میں نئے طبقے اور گروہ سامنے آئے۔
- مذہبی تعلقات: ہندو اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات پیچیدہ ہو گئے۔ کچھ علاقوں میں دونوں مذاہب کے لوگ امن و امان سے رہتے تھے، جبکہ دیگر علاقوں میں تناؤ اور کشیدگی بھی پیدا ہوئی۔

12.3.4 دوررس اثرات

- ہندوستان کی تاریخ پر طویلیپیپیپمدتی اثرات: غزنوی فتوحات نے ہندوستان کی تاریخ پر طویل مدتی اثرات مرتب کیے۔ ان واقعات سے مسلمان اور ہندو تہذیبوں کے درمیان رابطے اور تبادلے کا ایک نیا دور شروع ہوا، جس کا اثر آج بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔
- ہندو-مسلم تعلقات: غزنوی فتوحات نے ہندو-مسلم تعلقات کی بنیاد رکھی۔ ان تعلقات میں تعاون اور تصادم دونوں کے پہلو موجود رہے ہیں۔

- سیاسی اور انتظامی تبدیلیاں: غزنوی فتوحات کے نتیجے میں ہندوستان کے متاثرہ علاقوں میں سیاسی اور انتظامی تبدیلیاں آئیں۔ ان علاقوں میں اسلامی قوانین نافذ ہوئے اور مسلمان حکمران مقرر کیے گئے۔
- اسلامی تہذیب کی اشاعت: غزنوی فتوحات کے ذریعے اسلامی تہذیب، ثقافت، زبان اور فن ہندوستان میں پھیلے۔ نئے تعلیمی ادارے قائم ہوئے، فن تعمیر اور ادب میں نئے رجحانات سامنے آئے اور لوگوں کے طرز زندگی پر بھی اسلامی اثرات مرتب ہوئے۔

12.3.5 فتوحات کا تنقیدی جائزہ

غزنوی فتوحات کے کچھ منفی اثرات بھی تھے۔ ان فتوحات کے نتیجے میں ہندوستان کے کئی علاقوں میں تباہی اور بربادی ہوئی۔ ہندوؤں کے مقدس مقامات کو بھی نقصان پہنچایا گیا۔ اس کے علاوہ، غزنویوں نے ہندوستان سے بڑی تعداد میں مال و دولت اور غلام بھی لے گئے۔ وسیع سلطنت اور لڑائیاں:

- وسیع سلطنت کی وجہ: غزنویوں کی توسیع کا مقصد صرف مذہبی فتوحات نہیں تھا۔ معاشی مواقع، سیاسی دشمنیوں اور تجارتی راستوں کو محفوظ بنانا بھی اہم عوامل تھے۔

- ہندوستان پر اثر: غزنویوں نے ہندوستان کے کچھ علاقوں میں اسلام متعارف کرایا، لیکن ان کا بنیادی مقصد لوگوں کو مسلمان بنانا نہیں تھا۔ وہ اکثر مقامی حکمرانوں کے ساتھ مل کر حکومت کرتے تھے۔

- لڑائیوں کا ورثہ: غزنوی فتوحات کے دور رس اثرات پڑے، جنہوں نے وسطی ایشیا اور ہندوستان کے سیاسی منظر نامے اور ثقافتی تبادلے کو متاثر کیا۔

- بعد کی سلطنتوں پر اثر: غزنوی حکمرانی کا طرز، اسکالروں کی سرپرستی، اور فارسی ادب کی ترقی نے بعد کی سلطنتوں جیسے غوری سلطنت اور دہلی سلطنت کو متاثر کیا۔

- تاریخ نویسی اور بحث: مورخین آج بھی غزنوی دور پر بحث مباحثہ کرتے ہیں، خاص طور پر توسیع کی وجوہات اور مقامی آبادی پر ان کے اثرات کے بارے میں۔ مختلف نقطہ نظر کا تجزیہ اس دور کی سمجھ بوجھ کو گہرا کرتا۔

12.4 علم وادب کی سرپرستی

غزنوی دور جو 11ویں اور 12ویں صدی کے درمیان پھیلا ہوا تھا، جس کا مرکز غزنہ شہر تھا۔ سلطان محمود غزنوی اور اس کے جانشینوں کی دور اندیش قیادت میں غزنہ علم و فن، ادب و ثقافت، تجارت و فتوحات کا مرکز بن گیا۔ یہ عرصہ علم و ادب کی ترقی، عظیم دانشوروں کی تخلیقات، وسیع فتوحات اور ثقافتی تبادلے کے لیے یادگار بن گیا، جس نے نہ صرف اسلامی دنیا بلکہ ہندوستان اور اس سے آگے بھی گہرے اثرات چھوڑے۔ سلطان محمود غزنوی، کو علم وادب سے گہری وابستگی تھی۔ انہوں نے علماء، شعراء، فنکاروں اور دانشوروں کو کھلی آغوش سے قبول کیا اور ان کی سرپرستی میں کوئی کمی نہیں رکھی۔ یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ سلطان محمود خود بھی فارسی اور عربی زبانوں کا ماہر تھا،

جس نے اس دور کی علمی و ادبی فضا کو اور زیادہ فروغ دیا۔ اس دور میں کتب خانوں کا قیام عمل میں آیا جہاں نادر و نایاب کتابوں کا وسیع ذخیرہ موجود تھا۔ یہ کتب خانے علماء اور طلبہ کے لیے کھلے تھے، جس سے علم و فن کی روشنی عام ہونے کا راستہ ہموار ہوا۔ اس دور کے مشہور علماء میں البیرونی، ابوریحان محمد بن احمد، امام غزالی، اور ابوسعید ابوالخیر شامل ہیں۔ ان علماء نے مختلف علوم و فنون میں اہم خدمات انجام دیں۔ البیرونی نے ریاضی، علم ہیئت، تاریخ، اور جغرافیہ میں کئی اہم کتابیں لکھیں۔ ابوریحان محمد بن احمد نے تاریخ، جغرافیہ، اور طب میں کتابیں لکھیں۔ امام غزالی نے فلسفہ، کلام، اور تصوف میں اہم کتابیں لکھیں۔ ابوسعید ابوالخیر تصوف کے ایک بڑے بزرگ تھے۔

محمود کی طرح مسعود بھی اہل علم کا قدردان تھا۔ اس کے دربار سے کئی اہل علم وابستہ تھے۔ اس کے زمانے کی ایک قابل ذکر تبدیلی لاہور اور اہل لاہور کا علم و فن میں عروج تھا۔ سلطان محمود غزنوی کی فتوحات کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ لاہور میں اسلامی حکومت قائم ہو گئی جس کی وجہ سے غزنی سے کئی اہل علم یہاں ملازمت کے لئے آکر آباد ہو گئے۔ ان علماء کے فیض سے یہ شہر اسلامی علوم کا مرکز بن گیا۔ ابراہیم غزنوی کے زمانے میں لاہور علمی سرگرمیوں کا گہوارہ بن گیا تھا۔ ابراہیم کا ایک وزیر ابونصر فارسی جو ادبی دلچسپیوں کی وجہ سے ادیب مشہور تھا علم و فضل کا مربی تھا۔ اس نے لاہور میں ایک خانقاہ قائم کی جو جو اہل علم اور دوسرے بزرگوں کی جائے پناہ تھی۔ اور آہستہ آہستہ لاہور، بلخ و بخارا اور دوسرے ممالک سے اہل علم کھنچ کھنچ کر آنے لگے۔ سلطان ابراہیم کے دربار کا ایک شاعر ابوالفرح رونی تھا، جو قصیدہ نویسی میں یکتائے زمانہ تھا۔ ابراہیم غزنوی کے بعد اس کا بیٹا سلطان علاء الدین مسعود تخت نشین ہوا۔ اس کے دربار کی قابل ذکر شخصیت مسعود سعد سلمان ہے جو فارسی شاعر تھا۔

12.4.1 غزنوی دور کے مشہور علماء اور فنکار

غزنوی دور میں بہت سے مشہور علماء اور فنکار پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے اپنے میدانوں میں اہم کارنامے انجام دیے۔ ان میں سے چند ایک کے نام درج ذیل ہیں:

1. علامہ ابوریحان البیرونی

البیرونی: ایک عظیم ماہر فلکیات، ریاضی دان، طبیعیات دان، ایک مشہور فلسفی، ماہر الٰہیات اور مؤرخ۔ انہوں نے ریاضی، علم ہیئت، تاریخ، اور جغرافیہ میں کئی اہم کتابیں لکھیں۔ ان کی مشہور کتابوں میں "کتاب الہند" اور "قانون مسعودی" شامل ہیں۔ انہوں نے فلسفہ، کلام، اور تاریخ میں بھی کئی اہم کتابیں لکھیں۔ ان کی مشہور کتابوں میں "کتاب الایمان" ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں البیرونی خطہ ہند و پاک آیا۔ اس کی زندگی کا بیشتر حصہ ہند و پاکستان سے باہر بسر ہوئی لیکن اس کی مشہور کتاب "کتاب الہند" اسی سرزمین کے متعلق ہے اس لئے یہاں کی علمی تاریخ میں اس کا ذکر آنا ناگزیر ہے۔ کتاب الہند میں ایک تمہید کے علاوہ جس میں کتاب کی غرض و غایت اور وجہ تصنیف بیان کی گئی ہے، 80 باب ہیں اور ان میں ہندوستان کے مذہب، فلسفہ، ادب، جغرافیہ، ہیئت، جوتش، رسم و رواج اور قوانین کا بیان ہے۔ اس کتاب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ مختلف مضامین پر ہندوؤں کی اپنی مستند کتابوں سے اقتباس دے کر ان کا نقطہ نظر واضح کیا جائے۔ البیرونی علم ہیئت و نجوم کا عالم تھا اس لئے یہ کتاب ان علوم کے متعلق اتنے طویل عالمانہ اقتباسات اور ہندی اور یونانی نظریوں کے

ایسے لطیف موازنوں سے بھری ہوئی ہے کہ اس سے پوری طرح بہرہ ور ہونا انہی کا حصہ ہے جو ان علوم میں دسترس رکھتے ہیں۔ کتاب میں عام دلچسپی کی بھی کئی باتیں ہیں، مذہب کے متعلق البیرونی ہندو خواص و عوام میں ایک فرق بیان کرتا ہے۔ اس نے پاتنجلی سے طویل اقتباسات دے کر بیان کیا ہے کہ خواص کے نزدیک خدا واحد ہے۔ ازلی ہے۔ جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا۔ اپنے فعل میں مختار ہے۔ قادر ہے۔ حکیم ہے۔ زندہ ہے۔ زندہ کرنے والا ہے۔ لیکن عوام ہندو دیوتاؤں سے انسانی خواص منسوب کرنے میں حد اعتدال سے تجاوز کر گئے ہیں۔ عوام بت پرستی کرتے ہیں۔

ہندوؤں کے رسم و رواج کی نسبت البیرونی لکھتا ہے کہ شادیاں کم عمری میں ہوتی ہیں۔ مرد کو کثرت ازدواج کا اختیار ہے۔ طلاق کی اجازت نہیں۔ نکاح بیوگان بھی ممنوع ہے۔ "جب ایک عورت کا خاوند مر جائے تو یا تو اسے تمام عمر بیوہ رہنا پڑتا ہے یا زندہ جل جانا۔ بالعموم زندہ جل جانے کو ترجیح دیتی ہے۔ کیوں کہ بیوگی کی حالت میں اس سے تمام عمر بدسلوکی ہوتی ہے۔ بیرونی برہمنوں کے بارے میں لکھتا ہے کہ ان کو کھلم کھلا مراعات حاصل تھیں اور وہ ٹیکسوں اور سزائے موت سے بری تھے۔ ہندوؤں کے چار طبقوں کا ذکر کرتے ہوئے البیرونی لکھتا ہے:"ہم میں اور ہندوؤں میں بڑا اختلاف یہ ہے کہ ہم آپس میں سب کو برابر سمجھتے ہیں۔ اور ایک دوسرے پر فضیلت صرف تقوے کی بنا پر دیتے ہیں۔ یہ اختلاف ہندوؤں اور اسلام کے درمیان سب سے بڑی رکاوٹ ہے"۔

البیرونی نے ایک باب ہندوؤں کی عجیب رسوم و عادات کے متعلق لکھا ہے 'جس میں ہندوؤں کی ان تمام باتوں کو جمع کیا ہے جو اس کی نظر میں مکروہ یا عجیب و غریب تھیں۔ چوں کہ بطور ایک محقق اور عالم اس نے ہر ایک چیز کو دیانت داری اور ہمدردی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اس لئے اس نے ان رسوم کی بھی تاویل کی ہے اور لکھا ہے کہ "کسی چیز کا عجیب و غریب ہونا اس وجہ سے ہے کہ وہ ہم میں کم پائی جاتی ہے۔ اور اس کو دیکھنا عادت کے خلاف ہے۔

- فردوسی: فارسی زبان کے مشہور شاعر جنہوں نے شاہنامہ فردوسی لکھا۔ شاہنامہ فردوسی فارسی زبان کا ایک عظیم شاہکار ہے جس میں ایران کی تاریخ اور ثقافت کا احاطہ کیا گیا ہے۔
- ابو العباس احمد بن صالح: ایک مشہور محدث اور فقیہ۔ انہوں نے حدیث اور فقہ میں کئی اہم کتابیں لکھیں۔ ان کی مشہور کتابوں میں "مسند احمد بن صالح" اور "شرح صحیح مسلم" شامل ہیں۔
- ابو نصر محمد بن عبد الجبار عتبی: ایک مشہور مؤرخ اور شاعر۔ انہوں نے تاریخ اور شاعری میں کئی اہم کتابیں لکھیں۔ ان کی مشہور کتابوں میں "تاریخ یمینی" اور "حدائق الحقایق" شامل ہیں۔

12.5 ترجمہ کی تحریک

سبکتگین اور محمود غزنوی نے اپنے دربار میں علماء اور شعراء کی بڑی تعداد کو جمع کیا۔ انہوں نے کتابوں کے ترجمے اور تالیف کے لیے بھی بڑی رقم خرچ کی۔ غزنوی دور کی ایک اور بڑی خصوصیت ترجمہ کی تحریک ہے جس نے علمی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ اس دور میں

یونانی، سنسکرت اور دیگر زبانوں کی علمی و ادبی تحریروں کو بڑے پیمانے پر عربی اور فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ اس کارنامے کی وجہ سے مختلف تہذیبوں کے علمی ذخیرے آپس میں منسلک ہوگئے اور علم و فن کی نئی راہیں کھلیں۔ ریاضی، فلکیات، طب، جغرافیہ، تاریخ، فلسفہ اور دوسرے علوم جدید نظریات سے روشناس ہوئے، جس سے نئی دریافتوں اور ایجادات کی راہ ہموار ہوئی۔

12.5.1 لائبریریوں کا قیام

سبکتگین اور محمود غزنوی نے اپنے دربار میں علماء اور شعراء کی بڑی تعداد کو جمع کیا۔ انہوں نے کتابوں کے ترجمے اور تالیف کے لیے بھی بڑی رقم خرچ کی۔ اس کے نتیجے میں غزنہ میں علم وادب کے مختلف میدانوں میں بڑی ترقی ہوئی۔ غزنہ میں ایک بڑی لائبریری قائم کی گئی جس میں دنیا بھر سے جمع کی گئی کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ اس لائبریری میں علماء اور طلباء کے لیے تحقیق اور مطالعہ کے بہترین مواقع فراہم کیے گئے تھے۔

مدارس

غزنہ میں مختلف علوم وفنون کے مدارس بھی قائم کیے گئے تھے جہاں طلباء کو مختلف علوم وفنون کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان مدارس میں فلسفہ، کلام، فقہ، حدیث، طب، ریاضی، علم ہیئت، اور دیگر علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔

12.5.2 غزنہ ایک علمی و ثقافتی مرکز

غزنوی دور (963-1186 عیسوی) اسلامی تاریخ کا ایک سنہرا دور تھا جس میں علم وادب نے بڑی ترقی کی۔ اس دور میں غزنہ ایک عظیم علمی و ثقافتی مرکز بن گیا۔ اس شہر کی شان وشوکت اور علم وادب کی سرپرستی دور دراز تک مشہور تھی۔

- بین الاقوامی مرکزیت: غزنہ نہ صرف اسلامی دنیا بلکہ مختلف ثقافتوں کے درمیان رابطے کا مرکز بن گیا۔ یہاں علماء، دانشور، فنکار اور تاجر دنیا کے مختلف حصوں سے آتے تھے۔
- فن تعمیر اور فنون لطیفہ: غزنہ میں عظیم الشان عمارتیں تعمیر کی گئیں، جن میں مساجد، مقبرے، اور محلات شامل ہیں۔ ساتھ ہی، فنون لطیفہ جیسے موسیقی، خطاطی، اور مصوری میں بھی بڑی ترقی ہوئی۔
- ثقافتی تبادلہ: غزنوی دور میں ہندوستان کے ساتھ ثقافتی تبادلہ بڑھا، جس سے دونوں خطوں کی ثقافتوں میں ایک دوسرے کا اثر نمایاں ہوا۔

12.5.3 مشہور شعراء

غزنوی دور میں بہت سے مشہور شعراء بھی پیدا ہوئے جنہوں نے فارسی شاعری کو بڑی ترقی دی۔ ان میں سے چند ایک کے نام درج ذیل ہیں:

- فردوسی: فارسی زبان کے مشہور شاعر جنہوں نے شاہنامہ فردوسی لکھا۔ شاہنامہ فردوسی فارسی زبان کا ایک عظیم شہکار ہے

جس میں ایران کی تاریخ اور ثقافت کا احاطہ کیا گیا ہے۔

- فرخی سیستانی: ایک مشہور شاعر جنہوں نے قصائد، مثنویات، اور رباعیات لکھیں۔
- عنصری: ایک مشہور شاعر جنہوں نے قصائد، مثنویات، اور رباعیات لکھیں۔

12.5.4 بعد کی سلطنتوں پر اثر

غزنویوں کا دانشورانہ سرپرستی کا ماڈل بعد کی سلطنتوں پر اثر انداز ہوا۔ غوریوں اور دہلی سلطنتوں نے اس روایت کو آگے بڑھایا، کتب خانے قائم کیے، علماء کی سرپرستی کی اور مختلف علوم میں مزید ترقی کی۔ غزنوی دور کے فکری کارنامے اپنے وقت سے کہیں آگے تک پہنچے۔ فلکیات، ریاضی اور طب میں ان کی خدمات نے مستقبل کی سائنسی ترقی کی بنیاد رکھی۔ ان کے ادبی کام آج بھی عزیز ہیں، اور علم کے ترجمے پر ان کے زور دینے سے ثقافتوں کے درمیان سمجھ بوجھ بڑھی۔

12.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- غزنوی دور علم و ادب کے میدان میں ایک سنہری دور تھا۔
- اس دور میں بڑے بڑے علماء، مفکرین، شعراء اور ادیبوں نے اپنی علمی و ادبی تخلیقات سے دنیا کو منور کیا۔
- غزنوی حکمرانوں نے وسعت پسندی کی پالیسی اپنا کر ہندوستان کے کئی علاقوں کو فتح کیا اور اسلامی تہذیب کو پھیلایا۔
- غزنوی دور کے علمی و ادبی کارناموں اور فتوحات کے دور رس اثرات آج بھی محسوس کیے جاتے ہیں۔

12.7 نمونہ امتحانی سوالات

12.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. غزنوی دور میں علم و ادب کی ترقی میں کس حکمران کا کردار سب سے زیادہ اہم تھا؟

(a). سلطان محمود غزنوی (b). سلطان مسعود غزنوی (c). سلطان ابراہیم غزنوی (d). سلطان بہرام شاہ غزنوی

2. غزنوی دور میں کونسا شہر علم و ادب کا مرکز تھا؟

(a). غزنہ (b). لاہور (c). دہلی (d). بغداد

3. "قانون مسعودی" کتاب کے مصنف کون تھے؟

(a). امام ابوریحان البیرونی (b). امام محمد غزالی (c). مولانا جلال الدین بلخی (d). ابونصر فارابی

4. غزنویوں نے سب سے پہلے ہندوستان میں کس شہر پر حملہ کیا؟

(a). دیبل (b). لاہور (c). اجمیر (d). سومنات

5. غزنوی فتوحات کے نتیجے میں ہندوستان میں کیا نہیں پھیلا؟

(a). اسلامی ثقافت (b). عربی زبان (c). فارسی ادب (d). بت پرستی

6. غزنوی سلطنت کب قائم ہوئی؟

(a). 977ء (b). 990ء (c). 1100ء (d). 1120ء

7. غزنوی سلطنت کا بانی کون تھا؟

(a). الپتگین (b). سبکتگین (c). محمود غزنوی (d). مسعود غزنوی

8. غزنوی سلطنت کا دارالحکومت کون سا شہر تھا؟

(a). لاہور (b). آگرہ (c). غزنہ (d). دہلی

9. غزنویوں نے ہندوستان پر کب حملے شروع کیے؟

(a). 1001ء (b). 1003ء (c). 1090ء (d). 970ء

10. فردوسی کس میدان میں ماہر تھے؟

(a). عمارت سازی (b). شاعری (c). مصوری (d). ریاضی

12.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. غزنوی دور میں ترجمہ کی تحریک کے کیا فوائد تھے؟
2. غزنوی حکمرانوں نے علمی اداروں کے فروغ کے لیے کیا اقدامات کیے؟
3. غزنوی فتوحات کے سیاسی اور انتظامی نتائج کا مختصراً بیان کریں۔
4. غزنوی عہد کے دو مشہور شعراء کے نام بتائیں اور ان کی شاعری کی خاصیت بیان کریں۔
5. غزنوی دور کے علمی اور ادبی کارناموں کا آج کے دور میں کیا مقام ہے۔

12.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. غزنوی دور میں فارسی ادب کی ترقی وارتقاء میں شاہنامہ فردوسی کا کردار بیان کریں۔
2. غزنوی فتوحات کے تاریخی اور ثقافتی نتائج پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔
3. اسلامی تاریخ میں غزنوی دور کی علمی اور ادبی خدمات کو کس طرح سے سراہا جاتا ہے۔

12.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. "تاریخ غزنویان" : از محمد حامد اللہ خان
2. "غزنوی عہد کا علم و ادب" : از ڈاکٹر محمد رفیق
3. "فردوسی اور شاہنامہ" : از مولانا عبد السلام ندوی
4. "امام غزالی اور ان کا زمانہ" : از ڈاکٹر محمد قاسم زیر ولی
5. "غزنوی عہد کے علمی و ادبی مراکز" : از ڈاکٹر سید معین الحق جعفری

اکائی 13:   غوری حکومت کا اجمالی خاکہ

اکائی کے اجزا:

13.0 تمہید
13.1 مقاصد
13.2 غوری خاندان کی حکومت
13.2.1 غوری خاندان
13.2.2 غوریوں پر غزنویوں کی حکمرانی
13.2.3 غزنی پر علاء الدین حسین جہاں سوز غوری کا قبضہ
13.2.4 غیاث الدین غوری
13.2.5 سلطان شہاب الدین عرف معزالدین محمد غوری
13.2.6 سلطان شہاب الدین محمد غوری کی فتوحات
13.2.7 شمالی ہندوستان کی فتح
13.2.8 ترائن کے بعد مملکت کی توسیع
13.2.9 سلطان شہاب الدین محمد غوری کی شہادت
13.2.10 سلطان شہاب الدین محمد غوری کے کارنامے
13.2.11 غوری سلطنت کی تقسیم
13.3 کلیدی الفاظ
13.4 اکتسابی نتائج
13.5 نمونہ امتحانی سوالات
13.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

13.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

13.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

13.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

13.0 تمہید

اس اِکائی میں غوریوں کے بارے میں بالتفصیل گفتگو کی جائے گی۔ غور، غوری خاندان، شنسبانی خاندان پر غزنویوں کی حکمرانی اور تسلط، غزنویوں اور غوریوں کے درمیان معرکہ آرائی، غوری سلطنت کی قیام پذیری کے لئے علاء الدین حسین جہاں سوز غوری کی ابتدائی کوششوں اور غوری برادران پر روشنی ڈالی جائے گی، آپ کو معلوم ہو گا کہ شہاب الدین غوری عُرف معزالدین محمد کے سامنے ملتان، اُچھ، نہروالہ، پشاور، لاہور، تبرہندا اور ترائن کے بعد شمالی ہندوستان کی فتوحات کے دروازے کس طرح کھلتے گیے۔

13.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ یہ جان سکیں کہ غوری خاندان کی بنیاد کیا ہے، علاء الدین جہاں سوز غوری کی شخصیت کس نوعیت کی تھی، سلطان شہاب الدین محمد غوری کی شخصیت، فتوحات کے بارے میں تفصیل سے جانیں گے۔

13.2 غوری خاندان کی حکومت

غور کا پہاڑی علاقہ (Hill Regions) غزنی اور ہرات کی پہاڑیوں کے درمیان واقع ہے، دوسرے لفظوں میں کابل کے حدود میں غزنی سے دور ہرات کے مشرقی کوہستان میں غور ایک وسیع خطہ کا نام ہے۔ غور شہتوت، اخروٹ اور خوبانی کے درخت اور انگور کی بیلوں کے لئے مشہور ہے۔ غور، جس نے مسلم ثقافتی اثرات حال ہی میں قبول کئے تھے، کے پاس عہدِ وسطی کے دو اہم ترین جنگی سامان موجود تھے یعنی لوہا اور گھوڑے۔ غور کے باشندوں نے دوسری صدی ہجری کے شروع / نویں صدی عیسوی میں اسلام قبول کر لیا تھا اور یہاں سب افغانی قومیں آباد تھیں۔

13.2.1 غوری خاندان

پانچویں صدی ہجری کے اوائل یا اس سے کچھ قبل (یعنی دسویں صدی عیسوی میں) غور ایک آزاد ریاست تھی اور ایک ایرانی النسل تاجک خاندان کے زیرِ نگیں تھی جو تاریخوں میں شنسبانی خاندان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ شنسبانی خاندان، شہاب الدین عُرف معزالدین محمد غوری جس کا ایک فرد تھا، کی ابتدائی تاریخ اسرار اور رومانس سے ڈھکی ہوئی ہے۔ تاریخِ ناصری اور تاریخِ ہیضم نبی کی مدد سے منہاج السراج نے طبقات ناصری میں اوائلِ شنسبانی کا حال مرتب کیا ہے، معزالدین کے خاندان کا روایتی سورما ضحاک ہے جو اس خاندان کا

مورثِ اعلیٰ تسلیم کیا گیا۔ ایرانی علاقوں کی روایات میں ضحاک ایک ناپسندیدہ شخصیت تھی، مگر غزنی اور زبوستان کے علاقہ میں اسے مقبولیت حاصل تھی، روایت یہ تھی کہ جب فریدون نے ضحاک کی "ہزار سالہ مملکت" کا تختہ الٹ دیا تب اس کے وارثین غور میں آباد ہو گئے۔ شنبس جس نے اپنا نام خاندان کو دیا ضحاک کا ایک خلَف تھا، بقول منہاج السراج اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔

13.2.2 غوریوں پر غزنویوں کی حکمرانی

غوری خاندان کا پایہ تخت فیروز کوہ تھا، اس کے حکمراں شنبسانی شہزادہ محمد بن سوری سے سبکتگین خراج وصول کرتا تھا، محمد بن سوری نے سبکتگین کے انتقال کے بعد خراج دینا بند کر دیا اور اپنی خود مختاری کا اعلان کیا، اس وجہ سے محمود غزنوی نے اسے 399ھ / 1009ء میں شکست دے کر اپنا محکوم بنالیا تھا جس کے بعد سے غور کے حکمراں غزنی کے باج گذار رہے اور یہ علاقہ غزنوی سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا، محمود غزنوی نے غور کی صوبہ داری پر انہیں افغانوں کے ایک شریف شخص (محمد بن سوری کے بڑے لڑکے ابو علی سلطان) کو مامور فرمایا تھا جس کے خاندان میں غور کی حکومت بطور صوبہ داری چلی آرہی تھی، ابو علی سلطان محمود کی حکومت کے زمانے تک برسرِ اقتدار رہا۔ منہاج طبقاتِ ناصری (ص 41) میں لکھتا ہے کہ اس نے غور میں کئی ایک اسلامی ادارے قائم کئے، جامع مسجد اور مدرسے بنوائے اور ان کی دیکھ بھال کے لئے اوقاف مقرر کیے، وہ علماء اور مذہبی پیشواؤں کی بڑی عزت کرتا تھا اور صوفیوں اور دنیا فراموش بزرگان کی خدمت کو اپنا فرض جانتا تھا۔ لیکن جب 422ھ / 1030ء میں محمود غزنوی کی وفات ہوئی تو غوریوں نے زوال پذیر غزنویوں کے حالات سے پورا فائدہ اٹھایا اور دونوں سلطنتوں میں جھگڑے شروع ہوئے، جو کئی سال تک برابر جاری رہے، اتفاقاً سلطان بہرام غزنوی اور غور کے حاکم قطب الدین ابو علی حسن بن محمد بن عباس میں کسی بات پر ناچاقی ہوئی اور پانچویں صدی ہجری کے بالکل اواخر / بارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں یعنی 493ھ / 1100ء میں ان دونوں میں جنگ ہوئی، اس لڑائی میں قطب الدین غوری مارا گیا، قطب الدین غوری کے بھائی سیف الدین غوری نے اپنے بھائی کے انتقام میں غزنی پر فوج کشی کر کے بہرام غزنوی کو غزنی سے نکال دیا اور خود تختِ غزنی پر قابض ہو گیا، بہرام غزنوی نے اطرافِ ملک سے امداد حاصل کر کے غزنی پر حملہ کیا اور سیف الدین غوری کو گرفتار کر کے نہایت بے دردی اور اذیت کے ساتھ قتل کر دیا اور اس کی لاش شہر میں گشت کرائی۔

13.2.3 غزنی پر علاء الدین حسین جہاں سوز غوری کا قبضہ

آخر کار غور کے بادشاہ علاء الدین حسین جہاں سوز نے اپنے بھائی کے فریب کارانہ قتل کا انتقام لینے کے لئے 547ھ / 1149ء میں غزنین کا محاصرہ کیا اور شدید ترین حملوں کے بعد اسے فتح کر لیا، اُس کی اجازت سے غوری فوجیوں نے غزنین میں سات دنوں تک قتل، غارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم رکھا، غزنین کے بڑے بڑے سردار جو علاء الدین کے بھائی کے قتل کی سازش میں شریک تھے، کو پابہ زنجیر غور لایا گیا اور قتل کر کے اُن کے خون کو گارے میں ملا کر اُن عمارتوں کی تعمیر میں استعمال کیا گیا جو اُس وقت غور میں بن رہی تھیں۔ اسی سنگ دلی اور ظالمانہ کردار کی وجہ سے علاء الدین کو جہاں سوز کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ علاء الدین جہاں سوز غوری نے غزنی کی فتح کے بعد

غزنی میں اپنا ایک نائب السلطنت مقرر کیا اور خود غور میں اپنے دار الحکومت فیروز کوہ کی جانب چلا گیا، اس طرح غزنی غور کی سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا۔

بہرام غزنوی نے سلطان سنجر سلجوقی سے فریاد کی، اُس نے دوسرے سال غور و غزنی فتح کر کے بہرام غزنوی کو پھر اپنی طرف سے غزنی پر قابض کر دیا اور علاء الدین جہاں سوز کو گرفتار کر کے اپنے ہمراہ لے گیا، لیکن چند ہی روز کے بعد سلطان سنجر نے اسے اس کی قابلیتوں کی وجہ سے رہا کر دیا اور وہ غور میں پھر حکومت کرنے لگا۔ واضح رہے کہ سقوطِ غزنین سے قبل ہی یہاں کا بادشاہ خسرو شاہ اپنی جان بچا کر لاہور آ گیا تھا، جہاں (سات سال تک حکومت کرنے کے بعد) 555ھ / 1160ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا خسرو ملک لاہور کے تخت پر باپ کا جانشیں ہوا، یہ دولتِ غزنویہ کے سلسلہ کی آخری کڑی تھا۔ اس کے بعد ہی ترکانِ غز نے سلطان سنجر کو گرفتار کر کے چار سال تک اپنے قید میں رکھا، سلطان سنجر کے قید ہونے کے بعد علاء الدین غوری نے بہرام غزنوی کو بے دخل کر کے غزنی پر بھی قبضہ کر لیا اور 556ھ / 1161ء میں انتقال کر گیا۔

علاء الدین غوری کو دولتِ غوریہ کا پہلا خود مختار بادشاہ سمجھنا چاہیئے، اس کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا سیف الدین ثانی غور کے تخت پر بیٹھا اور تقریباً ڈیڑھ سال حکومت کر کے ترکانِ غز کی ایک لڑائی میں اپنے ہی ایک سردار کے ہاتھ سے مارا گیا۔

13.2.4 غیاث الدین غوری

اُس کے بعد علاء الدین غوری کی حکومت اُس کے بھتیجوں میں اس طرح تقسیم ہو گئی کہ ایک بھتیجہ غیاث الدین غوری، غور کا بادشاہ تھا اور دوسرا بھتیجہ سلطان شہاب الدین غوری عُرف معزالدین محمد غزنین کا گورنر تھا۔ الغرض غیاث الدین غوری اور شہاب الدین غوری دونوں بھائی، طُغرل بیگ سلجوقی اور چغر بیگ سلجوقی کی طرح سلطنت میں باہم شریک تھے۔ غیاث الدین غوری خوارزم شاہ سے بھی برسرِ پیکار ہوا اور خراسان کے نواحی علاقوں پر قابض ہو گیا، لیکن آخر میں اندخود میں شکست کھائی۔

13.2.5 سلطان شہاب الدین عرف معزالدین محمد غوری

شہاب الدین محمد غوری اپنے بڑے بھائی کا نہایت درجہ فرماں بردار تھا، غزنین میں اس کی حکومت آزاد تھی، اس کے باوجود وہ سکّوں پر اپنے بڑے بھائی ہی کا نام کندہ کراتا رہا۔ شہاب الدین نہایت عالی ہمت، مستعد اور حوصلہ مند حکمران تھا، ہندستان پر محمود غزنوی کے آخری حملے اور سلطان محمد غوری کی آمد تک دو صدیاں گذریں۔ جس مردِ مجاہد نے شمالی ہندستان کے عسکری نظام کو محمود غزنوی کے بعد پھر درہم برہم کیا اور اس کی جگہ اسلامی نظامِ حکومت کی مستحکم بنیادیں قائم کیں، اس کا نام محمد غوری تھا، وہ کردار کی مضبوطی اور عقل و سمجھ میں محمود غزنوی سے بڑھ کر تھا، وہ شکست سے ہراساں نہ ہوتا، اس کی ہمت اور خوش تدبیری شکست کو فتح میں بدل دیتی 602ھ / 1206ء میں جب وہ شہید ہوا اُس وقت تقریباً سارے شمالی ہندوستان پر اسلامی پرچم لہرا رہا تھا اور قطب الدین ایبک، محمد بن بختیار خلجی، التمش، ناصر الدین قباچہ اور دوسرے افسروں کا سلطان ایک ایسا منتخب گروہ چھوڑ گیا تھا جو اس کا کام جاری رکھ سکتے تھے۔ ہندوستان میں مسلم حکومت کے بانی ہونے کے باوجود یہاں کے باشندوں کے خلاف اس کے دل میں عناد، حقارت اور تعصب کا کوئی جذبہ نہ تھا، اس میں وفاداری اور اخلاقی

شرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

وہ شروع سے ہی ہندوستان کو فتح کرنے کا آرزومند تھا، چنانچہ اس نے اپنا وقت زیادہ تر ہندوستان میں فتوحات حاصل کرنے اور حملوں میں بسر کیا۔ مگر فتحِ ہندوستان کے لئے سب سے پہلے ضروری تھا کہ پنجاب کو پہلے کی طرح تاج وتختِ غزنین کے ساتھ وابستہ کیا جائے، جب کہ اس وقت پنجاب پر بہرام غزنوی کی اولاد خسرو شاہ (یا خسرو ملک) کی حکومت تھی، نیز غوریوں کو خوارزم شاہ سے لڑنے کے لئے اپنے لاہور کے غزنوی دشمنوں اور ملتان کے قرامطوں کا قلع قمع کرنے کی ضرورت پڑی۔

13.2.6 سلطان شہاب الدین محمد غوری کی فتوحات

شہاب الدین عُرف معزالدین محمد غوری نے 571ھ / 1175ء میں سب سے پہلے ملتان پر حملہ کیا، یہ صوبہ اس وقت قرامطہ کے زیرِ نگیں تھا اور یہاں اسمعیلیوں نے دوبارہ قوت حاصل کرلی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل سلطان محمود غزنوی نے قرامطی حکمراں پر کاری ضرب لگائی اور ان کو ملتان سے بے دخل کر دیا تھا، مگر اس کی موت کے بعد انہوں نے پھر اقتدار حاصل کرلیا، معزالدین محمد غوری نے دوبارہ ان کی طاقت کو اکھاڑ پھینکا اور اس علاقہ میں قرامطی اقتدار پھر کبھی قائم نہ ہو سکا۔ اس نے ملتان فتح کر کے یہاں اپنا ایک والی مقرر کیا۔

پھر وہ سندھ کے شہر اُچھ (اُچ) کی طرف بڑھا، اسے 572ھ / 1176ء میں تسخیر کر کے علی کرماج کے حوالہ کیا، اس نے سندھ کے زیریں علاقہ میں یلغار کر کے یہاں کے سومر حکمرانوں سے اپنا اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرایا۔

شہاب الدین غوری نے 574ھ / 1177ء میں اُچھ کے راستہ ریگستان کو طے کر کے گجرات میں داخل ہوا اور انھلواڑہ یا نہروالا (پٹن) پر یلغار کیا، جو اس وقت گجرات کے بگھیلا خاندان کے راجہ بھیم دیو دوم کا دار السلطنت تھا، یہ راجہ کمسن تو تھا، مگر بہت بہادر اور جانباز تھا، اس کے پاس بہت بڑی فوج اور ہاتھیوں کی ایک بڑی تعداد بھی تھی، چنانچہ محمد غوری نے راجہ مول راج دوم اور اس کے چچا راجہ بھیم دیو دوم سے جنگ میں شکست کھائی۔ وہ سندھ پر علی کرماج کو حاکم بنا کر گجرات سے غزنی واپس چلا گیا۔

اس شکست کے بعد شہاب الدین محمد غوری کو یہ اندازہ ہوا کہ ہندوستان کی تسخیر سندھ اور ملتان کی راہ سے نہیں ہو سکتی ہے، بلکہ اس کا دروازہ پنجاب کی طرف سے کھل سکتا ہے، اس لئے اس نے اپنی راہ بدل دی اور پنجاب ہو کر ہندوستان کے قلب تک پہنچنے کی کوشش کی، اس نے پشاور پر حملہ کیا جو کہ غزنویوں کی ہندوستانی مملکت میں شامل تھا اور 575ھ / 1180ء-1179ء میں اس پر قبضہ کرلیا۔

پشاور ترائن کی جانب پہلا قدم تھا اور اس کے دو سال بعد شہاب الدین محمد غوری نے لاہور پر حملہ کیا اور دو مرتبہ کی ناکامی کے بعد 582ھ / 1186ء میں اسے فتح کرلیا، اب لاہور غوریوں کے قبضہ میں آ گیا۔ خسرو ملک غزنوی جو لاہور میں دولتِ غزنویہ کی آخری نشانی تھا، گرفتار کر کے گرجستان کے مالاروان قلعہ میں بھیج دیا گیا، جہاں کچھ عرصہ بعد 587ھ / 1192ء میں اسے مار دیا گیا۔ 587ھ / 1192ء تک دیبل، سیالکوٹ، ملتان، سندھ اور لاہور غور کی عملداری کے حصہ بن گئے اور پنجاب میں غزنویوں کی حکومت ختم ہو گئی۔ اس کی فتح کا اہم پہلو جو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ راجپوت حکومتوں پر حملہ شروع کرنے سے قبل اس نے سندھ اور پنجاب میں اپنی طاقت مستحکم کی۔

پنجاب پر قبضہ ہو جانے کے بعد شہاب الدین غوری کے لئے ہندوستان پر حملہ کرنا آسان ہو گیا، اب اس کی سلطنت کی سرحد اجمیر اور دہلی کے بہادر راجہ پرتھوی راج کی سلطنت سے مل گئی، محمد غوری کو مزید قوت اس سے پہنچی کہ اس وقت قنوج اور دہلی و اجمیر شمالی ہند میں راجپوتوں کی یہ دو مضبوط اور طاقت ور حکومتیں تھیں، قنوج کی حکومت جے چند کے قبضہ میں تھی اور دہلی و اجمیر کی سلطنت کا فرماں روا پرتھوی راج تھا، لیکن ان دونوں میں سخت پھوٹ پڑی ہوئی تھی اور اس کا اثر یہ تھا کہ شمالی ہند کے اعیان و امراء دونوں راجاؤں کی حمایت میں بٹ گئے تھے، اس موقعہ کو غنیمت جان کر شہاب الدین محمد غوری نے 586ھ / 1192ء میں تبر ہندا (بھٹنڈا) کا قلعہ جو دہلی کے راجہ رائے پتھورا کے قبضہ میں تھا، پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا اور اسے ملک ضیاءالدین تولکی کے زیرِ انتظام کر دیا گیا اور بارہ ہزار سواروں کی ہندوستان اور غزنی کی ایک چنندہ فوج اس کے ذمہ کر دی گئی اور تبر ہندا کے قلعہ کو آٹھ ماہ تک سنبھالے رکھنے کی ذمہ داری اسے دی گئی۔

یہ سن کر راجہ رائے پتھورا (پرتھوی راج سوم) اپنے سیاسی شعور کے تحت فوراً لڑائی کے لئے آمادہ ہو گیا۔ تھانیسر سے چودہ میل کے فاصلہ پر موضع ترائن (موجودہ تراوڑی) میں دونوں کا مقابلہ ہوا، پرتھوی راج کے راجپوت لشکر نے شہاب الدین معزالدین محمد غوری کو شکست دی، خود محمد غوری بری طرح زخمی ہوا، ایک خلجی فوجی سردار اسے میدان جنگ سے نکال کر بچالے گیا۔ معزالدین کو شکست دینے کے بعد رائے پتھورا کی فوج تبر ہندا (بھٹنڈا) کی جانب بڑھی، ملک ضیاءالدین نے اس قلعہ کی تیرہ مہینوں تک حفاظت کی، مگر بعد میں ہتھیار ڈال دئے۔ محمد غوری شکست خوردہ فوج کے ساتھ غزنی چلا گیا، وہاں اس نے افغانوں کو چھوڑ کر، اپنے غوری، خلجی اور خراسانی امیروں کو سخت سزائیں دیں اور ایک سال کی شب و روز کی تیاری کے بعد 588ھ / 1193ء میں غوری یک بیک پھر ہندوستان آیا، تاج المعاصر کے مطابق، لاہور پہنچ کر معزالدین غوری نے قوام الملک رکن الدین حمزہ کو لاہور سے رائے پتھورا (پرتھوی راج) کے پاس قبولِ اطاعت کا پیام دے کر بھیجا، اس نے جب اطاعت سے انکار کر دیا تو ترائن گاؤں کے اسی میدان میں دونوں کے درمیان پھر ایک سخت جنگ ہوئی جس میں دہلی کے راجہ رائے پتھورا کا سپہ سالار کھنڈے رائے مارا گیا، پرتھوی راج گرفتار ہوا، اس طرح دہلی سمیت اجمیر تک کا علاقہ شہاب الدین غوری کے قبضہ میں آ گیا۔

13.2.7 شمالی ہندوستان کی فتح

ترائن کی فتح راجپوتوں کے لئے ایک بڑا حادثہ تھا، راجپوتوں کی سیاسی عظمت کو عام طور پر اور چوہانوں کے اقتدار کو خاص طور پر سخت دھکّا لگا، ساری چوہان حکومت اب حملہ آوروں کے قدموں میں تھی، چوں کہ ترائن کی جنگ راجپوت شہزادوں کی ایک بڑی جماعت کی مشترکہ کوشش تھی، اس لئے اس کے اثرات بڑے پیمانے پر محسوس ہوئے اور دور دور تک پست ہمتی پھیل گئی۔ ترائن کی فتح سے سیوالک کا پورا علاقہ جس میں قلعہ سرسوتی، ہانسی، سمانہ اور کہرام وغیرہ شامل تھے، سب شہاب الدین غوری کی سلطنت میں داخل ہو گئے اور بالآخر اس نے ہندوستان میں ترکوں کی سلطنت کی بنیاد ڈال دی۔ اس بڑی کامیابی کے بعد محمد غوری نے مفتوحہ ممالک اپنے بڑے معتمد فوجی سردار اور غلام قطب الدین ایبک کے سپرد کر دیا اور خود غزنی واپس چلا گیا۔

13.2.8 ترائن کے بعد مملکت کی توسیع

قطب الدین ایبک نے پہلے کہرام اور پھر دہلی کو پایہ تخت بنایا اور راجپوتوں کی بغاوت فرو کرتا رہا۔ اسی سال یعنی 588ھ / 1192ء میں میرٹھ اور باران ڈور (موجودہ بلند شہر) جو راجپوتوں کے تحت تھے، پر ایبک نے قبضہ کیا، میرٹھ اور باران ڈور کی فتح فوجی، جغرافیائی اور سیاسی نقطۂ نظر سے بہت اہم تھی، کیوں کہ ان مقامات سے وہ گڑھوال حکومت پر حملوں کا انتظام کر سکتا تھا۔ 589ھ / 1194ء میں کول (علی گڑھ) پر قطب الدین نے قبضہ کیا، 592ھ / 1196ء 1195-ء میں شہاب الدین شمالی ہند کے راجہ قنوج سے سرحدی جنگ کا فیصلہ کرنے اور گڑھوال اقتدار کا خاتمہ کرنے پھر ہندوستان آیا، اٹاوہ (یا چندوار) کے پاس دونوں کا مقابلہ ہوا، راجہ قنوج جے چند مارا گیا اور قنوج سے لے کر بنارس تک کا ملک شہاب الدین محمد غوری کے قبضہ میں آ گیا، اس فتح نے بنارس اور بانسی جیسے مقامات پر فوجی چھاؤنیاں قائم کرنے کا موقع پیش کیا۔ غوری افغانستان چلا گیا۔ بعد ازاں قطب الدین نے گجرات، گوالیار، بیانہ اور بختیار خلجی نے جو قنوج میں غوری کا نائب تھا، پہلے اودھ اور بہار اور پھر مغربی بنگال فتح کر کے اسلامی سلطنت میں شامل کر دئے۔

13.2.9 سلطان شہاب الدین محمد غوری کی شہادت

602ھ / 1206ء میں شمالی ہندوستان میں کھوکھروں کی بغاوت اور فتنہ وفساد کے سبب محمد غوری پھر ہندوستان آیا، اس سے فارغ ہو کر وہ غزنی واپس جا رہا تھا کہ رات کو دریائے جہلم (سندھ) کے کنارے پر واقع دمیک (یا دمیاک) نامی ایک مقام پر ایک کھوکھر اسمٰعیلی فدائی اس کے خیمہ میں گھس گیا اور سلطان شہاب الدین محمد غوری کو اس وقت شہید کر ڈالا جب کہ وہ مغرب کی نماز ادا کر رہا تھا، لاش غزنی میں دفن ہوئی۔

13.2.10 سلطان شہاب الدین محمد غوری کے کارنامے

سلطان شہاب الدین محمد غوری عرف معزالدین بن سام کو عہدِ وسطیٰ کی ایک عظیم ترین سلطنت کے قیام کا فخر حاصل ہے۔ بلاشبہ ہندوستانی معاشرہ کی کمزوری نے شمالی ہندوستان کی فتح کی راہ ہموار کر دی، ہندوستان میں ترکی سلطنت کے قیام میں معزالدین کی خدمات کا جتنا بھی اعتراف کیا جائے وہ کم ہوگا۔ اس نے اپنی دوررسی اور فوجی ہوشیاری سے دریائے آموسے جمنا تک کے وسیع علاقے میں مہموں کا انتظام کیا اور محتاط اور جرأت مندانہ منصوبہ بندی کے ذریعہ اسے مستحکم رکھا، مفتوح علاقوں پر تنظیم کی حیثیت سے براہِ راست حکومت قائم کرنے کے لئے معزالدین کو ذرائع حاصل نہ تھے، زبان کا مرحلہ ایک ناقابل حل دشوار تھا، محمود کی جنگی کارگزاریوں کے بعد سے 150 سال کے عرصہ میں شمالی ہندوستان میں کچھ نو مسلم آبادیاں قائم ہو گئی تھیں، معزالدین نے انتظامی معاملات طے کرنے میں دو زبان بولنے والے مسلمانوں کی خدمات ضرور حاصل کی ہوں گی، لیکن ان کی تعداد اتنی نہ رہی ہو گی کہ وہ مرکزی، صوبائی اور مقامی انتظامیہ کی ضرورت پوری کر سکتے تھے۔

پنجاب سے بنگال تک پھیلے ہوئے وسیع علاقے کے انتظامی امور کی دیکھ بھال کرنے کے لئے معزالدین کو فنونِ جنگ و انتظامیہ میں عمدہ تعلیم حاصل کئے ہوئے غلاموں پر تکیہ کرنا پڑا۔ اس نے بڑے بڑے رایوں کو ختم کر کے دیہی اور قصباتی علاقوں کو چھوٹے چھوٹے رایوں اور راوتوں کے تحت چھوڑ دیا، تاکہ عوام میں تبدیلیٔ حکومت کا احساس کم ہو اور اس کی حکومت قائم رہ سکے۔ نیز اس نے صرف بڑے بڑے

اور فوجی اہمیت کے شہروں اور تجارتی راستوں پر قبضہ رکھا، اس نے بڑے بڑے رایوں سے اس طور پر جنگ لڑی کہ وہ متحد ہو کر آپس میں نہ مل سکیں، چنانچہ وہ بہت سے علاقوں کی جزوی فتح پر ہی قناعت کر گیا اور معاملات کو بہت آگے نہ بڑھایا۔ غور کی ثقافتی ترقی میں بھی معزالدین محمد غوری کے کارنامے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، درحقیقت اس نے اور اس کے بڑے بھائی غیاث الدین نے ہی غور کی ثقافتی طرزِ زندگی میں تبدیلی لائی۔ فن تعمیرات کی روایات میں بھی اس نے کچھ قابلِ قدر اضافے کیے۔

13.2.11 غوری سلطنت کی تقسیم

شہاب الدین محمد غوری کی شہادت کے بعد اس کی سلطنت اس کے مختلف غلام افسروں میں تقسیم ہو گئی، جن میں سے بلاذر، ناصر الدین قباچہ اور قطب الدین ایبک تین مشہور ترک سپہ سالار تھے۔ غزنین پر بلاذر نے، سندھ پر ناصر الدین قباچہ نے اور ہندوستان پر قطب الدین ایبک نے قبضہ کیا۔

13.3 کلیدی الفاظ

کوہستان	:	پہاڑی علاقہ یا سلسلہ، وہ مقام جہاں پہاڑ بکثرت ہوں
پایہ تخت	:	دارالحکومت، راجدھانی، دارالسلطنت
ناچاقی	:	ان بن، بگاڑ، اختلاف
کندہ	:	کھدا ہوا، نقش کیا ہوا، لکھا ہوا
سقوطِ	:	زوال، عدم تسلط، باقی نہ رہنا
بے دخل	:	خارج، محروم، قبضے سے نکالا ہوا
عسکری	:	سپاہی، فوج کی عسکر سے نسبت

13.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- غور کا پہاڑی علاقہ (Hill Regions) غزنی اور ہرات کی پہاڑیوں کے درمیان واقع ہے، دوسرے لفظوں میں کابل کے حدود میں غزنی سے دور ہرات کے مشرقی کوہستان میں غور ایک وسیع خطہ کا نام ہے۔
- پانچویں صدی ہجری کے اوائل یا اس سے کچھ قبل (یعنی دسویں صدی عیسوی میں) غور ایک آزاد ریاست تھی اور ایک ایرانی النسل تاجک خاندان کے زیرِ نگیں تھی جو تاریخوں میں شنبسانی خاندان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ شنبسانی خاندان، شہاب الدین عُرف معزالدین محمد غوری جس کا ایک فرد تھا۔

- علاء الدین غوری کو دولتِ غوریہ کا پہلا خود مختار بادشاہ سمجھنا چاہیئے، اس کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا سیف الدین ثانی غور کے تخت پر بیٹھا اور تقریباً ڈیڑھ سال حکومت کر کے ترکانِ غز کی ایک لڑائی میں اپنے ہی ایک سردار کے ہاتھ سے مارا گیا۔
- آخر کار غور کے بادشاہ علاء الدین حسین جہاں سوز نے اپنے بھائی کے فریب کارانہ قتل کا انتقام لینے کے لئے 547ھ / 1149ء میں غزنین کا محاصرہ کیا اور شدید ترین حملوں کے بعد اسے فتح کر لیا، اُس کی اجازت سے غوری فوجیوں نے غزنین میں سات دنوں تک قتل، غارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم رکھا، غزنین کے بڑے بڑے سردار جو علاء الدین کے بھائی کے قتل کی سازش میں شریک تھے، کو پابہ زنجیر غور لایا گیا اور قتل کر کے اُن کے خون کو گارے میں ملا کر اُن عمارتوں کی تعمیر میں استعمال کیا گیا جو اُس وقت غور میں بن رہی تھیں۔ اسی سنگ دلی اور ظالمانہ کردار کی وجہ سے علاء الدین کو جہاں سوز کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔
- شہاب الدین عُرف معز الدین محمد غوری نے 571ھ / 1175ء میں سب سے پہلے ملتان پر حملہ کیا، یہ صوبہ اس وقت قرامطہ کے زیرِ نگیں تھا اور یہاں اسمعیلیوں نے دوبارہ قوت حاصل کر لی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل سلطان محمود غزنوی نے قرامطی حکمراں پر کاری ضرب لگائی اور ان کو ملتان سے بے دخل کر دیا تھا، مگر اس کی موت کے بعد انہوں نے پھر اقتدار حاصل کر لیا، معز الدین محمد غوری نے دوبارہ ان کی طاقت کو اکھاڑ پھینکا اور اس علاقہ میں قرامطی اقتدار پھر کبھی قائم نہ ہو سکا۔ اس نے ملتان فتح کر کے یہاں اپنا ایک والی مقرر کیا۔
- ترائن کی فتح راجپوتوں کے لئے ایک بڑا حادثہ تھا، راجپوتوں کی سیاسی عظمت کو عام طور پر اور چوہانوں کے اقتدار کو خاص طور پر سخت دھکّا لگا، ساری چوہان حکومت اب حملہ آوروں کے قدموں میں تھی، چوں کہ ترائن کی جنگ راجپوت شہزادوں کی ایک بڑی جماعت کی مشترکہ کوشش تھی، اس لئے اس کے اثرات بڑے پیمانے پر محسوس ہوئے اور دور دور تک پست ہمتی پھیل گئی۔
- سلطان شہاب الدین محمد غوری عرف معز الدین بن سام کو عہدِ وسطیٰ کی ایک عظیم ترین سلطنت کے قیام کا فخر حاصل ہے۔ بلاشبہ ہندوستانی معاشرہ کی کمزوری نے شمالی ہندوستان کی فتح کی راہ ہموار کر دی، ہندوستان میں ترکی سلطنت کے قیام میں معز الدین کی خدمات کا جتنا بھی اعتراف کیا جائے وہ کم ہوگا۔

13.5 نمونہ امتحانی سوالات

13.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. تاریخ میں شنسبانی خاندان کے نام سے کس کو یاد کیا جاتا ہے؟

(a). غوری (b). مغل (c). عباسی (d). اغلبی

2. غوری خاندان کا پایہ تخت کہاں تھا؟

(a). فیروز کوہ (b). قسطنطنیہ (c). لکھنؤ (d). تبریز

3. جہاں سوز کالقب کس کو دیا گیا؟

(a). علاءالدین (b). محمود غزنوی (c). محمد بن تغلق (d). بہادر شاہ ظفر

4. شہاب الدین محمد غوری نے لاہور کو کب فتح کیا؟

(a). 1186ء (b). 1526ء (c). 909ء (d). سب غلط

5. محمد غوری مفتوحہ علاقوں کو کس کے سپرد کر کے غزنی چلا گیا؟

(a). قطب الدین ایبک (b). محمد بن تغلق (c). سکندر لودھی (d). علاءالدین خلجی

6. محمد غوری کی وفات کے بعد کس نے ہندوستان پر آزادنہ حکومت کی؟

(a). قطب الدین ایبک (b). اورنگ زیب (c). بہادر شاہ ظفر (d). سب غلط

7. غزنوی حکومت کا خاتمہ کس نے کیا؟

(a). غوری حکومت (b). صفوی حکومت (c). پہلوی حکومت (d). مغل حکومت

8. علاءالدین نے غزنہ کو کب فتح کیا؟

(a). 1149ء (b). 1250ء (c). 1186ء (d). سب صحیح

9. ان میں سے کون سے بادشاہ نے ملتان پر حملہ کیا؟

(a). شہاب الدین غوری (b). شاہ اسماعیل (c). رضا شاہ پہلوی (d). سب غلط

10. قطب الدین ایبک کس کا سپہ سالار تھا؟

(a). شہاب الدین غوری (b). رضیہ سلطانہ (c). علاءالدین خلجی (d). سکندر لودھی

13.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. غوری خاندان کے بارے میں اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔
2. غوریوں پر غزنویوں کی حکمرانی کے بارے میں لکھیے۔
3. شہاب الدین غوری کے بارے میں لکھیے۔
4. ترائن کی جنگ کے بعد مملکت کی توسیع کا جائزہ لیجیے۔
5. شمالی ہندوستان کی فتح پر نوٹ لکھیے۔

13.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. شہاب الدین محمد غوری کے کارناموں پر روشنی ڈالیے۔

2. شہاب الدین غوری کی فتوحات کا جائزہ لیجیے۔

3. غزنہ پر علاء الدین کے قبضے کی تفصیل بیان کیجیے۔

13.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. جامع تاریخ ہند : محمد حبیب خلیق احمد نظامی

2. ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک : سید صباح الدین عبد الرحمن

3. آب کوثر : شیخ محمد اکرام

4. مسلمانوں کا عروج وزوال : مولانا سعید احمد

5. مختصر تاریخ ہند : مولانا سید ابو ظفر دسنوی ندوی

اکائی 14:   صفوی حکومت کا قیام و استحکام

اکائی کے اجزا:

14.0 تمہید

14.1 مقاصد

14.2 صفوی صوفی سلسلہ

14.3 شاہ اسماعیل صفوی (1501 تا 1524)

14.4 خلافت عثمانیہ سے ٹکراو

14.5 چالدران کی جنگ

14.6 شاہ طہماسپ (1524 تا 1576)

14.7 خلافت عثمانیہ سے اختلافات

14.8 ہمایوں بادشاہ کی مدد

14.9 شاہ اسماعیل دوم (1576 تا 1577)

14.10 محمد خدابندہ (1578 تا 1587)

14.11 شاہ عباس اعظم (1587 تا 1629)

14.12 شاہ صفی (1629 تا 1642)

14.13 شاہ عباس دوم (1642 تا 1666)

14.14 شاہ سلیمان (1666 تا 1694)

14.15 شاہ حسین (1694 تا 1722)

14.16 شاہ طہماسپ دوم (1722 تا 1732)

14.17 شاہ عباس سوم 1732 تا 1736

14.18 اکتسابی نتائج

14.19 نمونہ امتحانی سوالات

14.19.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

14.19.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

14.19.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

14.20 تجویز کردہ اکتسابی مواد

14.0 تمہید

صفوی حکومت اپنے دور کی ایک عظیم حکومت تھی۔ یہ حکومت ایران، آذربائیجان، بحرین، آرمینیا، مشرقی جارجیا، شمالی قفقاز کے کچھ حصے بشمول روس کے کچھ حصے، عراق، کویت اور افغانستان تک پھیلی ہوئی تھی۔ اپنے دور عروج میں عالمی سیاست پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ صفوی حکومت نے سب سے پہلے یوروپ کے لوگوں سے معاہدے کیے۔ اسی عہد میں ایران کے اندر توپ خانہ فوج میں شامل ہوا۔ کہا جاسکتا ہے کہ ایران آج جو ہے اس کی تشکیل صفوی عہد میں ہوئی۔

14.1 مقاصد

اس یونٹ کے مطالعے کے بعد طلبا کو یہ معلوم ہو گا کہ صفوی حکومت ایک صوفی سلسلے سے شروع ہوئی اور کیسے وہ سلسلہ بتدریج ایک عظیم الشان حکومت میں تبدیل ہو گئی۔ اس سلسلے کے متاخرین نے اثنا عشری مذہب اختیار کر لیا تھا۔ شاہ اسماعیل صفوی نے اس عظیم الشان حکومت کو قائم کیا۔ اس حکومت نے مشرقی علاقوں کے کئی جغرافیائی علاقے تبدیل کر دیے۔ اس حکومت نے ازبکوں اور عثمانی ترکوں کے ساتھ مقابلے کیے۔ ایران کو ایک شیعہ ملک میں تبدیل کیا۔ ایران کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کیا اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ صفوی حکمرانوں نے کمال کی صلاحیتوں کا اظہار کرتے ہوئے مختلف الخیال اور مختلف نوعیت کے قبائل اور قوموں کو ایک ساتھ جمع کر کے ایک حکومت کی شکل دی۔

14.2 صفوی سلسلہ

صفوی حکومت ایک صوفی سلسلے سے شروع ہوئی، جس نے بعد میں سیاسی رخ اختیار کر کے وسط ایشیا ایران اور آس پاس کے بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا اور اپنے وقت کی ایک بڑی سلطنت قائم کی۔ اپنے دور عروج میں اس حکومت کے اندر ایران، آذربائیجان، بحرین، آرمینیا، مشرقی جارجیا، شمالی قفقاز کے کچھ حصے بشمول روس، عراق، کویت اور افغانستان۔

صفوی خاندان کے بانی شیخ صفی الدین اردبیلی کے بارے میں زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں۔ غالباً شیخ صفی الدین آذربائیجان کے کسی علاقے سے اردبیل میں آئے۔ وہاں پہلے سے ایک معروف صوفی خانقاہ تھی۔ شیخ صفی الدین بھی اسی سلسلے میں مرید ہو کر اسی صوفی سلسلے سے وابستہ ہو گئے۔ بعد میں وہ ترقی کر کے اسی سلسلے کے پیر مرشد بن گئے۔ بنیادی طور پر وہ ایک صوفی تھے اور خاص بات یہ ہے کہ مسلکاً سنی تھے۔

شیخ صفی الدین کی وفات کے بعد ان کے بیٹے شیخ صدرالدین موسیٰ ان کے جانشین بنے اور انہوں نے بھی صوفیانہ انداز میں لوگوں کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کے زمانے میں یہ سلسلہ کافی علاقے میں پھیل گیا اور دور دور تک ان کے مریدین پھیل گئے۔

شیخ صدر الدین کی وفات کے بعد ان کے بیٹے خواجہ علی ان کے جانشین بنے۔ خواجہ علی نے اس سلسلے کو مزید ترقی دی۔ جب امیر تیمور نے خلافت اسلامیہ پر حملہ کیا اس زمانے میں خواجہ علی وہاں کے مرشد تھے۔ ترکی کو فتح کرنے کے بعد واپسی میں امیر تیمور خواجہ علی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے خواجہ علی کو اردبیل کا پورا علاقہ جاگیر میں دے دیا۔ خواجہ علی مرشد تو تھے ہی اب اس علاقے کے جاگیر دار بھی بن گئے اور اس کی وجہ سے ان کے یہاں دولت اور اقتدار دونوں کی فراوانی ہو گئی۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کے عزائم بھی تصوف کے ساتھ ساتھ سیاسی ہونے لگے۔

خواجہ علی کی وفات کے بعد ان کے بیٹے شیخ ابراہیم نے ان صوفیانہ روایت کے ساتھ ساتھ ان کے سیاسی عزائم کو بھی آگے بڑھایا اور تصوف اور سیاسی عزائم دونوں میں انہوں نے بڑے وسعت دی۔

شیخ ابراہیم کے بعد ان کے بیٹے شیخ جنید ان کے جانشین ہوئے۔ شیخ جنید کے دور میں اس سلسلے کی روحانیت نسبتاً پس پشت چلی گئی اور انہوں نے اس سلسلے کو باضابطہ سیاسی رخ دیا۔ شیخ جنید کے بڑھتے ہوئے سیاسی عزائم کو دیکھ کر قرا کوینلو کے بادشاہ جھان شاہ نے ان کو اردبیل خالی کرنے کا حکم دے دیا۔ شیخ جنید نے خان اوزون حسن سے مدد مانگی، اوزون حسن نے ان کی مدد کی اور ان کی مدد سے شیخ جنید اردبیل پر اپنا اقتدار باقی رکھ پائے۔ اوزون حسن اور شیخ جنید کے درمیان اس کے بعد گہرے تعلقات استوار ہو گئے اور کچھ ہی عرصہ میں یہ تعلقات رشتہ داری میں بدل گیے، اس طرح کہ شیخ جنید نے اوزون حسن کی بہن خدیجہ بیگم سے شادی بھی کر لی۔ اس طرح اس صوفی سلسلے کا تعلق براہ راست ایک شاہی گھرانے سے ہو گیا۔

شیخ جنید کی وفات کے بعد ان کے جانشین شیخ حیدر ہوئے۔ شیخ حیدر نے بھی اپنے والد کی روایت کو باقی رکھا اور روحانت کی تعلیم و تلقین کے ساتھ سیاسی عزائم جاری رکھے۔ ان کی شادی اوزون حسن کی بیٹی سے ہوئی۔ جس کے بطن سے شاہ اسماعیل پیدا ہوئے۔ شیخ حیدر نے اپنے مریدوں کو باضابطہ فوجی انداز میں منظم کیا۔ انہوں نے اپنے مریدین کے لیے ایک مخصوص لباس مقرر کیا۔ ان کے ہر مرید کو ایک وہی لباس پہننا ہوتا تھا، اس لباس میں وہ ایک خاص طرح کی سرخ رنگ کی ٹوپی لازمی قرار دی جس میں بارہ کنگرے ہوتے تھے۔ سرخ ٹوپی کو آذری زبان میں قزلباش کہتے ہیں۔ اس طرح سلسلہ صفویہ کے یہ مریدین قزلباش کہلائے جانے لگے۔ تاریخ میں ان کے بڑے گہرے اور دوررس اثرات ہیں۔

شیخ حیدر کے مریدین جو اب باضابطہ ایک فوج کی شکل اختیار کر چکے تھے ان کی تعداد میں بھی لگاتار اضافہ ہو رہا تھا اور مجموعی طور پر

شیخ حیدر کی قوت بڑھتی جارہی تھی۔ شیخ حیدر کی اس بڑھتی ہوئی مقبولیت اور طاقت سے اوزون حسن کے بیٹے خلیل کو احساس ہوا کہ کہیں ان کی وجہ سے خود اس کی حکومت خطرے میں نہ پڑ جائے، اس لیے خلیل نے ایک سازش رچی اور انہوں نے شروان شاہ کے ساتھ مل کر حیدر کو قتل کر دیا۔

شیخ حیدر کے قتل کے بعد ان کے مریدین نے بدلہ لینے کی کوشش کی اس میں شیخ حیدر کے دو اور بیٹے بھی مارے گئے۔ شیخ حیدر کے تیسرے بیٹے اسماعیل تھے۔ ان کی عمر اس وقت پانچ یا سات سال تھی، ان کے مریدوں نے ان کو جیلان میں چھپا دیا۔ پانچ سال تک وہ جیلان میں مخفی انداز میں رہے، اسی دوران میں ان کی تعلیم و تربیت بھی ہوئی۔

14.3 شاہ اسماعیل صفوی (1501 تا 1524)

پانچ سال مخفی رہنے کے بعد شاہ اسماعیل نے اپنے مریدوں کی مدد سے ایک لشکر تیار کیا۔ ترکوں کے سات قبیلے خاص طور پر ان کے جاں نثار بنے ان کے نام یہ ہیں: روملو، شاملو، استلجو، تکلو، ذوالقدر، افشار اور قاچار۔ ان قبائل کی مدد سے شاہ اسماعیل نے ایک فوج تیار کی۔ شاہ اسماعیل کا بنیادی مقصد اپنے والد کے قتل کا بدلہ لینا تھا اور جو قبائل ان کے گرد جمع ہوئے تھے ان کے اندر بھی یہی جذبہ جنون کی حد تک تھا کہ وہ اپنے مرشد کے قتل کا بدلہ لیں۔ شاہ اسماعیل کے پاس اس طرح ساٹھ ہزار جاں نثار تیار ہو گئے۔ ان کی مدد سے انہوں نے شروان کے علاقے پر حملہ کیا اور اس کو فتح کر لیا، وہاں کے حاکم فرخ یسار شاہ کو قتل کر کے اس کے جسم کو جلا دیا، اسی پر بس نہیں کیا بلکہ وہاں اندھا انتقام لیا گیا، شروان شاہ کے خاندان کی قبریں تک کھود ڈالی گئیں۔

شاہ اسماعیل کے لیے یہ کامیابی بڑی غیر معمولی تھی۔ اس کامیابی نے ان کے سامنے بہت سے راستے کھول دیے۔ اردبیل پر ان کا اقتدار مضبوط ہو گیا، شروان کے علاقے کی حکومت ان کو مل گئی اور اردبیل کی حکومت کے بارے جو خطرات تھے وہ ختم ہو گئے۔ شروان کے علاقے کی فتح کے بعد ایک طرف تو ان کو ایک بڑا علاقہ حکومت کے لیے مل گیا، دوسری طرف اس جنگ میں ان کو مال غنیمت بھی بہت ملا جس کی مدد سے شاہ اسماعیل نے اپنی فوجی قوت میں بہت اضافہ کر لیا۔ اب انہوں نے اپنی عسکری قوت میں اضافہ کرنا شروع کیا۔ اس زمانے میں ایران کے اندر کئی چھوٹی بڑی حکومتیں تھیں، لیکن ایران کے عوام ان سے زیادہ مطمئن نہیں تھے۔ شاہ اسماعیل کی کامیابیوں سے ایران میں لوگ شاہ اسماعیل کو وہ ایک نجات دہندہ کے طور پر دیکھنے لگے اور وہ ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اس طرح شاہ اسماعیل کو لگا کہ وہ باضابطہ حکومت کا اعلان کر کے تخت نشین ہو سکتے ہیں چناں چہ 13 سال کی عمر میں 1501 میں شاہ اسماعیل باضابطہ تخت نشین ہوئے اور انہوں نے اپنی خود مختار حکومت کا اعلان کر دیا۔ اس طرح ایران میں صفوی ریاست قائم ہوئی۔

شاہ اسماعیل نے تخت نشین ہونے کے بعد ایک کام تو یہ ہوا کہ ایران کے اندر ایک ایسی حکومت قائم ہو گئی جس نے ایران کو ایک الگ طرح کی انفرادیت عطا کی اور جدید دور کے ایران کی بنیاد رکھی۔ اس کے علاوہ ایک کام یہ کیا کہ شیعہ مذہب کو ایران کا سرکاری مذہب قرار دے دیا اور لوگوں کو دعوت دی کہ وہ شیعہ مسلک کے مطابق رسوم و اعمال انجام دیں۔ اس تبدیلی سے ایران کے مستقبل پر بڑے

اثرات مرتب ہوئے۔ اس کام کے لیے شاہ اسماعیل نے طاقت کا بھی بے دریغ استعمال کیا۔ ان کی سختی کی وجہ سے بڑی تعداد میں لوگ نقل مکانی کر گئے اور کچھ مارے بھی گئے۔ شاہ اسماعیل نے ایران کے اندر شیعہ مسلک کو سرکاری مذہب بنانے کے بعد علی الاعلان تبرا کی رسم بھی شروع کی اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ پورے ایران کا ایک ہی مسلک ہو جائے۔

شاہ اسماعیل نے حکومت کی توسیع کے لیے بھی جدوجہد کی شروان شاہ کے خلاف فتح حاصل کرنے کے بعد ایران کے دوسرے حصے اور ارد گرد کے دوسرے علاقوں کو فتح کر کیا۔

1503ء تک شاہ اسماعیل نے جنوب میں شیراز اور یزد تک اور مشرق میں ہرات تک کا علاقہ فتح کر لیا اور مغرب میں بغداد، دیار بکر اور موصل تک اپنے سلطنت کی حدود کو بڑھالیا۔ خراسان کے علاقے میں تیموری سلطان حسین بائقرا کی حکومت تھی، لیکن سلطان حسین بائقرا کے بعد انتقال کے بعد شیبانی خان ازبک نے ہرات اور خراسان پر قبضہ کر لیا تھا۔ 1510 میں مرو کے قریب طاہر آباد میں شیبانی خان اور شاہ اسماعیل میں سخت جنگ ہوئی جس میں ازبکوں کی شکست ہوئی اور شیبانی خاں میدان جنگ میں مقتول ہوئے۔ ان کے قتل ہو جانے کے بعد خراسان بھی اسماعیل کے قبضے میں آ گیا اور اب ایران، عراق اور شروان ان کے قبضے میں آ گئے اور کچھ علاقے آذر بائیجان کے ان کے قبضے میں پہلے تھے اس طرح شاہ اسماعیل اس پورے علاقے کے بادشاہ بن گئے اور اس علاقے کی سب سے مضبوط طاقت کے طور ابھرے۔

14.4 خلافت عثمانیہ سے ٹکراو

اس زمانے میں ترکی میں عثمانی ترکوں کی حکومت بہت مضبوط حکومت تھی، بلکہ خطے کی نہیں پوری دنیا کی سب سے مضبوط حکومت وہی تھی۔ اگرچہ ترکوں اور صفویوں کا براہ راست کوئی ٹکراؤ نہیں تھا۔ دونوں کے علاقے اور دونوں کے سیاسی مفادات الگ تھے، لیکن شاہ اسماعیل کو جو لگاتار فتوحات حاصل ہوئیں ان کی وجہ سے شاہ اسماعیل کو بھی یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ ایک بڑی طاقت کے مالک ہیں اور بلاشبہ وہ تھے بھی، تاہم اتنی بڑی طاقت نہیں تھے کہ ترکی سے جیت جاتے، لیکن ان کے مریدین یعنی قزلباش بھی یہ سمجھنے لگے کہ شاہ اسماعیل کو کوئی ہرا نہیں سکتا، اس لیے انہوں نے اپنی حکومت کو عثمانیوں کے مقابلے میں پیش کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد بھی کوئی بڑا تنازعہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ اصل جو اختلاف شروع ہوا وہ اس سے ہوا کہ ایک عثمانی شہزادہ مراد اپنی حکومت اور اپنے والد سلطان سلیم سے باغی ہو گیا تھا۔ بغاوت کر کے وہ ترکی سے نکل گیا۔ شاہ اسماعیل نے اس کو اپنے ملک میں پناہ دی اور اس سے وعدہ کیا کہ وہ سلطان سلیم کو تخت سے اتار کر شہزادہ مراد کو ان کی جگہ تخت پر بٹھائیں گے اور اس کے لیے انہوں نے باضابطہ حملہ کرنے کی تیاری بھی شروع کر دی۔ اس کے بعد سلطان سلیم کے لیے بھی ایران کی طاقت کو ایک خطرہ کے طور پر دیکھنا ان کی مجبوری بن گیا، اس لیے انہوں نے بھی اس کا مقابلہ کرنے کے لیے تیاری شروع کر دی۔ اسی درمیان میں دونوں طرف سے ایسے معاملات بھی پیش آتے رہے جن کی وجہ سے کشیدگی بڑھتی ہی چلی گئی۔ خاص طور شاہ اسماعیل نے اس اختلاف کو بڑھانے میں اپنا کردار انجام دیا۔ سلطان سلیم کا مطالبہ تھا کہ وہ شہزادہ مراد کو ان کے حوالے کر دیں اور جنگ نہ کریں، لیکن شاہ اسماعیل اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ ترکی کے لیے مزید خطرہ یہ بڑھ گیا کہ اس زمانے میں ایران ترک باغیوں کی ایک

مضبوط پناہ گاہ بن گیا تھا، جو لوگ ترکی میں کسی وجہ سے مطلوب ہوتے وہ بھاگ کر ایران آجاتے اور ان کو یہاں پناہ مل جاتی اس طرح دونوں ملکوں میں کشید گی بڑھتی ہی چلی گئی اور انجام کار دونوں کے درمیان ایک خوں ریز جنگ ہوئی جو تاریخ میں چالدران کی جنگ کے نام سے معروف ہے۔

14.5 چالدران کی جنگ

شاہ اسماعیل اور اور سلطان سلیم کے درمیان چالدران کے میدان میں 1514ء میں مقابلہ ہوا۔ اس جنگ میں اگرچہ شاہ اسماعیل کے لوگ بڑی جانبازی سے لڑے اور تقریباً 25 ہزار ایرانی اس میں مارے بھی گئے، لیکن ترکی فوج بہت مضبوط تھی اور توپ خانے سے مسلح تھی اس لیے کامیابی ترکوں کو ملی۔ شاہ اسماعیل اور قزلباش کو اس جنگ میں زبردست شکست ہوئی۔ اس جنگ نے قزلباش اور اور ایران کی صفوی حکومت کو بکھیر کر رکھ دیا۔ ان کا ناقابل تسخیر ہونے کا خیال بھی ٹوٹ گیا اور شاہ اسماعیل کے لیے حالات کا مقابلہ کرنا مشکل ہو گیا۔ ان کو اپنے پایہ تخت بھی چھوڑنا پڑا۔ چالدران کی جنگ ایران کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی۔ اس کے بعد شاہ اسماعیل کی حکومت پھر اس مقام تک کبھی نہیں پہنچ سکی جہاں وہ اس جنگ سے پہلے تھی۔

چالدران میں صفوی فوج کی شکست کی اصل وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ عثمانیوں کے پاس توپ خانہ تھا جب کہ شاہ اسماعیل کے صرف روایتی ہتھیار تھے۔ بہر حال چالدران کی جنگ نے ایران کی ابھرتی ہوئی طاقت کو بہت نقصان پہنچایا۔ سلطان سلیم نے آگے بڑھ کر تبریز پر قبضہ کر لیا اور ایک سال اس علاقے میں رہ کر صفوی حکومت کی بیشتر مقبوضات پر ترکی کا قبضہ ہو گیا۔ ان میں کردستان، کرج، آرمینیہ، کرمان، عراق اور جزیزہ وغیرہ کے علاقے شامل ہیں۔

شاہ اسماعیل سلطان سلیم سے شکست کھانے کے بعد مختلف علاقوں میں رہے۔ تبریز جو ان کا دارالحکومت تھا اس پر ترکوں کا قبضہ ہو گیا تھا، اس لیے وہ مختلف علاقوں میں پناہ تلاش کرتے رہے، لیکن اس دوران میں شاہ اسماعیل نے اپنے مذہب یعنی شیعہ مذہب کو بہت شدت سے پھیلانے کی کوشش کی اور جو علاقے ان کے زیر اثر تھے وہاں انہوں نے اسی مذہب کو رائج کر دیا۔

شاہ اسماعیل نے اس کے بعد اپنی باقی زندگی اپنے بچے کچے ساتھیوں کو جمع کرنے اور جتنا علاقہ واپس لے سکیں اس کو واپس لینے میں صرف کر دی۔ سلطان سلیم نے بھی حالات پر پوری نظر رکھی اور جہاں تک ہو سکا صفوی طاقت کو ابھرنے نہیں دیا۔

شاہ اسماعیل کو خود بھی اس شکست کا بڑا احساس تھا۔ قزلباش بھی جو شاہ اسماعیل کی شکل نائب امام کو دیکھتے تھے ان کا یقین محکم متزلزل ہو گیا۔ اس کے بعد بعض حلقوں میں ان کے خلاف بغاوت بھی ہوئی، ایسی ہی کسی بغاوت کو فرو کرنے کے لیے وہ ایک مرتبہ شروان کے علاقے میں گئے ہوئے تھے۔ وہاں بیمار ہو گئے۔ علاج اور آرام کے بعد انہوں نے واپس تبریز کی طرف رخ کیا، لیکن راستے میں 1524 میں ان کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر 36 سال تھی۔ شاہ اسماعیل کے بعد ان کا 10 سالہ بیٹا طہماسپ تخت نشین ہوا۔

14.6 شاہ طہماسپ(1524تا1576)

شاہ طہماسپ اپنے والد شاہ اسماعیل کی وفات کے بعد تخت نشین ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر 10 سال تھی۔ طہماسپ کا ابتدائی دور بہت مشکل حالات کا تھا۔ اس وقت زمینی حقیقت ایسی تھی کہ کوئی امید نہیں کر رہا تھا کہ یہ حکومت قائم رہ پائے گی۔ صفوی حکومت کے قزلباشوں میں اس زمانے میں دو بلکہ تین ترک خاندان بہت طاقتور تھے ایک روملو دوسرا شاملو اور تیسرا استلجو شاہ طہماسپ کو سلطان روملو کی سرپرستی حاصل تھی اور استلجو کے بعض قبائل روملو کے خلاف تھے، اس لیے قزلباش کے اندر خانہ جنگی شروع ہوگئی ایران کے کچھ حصے پر استلجو نے قبضہ کر لیا کچھ پر ایک اور قبیلے تکالو نے قبضہ کر لیا اور کچھ پر روملو کا قبضہ ہو گیا۔ اس وقت تک شاملو اور تکلو ایک ساتھ تھے اس لیے ان کو ایک گروہ خیال کیا جا سکتا ہے۔ شاہ طہماسپ نے دونوں کے اختلافات کو دور کرنے کی بہت کوشش کی دونوں گروہوں کے درمیان صلح بھی کرائی، لیکن ان دونوں کے مفادات کا ایسا ٹکراؤ تھا کہ کوئی صلح پائیدار ثابت نہ ہو سکی اور ان کے جھگڑے بدستور رہے۔ ان اختلافات کے چلتے حالات ایسے ہو گئے کہ شاہ طہماسپ نے روملو قبیلے کے امیر الامراء کو ہٹا کر حسین خاں شاملو کو امیر الامراء مقرر کیا لیکن اختلافات بدستور رہے۔

1526 اور 1531 میں ان قبائل کے درمیان کئی خوں ریز معرکے ہوئے جن میں ان قبائل کے درمیاں باضابطہ محاذ آرائی ہوئی۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اس خانہ جنگی میں ہارنے والے قزلباش عام طور پر عثمانی ترکوں کے یہاں پناہ لیتے اور ان کی فوج میں شامل ہو جاتے۔ خاص طور پر تکلو قبائل بڑی تعداد میں اس کے اندر شامل ہو گئے۔

1534 میں حسین خاں شاملو پر یہ الزام لگا کہ اس نے شاہ طہماسپ کو زہر دینے کی کوشش کی ہے اس کی وجہ سے ان کو معزول کر کے قتل کر دیا گیا۔

ایران میں ایک طرف یہ خانہ جنگی چل رہی تھی دوسری طرف بیرونی دشمنوں کا خطرہ بھی بنا ہوا تھا اور یہ خطرہ اس وقت حقیقت میں بدل گیا جب ایران کی مشرقی سرحد پر ازبکوں نے حملہ کر دیا۔ ازبک اپنی پچھلی شکستوں کا بدلہ لینے کے لیے حملے کر رہے تھے۔ ازبک سردار عبید اللہ خاں نے ایران کی مشرقی سرحد کو کافی حد تک غیر محفوظ کیے رکھا اور ان کے لگاتار حملوں سے ہرات، مرو، استرآباد وغیرہ پر قبضہ کر لیا ازبکوں کے اس حملے کی وجہ سے ایران کو نقصان تو ہوا لیکن ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ جو قزلباش قبائل آپس میں لڑنے جھگڑنے میں مصروف تھے اور ایک طرح کی خانہ جنگی سے ایران دوچار تھا ازبک حملے کی وجہ سے یہ اختلافات ایک دم کم ہو گئے اور سب نے متحد ہو کر ملک کا دفاع کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ 1528 میں ازبکوں کے مقابلے میں شاہ طہماسپ کو بڑی کامیابی ملی۔ اس کی وجہ سے ایک تو قزلباش کا حوصلہ بلند ہوا، دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ باہم خانہ جنگی میں مبتلا قبائل کی توجہ آپسی اختلافات کی جگہ باہری دشمن سے مقابلہ کی طرف ہوئی اس کی وجہ سے شاہ طہماسپ کی حکومت کو استقرار نصیب ہوا۔

14.7 خلافت عثمانیہ سے اختلافات

شاہ اسماعیل کے زمانے میں ایران اور ترکی کے درمیان چالدران کی جنگ ہوئی تھی۔ اس جنگ کے بعد دونوں ہی ملک حالت جنگ میں تھے اور دونوں ہی ملکوں کے درمیان تعلقات کشیدہ تھے۔ ترکوں کو فوجی اعتبار سے برتری حاصل تھی اس لیے شاہ طہماسپ نے براہ راست ترکوں سے جنگ کرنے کا ارادہ نہیں کیا، بلکہ دوسرے ذرائع اختیار کیے جن سے ترکوں کو نقصان پہنچایا جاسکے۔ جیسے ترکوں کے دشمنوں کی مدد کرنا یا تجارتی راستوں میں رکاوٹ ڈالنا۔ اسی طرح کی وجوہات کی بنیاد پر ترکی کے سلطان سلیمان القانونی نے ایران پر حملہ کر دیا۔ شاہ طہماسپ کو مقابلہ کی طاقت نہیں تھی اس لیے دارالحکومت تبریز کو خالی کر کے قزوین چلے گئے۔ سلیمان القانونی نے ایران کا نظام درست کر کے شاہ طہماسپ کے تعاقب کا ارادہ کیا لیکن بارش کا موسم اور بھاری جنگی ساز و سامان کے نقل و حمل کی دشواریوں کی وجہ سے ان کو یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔

ترکوں کے ساتھ مختلف علاقوں میں ایرانیوں کے اور بھی کئی معرکے ہوئے، خاص طور پر عراق کا معاملہ ہمیشہ جنگ کا موضوع رہا۔ 1553 میں ترکی افواج نے پھر حملہ کر دیا۔ شاہ طہماسپ نے مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا، لیکن ان کو احساس ہوا کہ یہ ایک بے فائدہ جنگ ہوگی اور اس کا نقصان ہی ہوگا اس لیے انہوں نے ترکوں کے ساتھ ایک صلح کر لی جس کو صلح اماسیہ کہا جاتا ہے۔ یہ صلح 1555 میں ہوئی اس صلح کے مطابق عراق اور کچھ دوسرے علاقے ترکی کے ماتحت تسلیم کر لیے گئے اور آرمینیا، آذربائیجان اور گرجستان کا مشرقی علاقہ ایران کے ماتحت اور مغربی علاقہ ترکی کے ماتحت تسلیم کر لیا گیا۔ اس معاہدے میں ایک بات یہ بھی تھی کہ ترکی حکومت ایرانی حاجیوں کی حفاظت کرے گی اور ساتھ ہی ایران نے یہ وعدہ کیا کہ ایران میں خلفائے راشدین پر تبرا نہیں کیا جائے گا وغیرہ۔

دونوں حکومتوں نے بڑی حد تک اس معاہدے کا احترام کیا۔ ایک عرصے تک یہ معاہدہ باقی رہا۔ آپس میں اختلافات نہیں ہوئے، کچھ عرصہ بعد 6 شاہ طہماسپ نے سلیمان القانونی کے دو بیٹوں کے درمیان اختلاف میں ایک کو اپنے یہاں پناہ دی۔ ترکی کی حکومت نے شہزادے کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ شاہ طہماسپ نے شہزادے کی واپسی کی شرط میں سرحد کی تعین میں تبدیلی کروائی۔ یہ ایران کے لیے ایک بڑی کامیابی تھی اور اس کی وجہ سے ایران اور ترکی کے تعلقات ایک مرتبہ پھر بگڑ گئے تاہم ابھی کوئی جنگ نہیں ہوئی تھی۔

14.8 ہمایوں بادشاہ کی مدد

طہماسپ کی زندگی کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ سلطان ظہیر الدین بابر کے بیٹے مرزا ہمایوں جب ہندوستان میں شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر یہاں سے چلے گئے تو انہوں نے آخر میں شاہ طہماسپ کے پاس پناہ لی تھی اور کئی سال کی جدوجہد کے بعد طہماسپ کی مدد لینے میں وہ کامیاب ہو گئے اور طہماسپ نے ایک بڑی فوج ان کے ساتھ کی تاکہ وہ ہندوستان کے اندر اپنی حکومت دوبارہ حاصل کر سکیں۔ ہمایوں نے ایرانی فوج ک مدد سے اپنے کھوئے ہوئے علاقے آہستہ آہستہ حاصل کرنے شروع کیے، سندھ اور ملتان کے علاقوں میں فتح پانے کے بعد انہوں نے دہلی پر بھی قبضہ کر لیا اس کے بعد ہمایوں کا انتقال ہو گیا، لیکن یہ کہہ سکتے ہیں کہ مغل حکومت کو جو دوبارہ زندگی ملی ہے اس میں شاہ

طہماسپ کا بہت اہم کردار ہے۔

طہماسپ نے ایک لمبے عرصے تک حکومت کی، 1524 سے 1576 تک 50 سال سے زیادہ انہوں نے حکومت کی۔ 25 مئی 1576 میں 62 سال کی عمر میں شاہ طہماسپ کی وفات ہو گئی۔

طہماسپ نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ ایران جو اس وقت خانہ جنگی میں مبتلا تھا اس کو ایک جھنڈے تلے جمع کیا۔ ملک کو بیرونی خطرات خاص طور سے ازبکوں اور ترکوں کے خطرات سے محفوظ کیا۔ یہی ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے جارجیا میں کچھ فتوحات بھی حاصل کیں تھیں۔ جارجیا کے علاقے میں انہوں نے کئی قلعے فتح کیے اور بڑی تعداد میں جارجیا کے لوگوں کو اپنی فوج میں بھرتی کیا۔

14.9 شاہ اسماعیل دوم (1576 تا 1577)

شاہ طہماسپ کی وفات کے بعد ان کا بیٹا اسماعیل دوم حکمران ہوا۔ اسماعیل دوم کا زمانہ حکومت بہت مختصر رہا انہوں نے دو سال سے بھی کم حکومت کی۔ وہ شاہ طہماسپ کے بعد 1576 میں بادشاہ بنے۔ شاہ اسماعیل ایک باصلاحیت شہزادے تھے اپنے باپ کے زمانے میں انہوں نے کئی جنگوں میں حصہ لیا اور اپنے ملک کا کامیاب دفاع کیا۔ قزلباش کی جماعت بھی شاہ اسماعیل دوم کے ساتھ تھی اور انہی کی مدد سے ان کو اقتدار بھی ملا تھا، شروع میں قزلباش کے بعض لوگوں نے ان کی مخالفت کی تھی اور ان کے بھائی حیدر علی کو پہلے بادشاہ بنایا اس کے بعد حیدر علی کے مرنے کے بعد ایک اور شہزادے کو بھی بادشاہ بنانے کی کوشش کی لیکن آخری کامیابی اسماعیل دوم کو ملی۔ اسماعیل دوم نے بادشاہ بننے کے بعد کچھ وقت اپنے مخالفوں کو ختم کرنے اور اپنے حامیوں کو اونچے عہدے دینے میں بسر کیا۔ اس کے بعد وہ امور حکومت کی طرف متوجہ ہوئے لیکن مہلت عمر ختم ہو گئی۔ شاہ اسماعیل دوم کے دور کی خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے عثمانیوں کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کیے اور شیعہ مذہب کی بعض چیزوں کو چھوڑ دیا، جس کی وجہ سے قزلباش کے لوگوں کو یہ احساس ہوا کہ یہ کہیں عثمانیوں کی قربت میں شیعہ مسلک کو نہ چھوڑ دیں اس لیے قزلباش ان کے خلاف ہو گئے، اسی درمیان میں ان کی وفات ہو گئی۔ شاہ اسماعیل کی وفات کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ زہر خورانی سے ان کی وفات ہوئی تھی اور اس کے پیچھے قزلباش کا ہاتھ تھا۔ کچھ مورخین نے شاہ عباس کی بہن پری خانم کو بھی اس میں شامل بتایا ہے۔

14.10 محمد خدابندہ (1578 تا 1587)

شاہ طہماسپ کے بڑے بیٹے محمد خدابندہ تھے، لیکن محمد خدابندہ کو کچھ بیماری تھی جس کی وجہ سے ان کو واضح طور پر نظر نہیں آتا تھا۔ ان کا جسم بھی پورا سفید تھا اور ایرانی روایات کے مطابق کسی عیب دار شخص کو بادشاہ نہیں بنایا جا سکتا تھا، اسی لیے شروع میں محمد خدابندہ کا نام کسی نے بھی بادشاہت کے لیے قبول نہیں کیا، لیکن اسماعیل، حیدر اور دوسرے بھائیوں کے مرنے کے بعد طہماسپ کی اولاد میں یہ اکیلے زندہ بچے تھے، اس لیے پری خانم جو ان کی بہن تھی ان کی مدد سے ان کو بادشاہ بنا دیا گیا۔ پری خانم کی مرضی کے کے بعد قزلباش نے بھی ان

کو پسند کر لیا اور اس طرح سے محمد خدا بندہ ایران کے بادشاہ بن گئے۔ قزلباش پوری طرح پری خانم کے ماتحت رہے چوں کہ خدا بندہ کو بادشاہ بنانے میں پورا کردار پری خانم کا تھا اس لیے ان کو توقع تھی کہ وہ بھی ان کے تابع فرمان رہیں گے۔ اس وقت خدا بندہ قزوین میں نہیں تھے بادشاہ بننے کے تقریباً دو مہینے کے بعد محمد خدا بندہ اور ان کی بیوی جن کا نام خیر النسا تھا اور ان کا لقب مہد علیا تھا وہ قزوین میں آئے۔

محمد خدا بندہ چوں کہ معذور تھے اس لیے مہد علیا اپنے شوہر کی آڑ میں خود بھی حکومت کرنے کا خیال رکھتی تھیں۔ قزوین آنے کے بعد انہوں نے اس کے لیے کوشش بھی شروع کی، دوسری طرف پری خانم کی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ اپنے معذور بھائی کی آڑ میں خود حکومت کرے۔ وہ بھی اسی کوشش میں تھی۔ اس وجہ سے دونوں کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ ان اختلافات میں قزلباش پری خانم کے ساتھ ہو گئے اور فوج نے مہد علیا کی فرماں برداری شروع کر دی۔ فوج اس وقت زیادہ صاحب اختیار تھی اس لیے زیادہ احکام مہد علیا کے مانے جاتے تھے۔ قزلباش کے سرداروں نے مہد علیا کے ان بڑھتے ہوئے اختیارات کو دیکھ کر محمد خدا بندہ سے درخواست کی کہ ان کے اختیارات محدود کیے جائیں اور ان کو حکومت میں دخل دینے سے روکا جائے، لیکن محمد خدا بندہ اس کے لیے تیار نہیں ہوئے جس کی وجہ سے قزلباش کا ایک بڑا حصہ ان سے ناراض ہو گیا اور وہ بدستور پری خانم کے زیر فرمان رہا اور اس طرح محل کے اندر دو طاقت کے مرکز بن گئے ایک پری خانم دوسری مہد علیا، لیکن قزلباش بھی بہت طاقتور تھے اور انہوں نے آہستہ آہستہ ایسے حالات پیدا کر دیے کہ مہد علیا پر ایک الزام لگا کر ان کو قتل کروا دیا اس طرح پری خانم کے لیے راستہ ایک مرتبہ پھر صاف ہو گیا۔

محمد خدا بندہ کا دور ایران کے لیے بہت خوش آئند نہیں رہا، کیونکہ وہ خود بھی بہت کمزور اور معذور تھے اور آپس کے اختلافات نے مجموعی طور پر ملک کی سالمیت کو خطرے میں ڈالا اس کا فائدہ ایران کے دشمنوں نے اٹھایا۔ ایران کے دو بڑے دشمن تھے ایک ازبک اور دوسرے عثمانی۔ ان دونوں نے اس موقع کا فائدہ اٹھایا اور انہوں نے ایران کے مختلف حصوں پر قبضہ کر لیا۔

ازبک فوج نے جب خراسان پر حملہ کیا تو اس وقت ان کا مقابلہ استلجو قبیلے کے قزل باش کے ایک سردار مرشد قلی خاں کر رہے تھے۔ چوں کہ اس وقت ایران کی ساری فوج ان کے قبضہ اختیار میں تھی، اس لیے مرشد قلی خاں نے اس کو موقع غنیمت جانا اور انہوں نے بادشاہی کی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر محمد خداوند کے بیٹے عباس مرزا کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس طرح سے محمد خدا بندہ کی حکومت ختم ہو گئی اور ان کی زندگی میں ہی عباس مرزا بادشاہ بن گئے۔ بعد میں محمد خدا بندہ کو جیل میں ڈال دیا گیا جہاں چند سال مزید زندہ رہے اور پھر ان کا انتقال ہو گیا۔

14.11 شاہ عباس اعظم (1587 تا 1629)

صفوی عہد میں ایران کی تاریخ کا سب سے طاقتور حکمران شاہ عباس ہے جو بعد میں عباس اعظم کے نام سے مشہور ہوئے۔ جس وقت شاہ عباس نے اقتدار سنبھالا اس وقت ایران کی حالت بہت کمزور تھی، ایران کے دو طرف یعنی مشرق میں ازبک اور شمال میں عثمانی دو بڑی طاقتیں تھی جو لگاتار ایران پر حملے کر رہی تھی، جن سے ایران کو خطرہ تھا، اس کے علاوہ اندرونی طور پر بھی اس وقت ایران میں بڑے

مسائل تھے، خاص طور سے قزلباش زیادہ حاوی ہو گئے تھے اور عملاً حکومت انھی کے قبضے میں چل رہی تھی۔ شاہ عباس کو حکمراں بننے کے بعد سب سے زیادہ اسی خطرے کا مقابلہ کرنا تھا۔ اس لیے انہوں نے حکمراں بننے کے بعد پوری حکومت کو منظم کیا۔ انہوں نے فوج کی نئے انداز میں ترتیب بنائی جس طرح ترکوں نے ایک فوج بنائی تھی جس کا نام ینی چری تھا اسی کی نقل کرتے ہوئے شاہ عباس نے بھی اسی انداز کی ایک فوج بنائی جس کو پوری طرح مرکز کے تحت رکھا اور اس کا نام رکھا 'شاہ سون' یعنی بادشاہ کے دوست یہ بڑی فوج تھی اور مکمل طور پر بادشاہ کے ماتحت تھی۔ اس فوج کا سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوا کہ قزلباش کے غلبے سے شاہ عباس کو آزادی مل گئی۔ قزلباش ترک قبائل تھے، ان میں سے سب کی اصل وفاداری اپنے قبیلے کے لیے ہوتی تھی۔ جس کی وجہ سے ان کے آپس کے اختلافات ہمیشہ ہوتے رہتے تھے۔ ان کے مقابلے میں شاہ سون کے اندر جتنے بھی فوجی تھے وہ زیادہ تر دوسرے علاقوں کے غلام تھے یا نو مسلم تھے ان کی وفاداریاں پوری کی پوری بادشاہ کے ساتھ تھی۔ اس سے شاہ عباس کے اقتدار میں بڑا زبردست اضافہ ہوا اور آہستہ آہستہ شاہ عباس نے شاہ سون کو زیادہ ترقی دی اور زیادہ تر عہدے انہی کے ہاتھ میں آ گئے جس کی وجہ سے قزلباش کمزور ہو گئے۔ شاہ سون کے ایک سردار اللہ وردی خان کو شاہ عباس نے بہت بڑا عہدہ دیا اور اس کے بعد مزید اسی طرح کی فوج وہ بھرتی کرنے لگے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا شاہ عباس کے لیے دو بڑے خطرے تھے ایک ازبکوں کی طرف سے دوسرا عثمانیوں کی طرف سے۔ شاہ عباس نے سب سے پہلے یہ کیا کہ کافی دب کر عثمانیوں کے ساتھ ایک صلح کر لی اور اس میں کردستان، آذربائیجان اور گرجستان جیسے کئی علاقے ترکوں کے مقبوضات تسلیم کر لیے تاکہ ترکوں کی طرف سے خطرہ کم ہو جائے اس کے بعد شاہ سون کی مدد سے اندرونی بغاوتوں کا خاتمہ کیا۔

شاہ عباس نے ایک اہم کام یہ کیا کہ ایران کے پاس توپ خانہ نہیں تھا، شاہ عباس نے 12 ہزار توپچی اور 500 توپوں پر مشتمل ایک توپ خانہ بنایا اس کے علاوہ اپنی فوج کو اور مزید مضبوط کرنے کے لیے دو برطانوی فوجی رابرٹ شرلے اور انتھونی شرلے کو اپنے ساتھ شامل کر لیا اور ان کی نگرانی میں توپ خانہ تیار کروایا۔ ان تیاریوں کے بعد شاہ عباس نے ازبکوں کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا۔ اتفاق سے اس وقت ازبکوں کا بڑا سردار عبداللہ خاں فوت ہو چکا تھا اور عبداللہ خان کے بعد ملک میں خانہ جنگی چل رہی تھی۔ شاہ عباس کو اس کا بھی فائدہ ہوا اور شاہ عباس نے ازبکوں کو ایسی زبردست شکست دی کہ پھر وہ ایک لمبے عرصے تک صفویوں کے مقابلے میں کھڑے نہ ہو سکے۔ شاہ عباس نے کافی علاقے واپس لے لیے تھے اور ازبکوں کو شکست بھی ہو گئی تھی، لیکن خان باقی محمد خان نے بعد میں بلخ پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور باقی محمد خان کے مقابلے میں شاہ عباس کو ایک طرح کی ہار کا سامنا کرنا پڑا لیکن اسی درمیان میں شاہ عباس نے ترکوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی اور وہ علاقے جو ترکوں کو دیے تھے اور ایک معاہدے کے تحت ان پر ترکوں کے قبضے میں تسلیم کر لیے گئے تھے۔ ان علاقوں کو شاہ عباس نے واپس لے لیا، اس کے علاوہ بحرین پر قبضہ کر لیا اور شروان کے علاقے پر بھی قبضہ کر لیا اسی طرح سے جزیرہ ہرمز جس کے اوپر پرتگالیوں کا قبضہ چلا آ رہا تھا انگریزوں کی مدد سے اس کو بھی آزاد کر لیا اور پرتگالیوں کو ہرا دیا۔ بعد میں ہرمز بندرگاہ کا نام بندر عباس رکھ دیا گیا جو آج تک اسی نام سے موسوم ہے۔

1602 میں شاہ عباس نے عثمانیوں پر حملہ کر کے تبریز، عراق اور بغداد کے علاقے واپس لے لیے اس طرح سے شاہ عباس نے ایران کو دوبارہ مضبوط کر دیا۔ شاہ عباس نے اپنا دارالحکومت اصفہان کو بنایا اور اصفہان کو بہت ترقی دی تعمیر کے لحاظ سے بھی اس کو ترقی دی

اور علم و ادب و فنون لطیفہ کا اس کو مرکز بنادیا۔ شاہ عباس کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ انہوں نے دنیا بھر کے مختلف ممالک کے ساتھ سفارتی تعلقات استوار کیے، روس کے ساتھ، یورپین ممالک کے ساتھ بھی اچھے تعلقات استوار کیے، البتہ ہندوستان کے ساتھ ان کے تعلقات اس دور میں خراب ہو گئے، چوں کہ شاہ عباس نے قندھار پر، جو ہندستان کا حصہ تھا قبضہ کر لیا، شاہ عباس قندھار کو ایران کا حصہ مانتے تھے جبکہ مغل بادشاہ اس کو ہندوستان کا حصہ مانتے تھے اور اس کے نام پر کئی جنگیں بھی ہوئیں۔ قندھار کے نام ایران اور ہندستان کے درمیان کئی جنگیں ہوئیں اس سلسلے کی آخری جنگ شاہ جہاں کے زمانے میں ہوئی اور اس میں یہ تقریباً طے ہو گیا کہ اب قندھار ہندوستان کا حصہ نہیں رہے گا۔

شاہ عباس اعظم اپنے عہد کے ایک نامور حکمران تھے، بہت بڑے فاتح تھے اور ایران کے معمار تھے۔ ایران کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس کے ساتھ وہ مزاج کے بہت سخت اور کسی قدر شکی تھے۔ انہوں نے اپنے کئی بیٹوں کو بھی بغاوت کے شک میں یا تو قتل کر دیا یا کوئی بڑی سزا دی۔ اس لیے جس وقت شاہ عباس کا انتقال ہوا اس وقت ان کے بیٹوں میں کوئی ایسا نہیں تھا جو ان کی جانشینی کرتا اس لیے ان کے پوتے سلیمان مرزا ان کے بعد شاہ صفی کے نام سے تخت نشین ہوئے۔

14.12 شاہ صفی (1629 تا 1642)

شاہ صفی کا دور ایران کے لیے بہت خوش آئند دور ثابت نہیں ہوا۔ شاہ صفی کے مزاج میں سفاکیت اور بے اعتباری بہت زیادہ تھی چناں چہ انہوں نے اپنے بہت عزیز و اقارب کو اور بعض اہم درباری امراء کو اس لیے قتل کرا دیا کہ کہیں وہ حکومت کے لیے خطرہ نہ بن جائیں۔ شاہ صفی نے کئی بڑے عہدہ داروں کو بھی قتل کروا دیا اسی کے ساتھ شاہ صفی کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ زیادہ وقت اپنے گھر کے اندر مسخروں اور عورتوں کے درمیان میں رہتے تھے۔ اس کی وجہ سے حکومت کی طرف ان کی توجہ کم تھی اور عیش و عشرت کی طرف توجہ زیادہ مائل ہو گئی تھی تو اس کی وجہ سے وہ بہت اچھی حکومت نہیں کر پائے اس کی وجہ سے ایک تو قندھار کا علاقہ ان سے چھن گیا۔ وہاں کے لوگوں نے بغاوت کر دی اور وہ ایرانی اثرات سے آزاد ہو گیے۔ دوسرا بڑا نقصان یہ ہوا کہ بغداد پر دوبارہ عثمانی ترکوں کا قبضہ ہو گیا۔ انہوں نے کئی محاذوں پر ایرانی افواج کو شکست دی جس سے ایرانی فوج کا حوصلہ بھی ٹوٹ گیا۔

شاہ صفی کو مختلف ایسی عادتیں بھی تھی جن کی وجہ سے وہ حکومت کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے اور اکثر نشے میں رہنے لگے اسی حالت میں 12 مئی 1642 کو ان کی وفات ہو گئی اور قم میں ان کی تدفین ہوئی۔

14.13 شاہ عباس دوم (1642 تا 1666)

شاہ صفی کی وفات کے بعد ان کا بیٹا شاہ عباس ثانی 9 سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے۔ شاہ عباس دوم کے اندر غیر معمولی صلاحیتیں تھی انہوں نے بہت اچھا انتظام چلایا، عدل و انصاف کے تقاضے پورے کیے، رعایا کے ساتھ اچھا سلوک کیا، بہت سارے ٹیکس کم کر دیے، شراب پر پابندی لگا دی اور بھی عوامی فلاح و اصلاح کے بہت سارے اچھے کام کیے، لیکن یہ شروع کا زمانہ تھا بعد میں حالات میں تبدیلی آئی

اور ایران کے درباری امراء ان پر غالب آگئے اور انہوں نے بادشاہ کی اصلاحات کا خیر مقدم نہیں کیا اور ان کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کیں۔ البتہ شاہ عباش کے زمانے میں کئی اہم واقعات اور پیش ہوئے۔ ایک مسئلہ تو قندھار کا مسئلہ تھا قندھار کو شاہ عباس اول نے مغلوں سے چھین کے ہمیشہ کے لیے ایران کا حصہ بنا دیا تھا لیکن بعد میں شاہ عباس دوم کے زمانے میں کچھ ایسے حالات ہو گئے کہ قندھار اور افغانستان کے لوگوں کے درمیان جو اطمینان کی فضا تھی وہ مکدر ہو گئی آپس میں اختلافات بڑھ گئے اور آخر افغانستان الگ ملک بن گیا اور اس کے بعد پھر وہ ایک الگ ملک کی حیثیت سے موجود ہے۔ یہ بڑا مسئلہ ان کے زمانے میں ہی ہوا۔ 34 سال کی عمر میں 22 اپریل 1666 میں خسر اباد میں انتقال ہوا اور قم میں ان کی تدفین ہوئی۔

14.14 شاہ سلیمان (1666 تا 1694)

شاہ عباس دوم کی وفات کے بعد شاہ سلیمان ان کے جانشین بنے۔ ان کی تاجپوشی کے وقت ان کو شاہ صفی دوم کا لقب دیا گیا۔ شاہ صفی دوم بھی شاہ صفی اول کی طرح تھے ان کے پاس بہت زیادہ اختیارات بھی نہیں تھے۔ درباری امراء6 اس وقت بہت طاقت ور تھے اس لیے شاہ صفی کے سامنے میدان عمل بھی زیادہ نہیں تھا اس لیے وہ شاہی ذمہ داریوں میں زیادہ مصروف نہیں ہوئے، بلکہ عیش و عشرت میں اور سیر و تفریح کے کاموں میں لگ گئے، اس کی وجہ سے پہلے سے ہی تباہ شدہ ملک مزید تباہی کی طرف چلا گیا اور صفوی اقتدار پر خطرے کے بادل منڈلانے لگے۔

29 مارچ 1694 میں شاہ صفی دوم کی وفات ہو گئی۔

14.15 شاہ حسین (1694 تا 1722)

شاہ سلیمان یعنی شاہ صفی دوم کے بعد ان کا بیٹا شاہ حسین تخت نشین ہوا۔ شاہ حسین بڑے مذہبی قسم کے انسان تھے ان کے دور میں علماء کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا۔ شاہ حسین کے زمانے میں ایران کے حالات سیاسی طور پر بہت خراب ہوئے۔ ایک طرف آذربایجان اور شروان میں جنگ ہوئی دوسری طرف روس نے ایران پر حملہ کرکے ایران کے شمالی حصوں پر قبضہ کر لیا اس کے بعد روس کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ ہوا۔ لیکن جن علاقوں پر روس نے قبضہ کیا تھا وہ اسی کے پاس رہے۔ جو ایران کے لیے ایک بڑا نقصان ہوا۔

ایران کے ایک صوبہ کرمان میں بھی اس دور میں بڑے پیمانے پر بغاوت ہوئی۔ گورگین خان کو شاہ حسین نے اس بغاوت کو فرو کرنے کی ذمہ داری دی اور ساتھ ہی قندھار کا امیر مقرر کیا، لیکن قندھار میں ایک بڑا مسئلہ یہ پیدا ہو گیا کہ افغانوں نے بھی ایران کے خلاف بغاوت کر دی اور یہ بغاوت کامیاب ہو گئی اور میرویس نے ایران سے افغانستان کو آزاد کرا لیا اس طرح قندھار بھی شاہ حسین کے زمانے میں ایران سے آزاد ہو گیا۔

افغانوں کے ساتھ اس مقابلے کا دوسرا نقصان یہ ہوا کہ افغانوں نے ایران پر حملہ کر دیا اور اصفہان پر قبضہ کر لیا اس طرح افغانی عملاً ایران کے حکمراں ہو گئے۔ ویسے انہوں نے صفوی حکومت کا خاتمہ نہیں کیا، بلکہ ایرانی حاکم کو بدستور باقی رکھا، لیکن 1715 میں

میر ویس کی وفات ہو گئی اور اس کے بعد ان کا بیٹا سلطان محمود ہو دک ان کا جانشین بنا۔ سلطان محمود نے شاہ حسین کو تخت سے بے دخل کر دیا اور بعد میں شاہ حسین کے خاندان کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ شاہ حسین نے اس کی مخالفت کی اور مقابلہ کیا اس میں وہ زخمی ہو گئے اور 1725 میں اسی حالت میں ان کی وفات ہو گئی۔

14.16 شاہ طہماسپ دوم (1722 تا 1732)

اصفہان پر افغانیوں کے قبضے کے بعد طہماسپ جان بچا کر نکل گئے اور قزوین میں جا کر اپنے آدمیوں کو جمع کیا اور 1722 میں وہاں اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔ اس زمانے میں روس کے ساتھ ایران کی جنگ چل رہی تھی۔ شاہ طہماسپ نے روس کے ساتھ مصالحت کر لی اور جنگ ختم ہو گئی۔ اس کے بعد طہماسپ نے ایران کو ایک مرتبہ پھر متحد کرنے کی کوشش کی اور چند سال کی کوششوں سے اس میں ایک حد تک کامیاب بھی ہو گئے۔ نادر شاہ درانی ان کی فوج کا سپہ سالار بنا تو اس نے افغانوں کے خلاف بھی کامیاب جنگ کی اور اصفہان کو بھی آزاد کرالیا، لیکن انہوں نے 1731 میں عثمانیوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی اس میں ان کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور نادر شاہ نے ان کو تخت سے بے دخل کر دیا۔

14.17 شاہ عباس سوم 1732 تا 1736

طہماسپ کے تخت سے بے دخل کرنے کے بعد نادر شاہ نے طہماسپ کے بیٹے کو شاہ عباس سوم کے نام سے تخت نشین کیا۔ جب نادر شاہ ھندستان ن کی طرف آیا تو اپنے بیٹے رضا قلی خاں کو اپنا نایب بنایا۔ رضا قلی خاں کچھ عرصے بعد شاہ عباس کو قید کر دیا اور اپنی حکومت کے قیام کی کوشش شروع کی غالبا اس کو خبر ملی تھی کہ نادر شاہ کی وفات ہو گئی، لیکن اسی درمیان میں 1736 میں نادر شاہ واپس ایران آ گیا اور اس نے صفوی حکومت کا خاتمہ کر کے اپنی حکومت قائم کر لی۔

نادر شاہ کے مرنے کے بعد صفوی خاندان نے ایک مرتبہ پھر جمعیت فراہم کی اور ایران پر دوبارہ حکومت قائم کرنے کی کوشش کی لیکن پھر کامیاب نہیں ہوئے۔

اس طرح کم و بیش دو صدیوں تک ایران پر حکومت کر کے صفوی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

14.18 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- صفوی حکومت کے تحت ایران کو یک جہتی ملی اور مکمل ملک کی حیثیت حاصل ہوئی۔
- صفوی حکمرانوں کے ذریعے ایران کی شناخت ایک شیعہ ملک کی بن گئی۔
- شاہ اسماعیل نے ایک صوفی سلسلے کو تبدیل کر کے ایک عظیم الشان حکومت میں بدل دیا۔

- شاہ عباس کے زمانے میں ایران کی جدید کاری ہوئی اور وہ علاقے کی ایک بڑی طاقت بن گیا۔
- نادر شاہ نے ایران کی صفوی حکومت کو اتنا کمزور کر دیا کہ وہ آخر ختم ہو گئی۔

14.19 نمونہ امتحانی سوالات

14.19.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. صفوی سلسلہ کس آدمی کے نام پر ہے؟

(a). شاہ صفی اول　(b). صفی الدین اردبیلی　(c). صفی الدین گارزونی　(d). شاہ صفی دوم

2. صفوی حکومت کا بانی کون ہے؟

(a). شاہ عباس اعظم　(b). شاہ اسماعیل　(c). شاہ طہماسپ　(d). سلطان سلیم

3. چالدران کی جنگ کس کے ساتھ ہوئی؟

(a). شیبانی خان　(b). عبید اللہ خاں　(c). سلطان سلیم　(d). سلطان سلیمان

4. صفوی حکومت کا آخری دارالحکومت کیا تھا؟

(a). قزوین　(b). اصفہان　(c). تبریز　(d). قندھار

5. شاہ عباس اعظم نے کس یورپی ملک کے لوگوں کو توپ خانہ کی ذمہ داری دی؟

(a). فرانس　(b). اٹلی　(c). برطانیہ　(d). جرمنی

6. پری خانم کس کی بیٹی تھیں؟

(a). شاہ طہماسپ　(b). محمد خدابندہ　(c). شاہ اسماعیل　(d). شیخ صفی الدین

7. قزلباش کا مطلب ہے؟

(a). لال کرتا　(b). لال ٹوپی　(c). لال رومال　(d). لال جھنڈا

8. شاہ عباس اعظم کی والدہ کا نام تھا؟

(a). زیب النسا　(b). نور النسا　(c). خیر النسا　(d). ست النسا

9. شاہ عباس نے جو فون بنائی تھی اس کا کیا نام تھا؟

(a). ینی چری　(b). قزلباش　(c). ازبک　(d). شاہ سون

10. نادر شاہ درانی کس بادشاہ کا ملازم تھے؟

(a). شاہ اسماعیل (b). شاہ صفی (c). شاہ عباس (d). شاہ طہماسپ

14.19.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. صفوی حکومت کے قیام میں شاہ اسماعیل کی خدمات بیان کیجیے۔
2. ایران میں شیعہ مذہب کا فروغ کیسے ہوا۔
3. قندھار کے تنازعہ پر نوٹ لکھیں۔
4. چالدران جنگ کیوں ہوئی اور صفوی حکومت کی تاریخ میں اس کی کیا اہمیت ہے۔
5. صلح آماسیہ کس کے درمیان ہوئی اور اس کا کیا فائدہ ہوا۔

14.19.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. صفوی صوفی سلسلہ ایک حکومت کے اندر کیسے تبدیل ہوا؟ تفصیل سے لکھیے۔
2. شاہ عباس اعظم نے حکومت میں کیا تبدیلیاں کیں اور ان کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔
3. قزلباش پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

14.20 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. الدکتور محمد سہیل طقوش: تاریخ الدولۃ الصفویۃ
2. ثروت صولت: ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ
3. دائرۃ المعارف الاسلامیہ
4. The New Cambdrige History of Islam vol.3
5. مرزا محمد معصوم: تاریخ سلاطین صفویہ

اکائی 15: صفوی حکومت میں تمدنی اور مذہبی حالات

اکائی کے اجزا:

15.0 تمہید
15.1 مقاصد
15.2 صفوی عہد کے تمدنی حالات
15.0 صفوی عہد میں حکومت کی تنظیم
15.1 عورتوں کی حیثیت
15.2 قالین سازی
15.3 برتن سازی
15.4 دیگر فنون
15.5 علم وادب
15.6 ایران کی مذہبی صورت حال
15.7 ایران میں صفوی حکومت کا آغاز اور شیعہ مذہب کی اشاعت
15.8 شیعہ قاضیوں کا تقرر
15.9 موذنین اور خطباء کا تقرر
15.10 قزلباش کا کردار
15.11 قزلباش کی طاقت
15.12 صحابہ کرام پر تبرا کی رسم
15.13 ایران کے دیگر مذاہب
15.3 خلاصہ

15.4 اکتسابی نتائج

15.5 نمونہ امتحانی سوالات

15.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

15.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

15.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

15.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

15.0 تمہید

صفوی عہد میں ایران کا اسلامی ایرانی تمدن اپنے نقطہ عروج کو پہنچا۔ اسی دور میں یہاں علم وادب اور حکمت و دانش کی ایک نئی طرح ڈالی گئی۔ صفوی حکمرانوں نے ایران کے اندر ایک نئے تمدنی دور کا آغاز کیا۔ اس کے علاوہ مختلف علوم فنون میں بھی اس دور میں اہم اضافہ ہوئے۔ ان صفحات میں صفوی دور کی ان خدمات کا مطالعہ کیا جائے گا۔

15.1 مقاصد

اس یونٹ کو پڑھ کر طلبہ کو معلوم ہو گا کہ ایران میں صفوی عہد کا تمدن کیا تھا۔ سماج اور حکومت کا نظام کیسے چلتا تھا، کیا کیا عہدے تھے۔ ایران کے اندر علوم وفنون میں کیا ترقی ہوئی اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو گا کہ صفوی حکومت سے قبل ایران کی مذہبی صورت حال کیا تھی، صفوی حکومت کے دوران ایران کے اندر کس طرح شیعہ اثنا عشری مذہب پھیلا، اس کام کے لیے حکومت نے کیا طریقے اختیار کیے اور اس وقت ایران کے اندر دوسرے مذاہب کون کون سے تھے۔

15.2 صفوی عہد کے تمدنی حالات

صفوی عہد میں ایران کا معاشرہ تکثیری معاشرہ تھا۔ مختلف مذاہب، زبانوں اور نسلوں کے لوگ وہاں رہتے تھے، اگرچہ مجموعی طور پر فارسی زبان کا چلن تھا، تاہم ترکی کا استعمال بھی خوب تھا، خود شاہ اسماعیل کی زبان فارسی نہیں تھی، بلکہ وہ ازبک زبان بولتے تھے۔ صفوی حکومت کے قیام کے ساتھ ایران میں قزلباشوں کا اثر ورسوخ بڑھ گیا۔ قزلباش بنیادی طور پر درج ذیل آٹھ قبائل کے لوگ تھے:

روملو: صفوی سلسلے کے قدیم ترین مرید تھے قزلباش میں عام طور پر اسی قبیلے کے لوگ تھے یہ ایک ترک قبیلہ ہے۔

شاملو: یہ بھی ترکمانی قبیلہ ہے، عام طور پر شام، حلب، طرطوس وغیرہ میں آباد ہیں۔

استالجو: ترکمان قبیلہ ہے آذربائیجان اور آرمینیا میں آباد تھے۔ اس قبیلے کے بہت سے لوگ ایران کے اندر اعلی سیاسی عہدوں پر فائز رہے۔

تکلو: ایشیا کوچک اور قونیہ کے اطراف میں آباد ترکمانی قبیلہ ہے۔ شاہ اسماعیل کے والد حیدر کے زمانے سے یہ لوگ صفوی سلسلے سے وابستہ ہو گئے تھے اور آخر تک وابستہ رہے۔

ذوالقدر: یہ بھی ترکمانی قبیلہ ہے مرعش، بستان اور دیار بکر میں رہتے تھے۔ شیخ جنید کے زمانے سے سلسلہ صفویہ سے وابستہ ہوئے۔

افشار: یہ قبیلہ بھی ترک ہے۔ منگول حملے میں اس قبیلے نے اپنے وطن سے ہجرت کر کے آذربائیجان، قزوین اور تہران وغیرہ میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ نادر شاہ درانی اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔

قاچار: ترک قبیلہ ہے۔ وسط ایشیا سے ہجرت کر کے ایران کے مختلف علاقوں میں آباد ہوا۔ صفویوں کے بعد اسی قبیلے کے لوگوں نے ایران پر حکومت کی۔

ورساق: ایشیا کوچک کا ترک قبیلہ ہے۔ شاہ اسماعیل کی مدد کے لیے ہجرت کر کے آذربائیجان کے علاقے میں آباد ہوئے۔

قزلباش میں عام طور پر یہی قبائل تھے۔ ان قبائل کے علاوہ اور بھی خاندان اور قبیلے تھے جو شاہ اسماعیل کے ساتھ شامل ہوئے اور بعد میں صفوی حکومت کا حصہ بنے۔ اس طرح یہ حکومت یعنی صفوی حکومت مختلف رنگوں، نسلوں اور زبانوں کے امتزاج سے بنی تھی۔ اس حکومت نے ایران کے اندر ایک نئے تمدنی دور کا آغاز کیا۔ اگرچہ ایران کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ ایرانی تہذیب دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک ہے، لیکن ساسانی دور کے خاتمے کے بعد ایران میں کوئی منضبط حکومت قائم نہیں ہو سکی تھی۔ شاہ اسماعیل نے سب سے پہلے ایران کو متحد کیا اور ایران کے اندر مختلف قوموں سے ملا کر ایک عظیم حکومت قائم کی۔ اس حکومت کی سرحدیں بدلتی رہیں، لیکن مجموعی طور پر آج ایران وہی ہے جو شاہ اسماعیل کے زمانے میں قائم ہوا تھا۔

شاہ اسماعیل کے بعد ایران کی تہذیب و تمدن میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ یہاں بے شمار علماء و فضلاء باہر سے ہجرت کر کے آئے اور کئی بڑے فلسفی ایران میں بھی پیدا ہوئے خاص طور پر ملا صدرا، میر باقر داماد وغیرہ نے ایران کی علمی تاریخ کو ایک نیا رخ عطا کیا۔

صفوی عہد میں ایران کے اندر کئی نئے شہر بسائے گئے اور پرانے شہروں کو ترقی دی گئی۔ صفوی عہد میں مختلف حالات کی وجہ سے تین مرتبہ دارالحکومت تبدیل ہوا۔ سب سے پہلے تبریز کو دارالحکومت بنایا گیا، پھر قزوین کو اور پھر آخر میں اصفہان کو دارالحکومت بنایا گیا۔ اصفہان میں صفوی دور کی شاندار عمارتیں ابھی تک موجود ہیں۔ اصفہان وہی شہر ہے جس کو نصف جہان کہا جاتا ہے۔

صفوی دور میں غیر ممالک کے ساتھ بھی ایران کے پائیدار روابط قائم ہوئے۔ خاص طور پر روس اور برطانیہ کے ساتھ ان کے تعلقات مساویانہ بنیادوں پر تھے۔ برطانیہ کے رابرٹ شرلے اور انتھونی شرلے کو شاہ عباس نے اپنی فوجوں کی تربیت اور توپ خانہ کے لیے ملازم رکھا۔ ان کی مدد سے انھوں نے پرتگالیوں کے خلاف جنگ کر کے ان کو ایرانی سواحل سے دور کر دیا اور بندر ہرمز کو فتح کر کے اس کا نام

بندر عباس رکھ دیا جو آج بھی اسی نام سے جانی جاتی ہے۔

15.0 صفوی عہد میں حکومت کی تنظیم

صفوی عہد میں حکومت کی تنظیم اس طرح کی گئی کہ بادشاہ کو دین و دنیا کا بادشاہ تسلیم کیا گیا۔ ان کے اختیارات غیر محدود تھے۔ درجے میں وہ امام زمان کے نائب تھے اور صوفی سلسلے کے درویش اور مرشد بھی تھے۔ لوگوں کو ان سے ایسی عقیدت تھی کہ ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے دور دراز سے سفر کر کے لوگ آتے تھے۔ ان سے مصافحہ کرنے یا ان کے کپڑوں کو چھونے کے لیے بھیڑ امڑ پڑتی تھی۔ ابتدا میں صفوی حکومت کی فوجی طاقت قزلباش تھے جو ترکمانی قبائل پر مشتمل تھے۔ بعد میں باضابطہ فوج بھی بھرتی کی گئی اور شاہ عباس کے زمانے میں عام فوج کے علاوہ 'شاہ سون' کے نام سے ایک منفرد فوج بنائی گئی جو ترکوں کی ینی چری فوج کی طرح تھی یہ فوج خاص بادشاہ کے ماتحت رہتی تھی۔ بادشاہ کے بعد بہت سے عہدے تھے جن کے ذریعے وہاں کا نظام چلایا جاتا تھا ان میں سے چند اہم درج ذیل ہیں:

1. وکیل

صفوی دور میں وکیل کا عہدہ سب سے اہم ہوتا تھا اس عہدے کا پورا نام 'وکیل نفس نفیس ہمایوں' تھا۔ بادشاہ کے بعد یہ سب سے اعلی عہدہ مانا جاتا تھا۔ وکیل دینی اور دنیاوی دونوں اعتبار سے بادشاہ کی نیابت کرتا تھا۔ شاہ اسماعیل کے زمانے سے یہ سلسلہ شروع ہوا اور سب سے پہلے حسین بک شاملو کو اس عہدے پر سرفراز کیا گیا۔

2. امیر الامراء

امیر الامراء کا عہدہ بھی صفوی عہد کا ایک اہم ترین عہدہ تھا۔ یہ عہدہ قزلباش کے سردار کا ہوتا تھا۔ اتفاق سے پہلا امیر الامراء اور وکیل ایک ہی شخص کو متعین کیا گیا تھا۔ بعد میں امیر الامراء کا عہدہ الگ کر دیا گیا۔ صفوی عہد میں اس عہدے کی بڑی اہمیت تھی درباری سیاست میں اس عہدے پر فائز لوگوں کی بڑی اہمیت ہوا کرتی تھی بعد میں امیر الامراء کو الوکیل العسکری بھی کہا جانے لگا۔

3. قورچی باشی

قورچی باشی ترکمانی قبائل کے شہسواروں کا سردار ہوتا تھا۔ صفوی دور میں اس عہدے کی بڑی اہمیت تھی اس لیے کہ جنگوں میں عام طور پر اسی کے فیصلے مانے جاتے تھے اور انہی کے دم سے ان کی فوجی طاقت قائم تھی۔ یہ عہدہ امیر الامراء سے الگ تھا تاہم اس کی اہمیت امیر سے کم تھی یہ صرف میدان جنگ میں، ہتھیاروں میں اور آلات حرب میں آزادانہ فیصلہ لینے کا اختیار رکھتے تھے۔

4. وزیر

وزیر کا عہدہ صفوی عہد میں اتفاق سے شروع ہوا تھا۔ دراصل آق قوینلو کے ایک امیر زکریا التبریزی جو آق قوینلو کے وزیر تھے وہ شاہ اسماعیل سے مل گئے اور ان کی مدد سے شاہ اسماعیل کو فتح حاصل ہوئی۔ شاہ اسماعیل نے ان کا وزیر کا لقب باقی رکھا اور ان کے بعد اس عہدے کو بھی مستقل عہدہ بنا دیا جو یومیہ کاموں میں شاہ کی مدد کے لیے مقرر کیا جاتا تھا۔ بعض اوقات ایک ہی دور میں ایک سے زائد وزیر

بھی مقرر کیے جاتے تھے۔ شروع میں وزارت کا یہ عہدہ وکیل اور امیر الامراء سے کم تھا لیکن طہماسپ کے بعد اس عہدے کو زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی اور اس کے لیے لفظ بھی وزیر المستقل یا وزیر الکبیر کا استعمال ہونے لگا۔ ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ وزیر عام طور پر غیر قزلباش ہوا کرتے تھے۔

5. صدر

صدر کا عہدہ صفوی عہد میں دینی اہمیت کا حامل تھا۔ صفوی حکومت کے قیام سے قبل ہی یہ عہدہ شروع ہو گیا تھا۔ سلسلہ صفویہ میں روحانی اور دینی امور میں مرشد کے نائب کی حیثیت سے جس کا تقرر کیا جاتا اس کو صدر کہا جاتا تھا۔ صفوی حکومت کے قائم ہونے کے بعد بھی یہ عہدہ باقی رہا اور صدر کی حیثیت سے دینی امور کی ذمہ داری کے لیے لوگوں کا تقرر کیا جاتا رہا۔

بعد کے ادوار میں کئی کئی صدر مقرر کیے گئے اس لیے صدر الصدور کا بھی ایک عہدہ قائم کیا گیا۔ صدر کا بنیادی کام لوگوں کی دینی تربیت اور عقائد کی اصلاح ہوتا تھا۔

مذکورہ بالا عہدوں کے علاوہ اور بھی متعدد عہدے تھے جن کے توسط سے صفوی حکومت میں دینی اصلاح و تربیت، سیاسی تنظیم اور عسکری تربیت کے ساتھ ساتھ سماجی مسائل حل کیے جاتے تھے۔

صفوی حکومت کی ایک بڑی انفرادیت یہ ہے کہ اس حکومت نے مختلف قسم کے لوگوں، مختلف نسل کے قبائل اور مختلف بود و باش رکھنے والوں کو ایک ساتھ جمع کیا اور ان کے اندر ایسی وحدت پیدا کی کہ وہ ایک معاشرہ بن گئے۔ یہ اس لیے ممکن ہو سکا کہ انھوں نے مختلف عہدوں اور حکومتی ذمہ داریوں کے ذریعے ان سب کو اپنے ساتھ جوڑ لیا۔ الگ الگ عہدے اور ان کے دائرہ اختیار مقرر کیے گئے تاکہ ہر طبقے کی حکومت کے اندر نمائندگی ہو اور کوئی طبقہ اپنے آپ کو محروم یا دوسرے کا ماتحت نہ سمجھے۔

15.1 عورتوں کی حیثیت

صفوی عہد کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس عہد میں عورتوں کو کافی آزادی تھی اور عورتیں حسب موقع سرکاری کاموں کو انجام دیتی تھیں اور دربار پر ان کے اثرات ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں سب سے نمایاں نام محمد خدابندہ کی بہن پری خانم اور محمد خدابندہ کی بیوی خیر النساء کا ہے جو مہد اولیاء کے نام سے معروف تھی۔ ان دونوں خواتین کے عہد میں پوری حکومت ہی ان دونوں کے ماتحت مانی جاتی تھی قزلباش پری خانم کے ماتحت تھے اور دیگر سرکاری عملہ مہد علیا کے ماتحت رہا۔ دونوں کے درمیان اختلافات بھی رہے تاہم دونوں اپنے وقت کی نہایت طاقتور خواتین تھیں۔

15.2 قالین سازی

قالین سازی کے لیے ایران کا نام ہمیشہ سے نمایاں رہا ہے۔ صفوی دور سے پہلے بھی ایران میں بہترین قالین تیار کیے جاتے تھے مختلف سفرناموں میں اس کا تذکرہ ہے۔ عہد سلجوقی کے مشہور سیاح ناصر خسرو نے کوہستان کے ایک شہر تون کے بارے میں لکھا ہے کہ وہاں

قالین بنانے کے 400 کرگھے تھے اس کے علاوہ تستر، خوزستان، فارس وغیرہ میں عمدہ قالین بنائی جاتی تھی۔

صفوی عہد کے آغاز سے قالین بافی میں بھی نمایاں ترقی ہوئی۔ اس دور کی ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ اس دور کی قالینوں کے نمونے بھی مل جاتے ہیں اور مختلف کتابوں کے مخطوطات میں ان قالینوں میں سے کچھ کی تصاویر بھی موجود ہیں۔ اس کی وجہ سے صفوی عہد کی قالین بافی کا تفصیلی مطالعہ کیا جاسکتا ہے

ایران کے قالین چین، ہندوستان، ترکی اور عرب کے علاوہ یورپ تک جاتے تھے۔ ایسے شواہد موجود ہیں کہ عہد اکبری میں کرمان، خوزستان اور سبزوار کے بنائے ہوئے قالین ہندوستان میں بہت مقبول تھے۔ اسی طرح ترکی کے اندر ہمدان کے قالین اور منقش پردے بہت پسند کیے جاتے تھے۔

اصفہان کے دارالحکومت بننے کے بعد صفوی عہد میں یہاں بھی قالین سازی کی صنعت کو بڑی ترقی ہوئی۔ تاہم جو دوسرے مراکز تھے جیسے کاشان، سیستان اور کرمان وغیرہ ان کی قالینیں بھی مشہور رہیں۔ اصفہان کی ایک اضافی بات یہ بھی تھی کہ یہاں پر قالین بافی کے جو کارخانے قائم ہوئے ان میں ایک تعداد ایسے کارخانوں کی تھی جو سرکاری سرپرستی میں چلتے تھے اور ان کارخانوں میں جو قالین تیار کیے جاتے تھے وہ دوسرے ملکوں کے حکمرانوں حتیٰ کہ یورپ تک کے حکمرانوں کو تحفے میں بھیجے جاتے تھے۔

ایرانی قالین کئی طرح کی ہوتی تھی۔ ان کی بناوٹ میں بہت سے طریقے اختیار کیے جاتے تھے جیسے کچھ قالینوں میں پھندنے ہوتے تھے، کچھ میں صرف بارڈر ہوتی تھی اور قالین کے اندرونی حصے میں کچھ قالین ایسی تھی جن میں درختوں کی تصویریں بنائی جاتی تھیں کچھ قالینوں پر مذہبی علامت منقش کی جاتی تھی، کچھ میں پھول، باغ، نہریں، جانور، جنگل بلکہ شکار گاہ تک کی تصویریں منقش کی جاتی تھیں۔ ایرانی قالینوں کے ایسے نمونے بھی موجود ہیں جن کے اندر ایران کی قدیم روایات کا بھی تذکرہ ہے جیسے بعض قالینوں پر شیرین و فرہاد سے متعلق مناظر نقش کیے گئے ہیں۔

کچھ ایرانی قالین ایسی بھی ہیں جن میں ان کے بنانے والوں کے دستخط موجود ہیں اور کچھ قالینوں میں ان کے تیار کرنے کی جگہ یعنی اس شہر کا نام بھی نقش کیا ہوا ہے جہاں وہ قالین تیار کی گئی۔

صفوی عہد کی قالینوں پر بہت کام ہوئے ہیں ان کی بناوٹ، ان کے ساز و سامان، ان کے نقش و نگار اور ان کے بنانے کی جگہ وغیرہ پر بہت سے کام ہوئے ہیں۔ اس زمانے کی بہت سے قالینیں موجود ہیں جو دنیا کے مختلف عجائب خانوں میں رکھی ہوئی ہیں ان کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایران کی قالین بافی کی صنعت صفوی عہد میں بام عروج کو پہنچ گئی تھی۔

15.3 برتن سازی

برتن انسان کی بنیادی ضرورت ہے اس لیے برتن سازی کا ارتقاء پوری دنیا میں ہوا۔ برتن کی بنیادی ضرورت تو سب کی تھی۔ سارے ہی انسان برتن استعمال کرتے تھے، لیکن امراء نے اپنے آپ کو ممتاز کرنے کے لیے برتنوں میں طرح طرح کے اضافے

کروائے۔ ان اضافوں کی وجہ سے برتنوں میں مختلف قسم کے اضافے، نقش و نگار، مختلف دھات وغیرہ کے استعمالات بڑھ گئے۔ صفوی دور سے قبل ایران کی برتن بنانے کی صنعت بہت نمایاں نہیں تھی صفوی دور میں اس کے اندر زیادہ اضافہ ہوا۔

برتنوں میں کئی طرح کے اضافے کیے گئے

صفوی دور میں خاص طور پر امراء کے استعمال کے برتنوں میں کئی طرح کے اضافے کیے گئے۔ جیسے مختلف قسم کے رنگ استعمال ہوئے۔ برتنوں کو رنگنے کے لیے کاہی رنگ پہلے سے استعمال ہوتا تھا۔ صفویوں نے اس کے ساتھ نیلے اور سفید رنگ کا بھی استعمال برتنوں کو رنگنے کے لیے کیا۔ اسی طرح ان برتنوں پر مختلف قسم کے نقش و نگار اور مناظر نقش کیے گئے۔ درختوں اور جانوروں کی تصویریں نقش کی جانے لگیں۔ خاص طور پر صراحیوں، گلدانوں، تشتریوں، پیالوں یعنی ان برتنوں پر جو عموماً محفلوں میں استعمال ہوتے تھے ان کے اندر نقش و نگار، رنگوں اور عبارتوں کا زیادہ اہتمام کیا گیا۔ عبارتوں میں کلمہ اور اماموں کے ناموں کے علاوہ بعض اوقات امراء اور ان کے بنوانے والوں کے نام بھی لکھے گئے۔

ایران کے برتن مٹی کے بھی ہوتے تھے اور مختلف دھاتوں کے بھی بنائے جاتے تھے۔ چینی مٹی کے بھی برتن بنائے جاتے تھے۔ ان برتنوں پر جو نقش ہوتے تھے وہ دو طرح کے ہوتے تھے۔ کچھ اس طرح سے بنائے جاتے تھے کہ وہ برتن کی دیوار پر ابھرے ہوئے نظر آئیں اور کچھ برتنوں میں ایسے بھی نقش و نگار بنائے جاتے تھے کہ وہ برتن کی دیوار میں اندر کو گدے ہوئے ہوتے تھے۔

برتنوں سے قریب قریب فلز کاری بھی ہے۔ صفوی عہد میں اس کا بھی بڑا ارتقاء ہوا۔ یہ عام طور پر دھات جیسے لوہے، فولاد یا سونے چاندی کے بنائے جاتے تھے جیسے شمعدان، بوتل، صراحی، پیالہ وغیرہ۔ ان کی دیواروں پر بھی انتہائی خوبصورت منقش کام ہوتے تھے۔ صفوی عہد کے فلز کاری کے بہت سے نمونے ترکی اور یورپ کے عجائب خانوں میں محفوظ ہیں۔

15.4 دیگر فنون

صفوی عہد میں اس طرح کے بہت سارے تمدنی اور تہذیبی فنون کا ارتقاء ہوا جن کی تفصیل کا موقع نہیں ہے جیسے سنگ تراشی کے اندر بھی بہت ارتقاء ہوا، اسی طرح شیشے کی مختلف چیزیں اور شیشہ گری کے فن میں بڑی ترقی ہوئی، اسی طرح حکاکی میں بہت ترقی ہوئی۔ ساتھ ہی لکڑی کے کام میں بھی بڑا ارتقاء ہوا اور ہاتھی کے دانت کی بنی ہوئی چیزیں، ظروف اور ان پر نقاشی میں بھی بڑا ارتقاء ہوا، سکہ سازی میں بھی بڑی ترقی ہوئی، سکوں کے اوپر مختلف عبارتیں، سنین، بادشاہوں کے نام، کلمہ طیبہ، ائمہ اہل بیت کے نام، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا نام اور اسی طرح کی دوسری چیزیں نقش کی جاتی تھیں۔

15.5 علم و ادب

صفوی عہد کا آغاز تیموری سلطنت کے بعد ہوا۔ تیموری دور میں علم و ادب کی ایک شاندار روایت قائم کی گئی تھی۔ صفوی اس کے وارث قرار پائے، اس لیے کہ وسط ایشیا میں تیموریوں کی حکومت ختم ہونے کے بعد صفوی ان کے وارث بنے تھے۔ صفوی دربار کے بہت

سے علماء تو ایسے تھے جو پہلے تیموری دربار میں ہی ملازم تھے۔ تیموری دربار کے خاتمے کے بعد اسی صفوی دربار سے وابستہ ہوئے۔ ان کے علاوہ مختلف علاقوں کے دوسرے علماء فضلاء اور دانشور بھی وہاں آئے۔ ایک خاص پہلو یہ بھی ہے کہ صفوی دربار میں خاص طور سے شیعہ علماء کو مختلف علاقوں سے مدعو کر کے جمع کیا گیا تھا تا کہ ریاست کی مذہبی ضروریات کی تکمیل ہو سکے۔ چونکہ ریاست کا سرکاری مذہب شیعہ مذہب بن چکا تھا اس لیے بڑی تعداد میں علماء اور مذہبی رہنما وہاں آئے۔

صفوی عہد میں شیعہ مذہب کی تعلیم کے لیے بڑی تعداد میں مدارس بھی قائم کیے گئے۔ صفوی عہد کا پہلا مدرسہ سنہ 1034 میں علی الکرکی نے قائم کیا جس میں شیعہ مذہب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کے بعد قزوین، تبریز، اصفہان اور دوسرے شہروں میں بڑی تعداد میں چھوٹے بڑے مدارس قائم ہوئے، صرف اصفہان میں 48 مدارس تھے۔ اسی طرح دیگر شہروں میں بھی مدارس قائم ہوئے۔ ان مدارس کو سرکار کی طرف سے بڑی بڑی جاگیریں دی گئی اور مالی تعاون بھی دیا جاتا تھا۔ ان کے ذریعے ایران میں ایک طرف علم و ادب کی بڑے پیانے پر سرپرستی ہوئی اور دوسری طرف شیعہ مذہب کو بھی ان کے ذریعے بڑا فروغ حاصل ہوا

صفوی عہد میں علم ادب اور حکمت و دانش کی وہ فضا تو باقی نہیں رہی جو اس سے پہلے ایران کا خاصہ تھی تاہم پھر بھی اس دور میں کئی ایسے علماء اور دانشور پیدا ہوئے جن کے نام تاریخ کے صفحات پر درج ہیں ان میں سے بعض کے ناموں کو شہرت دوام حاصل ہے ان علماء و فضلاء اور دانشوروں میں سے چند نام حسب ذیل ہیں:

1. ملاصدرا

صدرالدین محمد بن ابراہیم شیرازی اپنے وقت کے نامور عالم فلسفی اور صوفی تھے۔ فلسفہ اور الہیات میں ان کو غیر معمولی مہارت حاصل تھی اور ان میدانوں میں ان کے کچھ منفرد نظریات بھی ہیں جن کی وجہ سے ان کو صدرالمتألھین کہا جاتا ہے۔ فلسفہ الہیات میں وہ ایک مستقل اسکول کے بانی تھے جس کو حکمت متعالیہ کہا جاتا ہے۔ 1571 میں اصفہان میں پیدا ہوئے اور 1640 میں اسی شہر میں ان کی وفات ہوئی۔ انھوں نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں اسفار اربعہ چار جلدوں میں ہے اس کے علاوہ 60 سے زائد اور بھی کتابیں ہیں جن میں حکمت، فلسفہ، منطق، قرآن و حدیث اور دیگر اسلامی علوم کے بارے میں بہت اہم، مستند اور مدلل معلومات ہیں۔ ملا صدرا کی ایک بات یہ بھی ہے کہ وہ صرف شیعوں میں مقبول نہیں ہیں بلکہ اہل سنت بھی ان کی کتابوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کی کتابیں اہل سنت کے مدارس میں بھی پڑھائی جاتی رہی ہیں۔

2. میرباقر مجلسی

ملا محمد باقر مجلسی بھی صفوی دور کے نہایت ممتاز عالم اور فقیہ تھے۔ اصفہان میں پیدا ہوئے، فقہ، کلام اور اصول اسلام پر ان کو ملکہ حاصل تھا۔ ساری زندگی درس و تدریس میں گزاری، اس کے ساتھ شیعہ مسلک کی نشر و اشاعت بھی کرتے رہے اور ساری زندگی مناظرے بھی کرتے رہے۔ خاص طور پر علماء اہل سنت کے ساتھ انھوں نے بہت سے مناظرے کیے۔ تصنیف و تالیف کا ذوق بھی رہا۔ انھوں نے تقریبا دو درجن کتابیں لکھیں۔ ان کی کتابوں میں بحر الانوار، حق الیقین اور حلیۃ المتقین وغیرہ اہم ہیں۔

3. میر باقر داماد

میر برہان الدین محمد باقر استر ابادی جو میر باقر داماد کے نام سے معروف ہیں عہد صفوی کے نامور عالم، دانشور، فلسفی اور مصنف تھے۔ ملا صدرا کے فلسفہ کو ترقی دینے میں ان کا اہم کردار ہے۔ وہ ملا صدرا کے شاگرد بھی تھے۔ میر باقر داماد نے مختلف اسلامی علوم پر سو سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔

4. غیاث الدین بن ہمام الدین خواند میر

غیاث الدین بن ہمام الدین خواند میر یہ پہلے تیموری بادشاہوں کے یہاں ملازم تھے۔ تیموری سلطنت کے زوال کے بعد شاہ اسماعیل صفوی کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ انھوں نے حبیب السیر کے نام سے تاریخ کی ایک اہم اور مستند کتاب لکھی ہے۔ بعد میں انھوں نے ہندوستان کا بھی سفر کیا اور ہندوستان میں یہ کتاب مکمل کی۔ اس کے علاوہ ایک کتاب روضۃ الصفا کا تکملہ لکھا ان کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں لکھیں۔ دہلی میں ان کا انتقال ہوا۔

5. حسن بیگ راملو

حسن بیگ راملو شاہ طہماسپ کے عہد کے ایک بڑے سردار تھے جو قزلباشوں کے سردار تھے۔ بڑے عالم فاضل آدمی تھے انھوں نے احسن التواریخ کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں صفوی خاندان کے بزرگوں کے حالات ہیں۔

6. منشی اسکندر منشی

منشی اسکندر منشی نے ایک کتاب لکھی ہے تاریخ عالم آرائے عباسی۔ اس میں شاہ عباس اول تک صفوی خاندان کے بزرگوں کے حالات جمع کیے ہیں۔

صفوی عہد میں ان علماء اور دانش وروں کے علاوہ اور بھی کئی معروف علماء گزرے ہیں جنھوں نے تاریخ میں، ادبیات میں، علم الحساب یعنی میتھمیٹکس میں اور فلسفے کی دوسری شاخوں میں متعدد کتابیں لکھیں۔

مذکورہ بالا علماء کے علاوہ آقا حسین خوانساری، ملا عبد الرزاق لاہیجی اور ملا محمد ملا محسن فیض کاشانی اور بہت سارے علماء تھے جو صفوی عہد میں پیدا ہوئے۔ اس دور کے علماء شیعہ مسلک کے حامی تھے۔ اسی مذہب کے مناظر تھے اور انھوں نے عام طور پر جو تصنیفی کام کیے ہیں وہ زیادہ تر شیعہ مذہبی نوعیت کے ہیں، کچھ استثناہیں جیسے ملا صدرا اور میر باقر داماد وغیرہ۔ انھوں نے خالص فلسفے پر اور فلسفہ الہیات پر اور منطق و فلسفے میں بھی کام کیے ہیں جو عام طور پر سبھی مسلمانوں کے نزدیک قابل قبول ہیں، حتیٰ کہ ملا صدرا کی کتاب تو اہل سنت کے مدارس بلکہ دارالعلوم دیوبند جیسے مدرسے میں بھی مدتوں داخل نصاب رہی ہے۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ صفوی عہد میں علم و ادب کی خوب سرپرستی ہوئی۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ البتہ اس دور کا ایک بڑا حصہ مذہبی تصنیفات کا ہے۔ ساتھ ہی ادبیات، قرآن و حدیث، فلسفہ و تاریخ اور اس دور کے سائنسی علوم میں بھی متعدد ایسی کتابیں لکھی گئیں جو بعد والوں کے لیے رہنما ثابت ہوئی۔

15.6 ایران کی مذہبی صورت حال

خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایران فتح ہوا۔ اس وقت ایران میں غالب اکثریت مجوسی مذہب کے پیروکاروں کی تھی۔ کچھ دوسرے مذاہب بھی تھے، لیکن مجوسی مذہب کے ماننے والے سب سے زیادہ تھے۔ جب ایران میں اسلام آیا تو بہت سے حلقوں سے اسلام کا استقبال کیا گیا اور ایران میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ بنوامیہ کے دور میں امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا دردناک واقعہ پیش آیا تو اس نے مسلمانوں کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ لوگ بنی امیہ کے خلاف ہو گئے اور امام حسین کی شہادت کا بدلہ لینے کے لیے بنوامیہ کے خلاف بغاوت کر دی۔ بنوامیہ فوجی طاقت میں بے مثال تھے، اس لیے عام مسلمانوں کی طرف سے امام حسین کی شہادت کا بدلہ لینے کی کوشش پوری طرح کامیاب نہ ہو سکی، لیکن اس کا ایک اثر یہ ہوا کہ عوام میں حضرت امام حسین کے لیے اور ان کی شہادت کا بدلہ لینے کے لیے جذبات بھڑک اٹھے۔ لوگوں نے امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا بدلہ لینے کے لیے مستقل تحریکیں چلائیں اور متعدد بغاوتیں بھی حکومت کے خلاف کیں۔

ایران بنوامیہ کے مرکز سے دور تھا، اس لیے لوگوں کو یہاں نسبتاً آزادی کے ساتھ اپنی تحریک کو پروان چڑھانے کا موقع ملا اور ان کی کوششوں سے اور کچھ دوسرے عوامل سے یہ تحریک یہاں کامیاب رہی۔ ان لوگوں کی کوششوں سے بنوامیہ کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور لوگوں نے امام حسین کی شہادت کا بدلہ لے لیا۔

ایران کے اندر اس پورے دورانیہ میں شیعہ مسلک وجود میں آیا خاص طور پر ایران کے شہر قُم اور سبزوار میں اثنا عشری شیعہ کی اکثریت ہو گئی۔ باقی ایران کے لوگ بالعموم اہل سنت کے مسلک پر رہے۔ اس کے بعد بھی وہاں سیاسی سرگرمیاں جاری رہیں۔ دیلمی اور بویہی جیسی شیعہ حکومتیں قائم ہوئیں اور سامانی اور سلجوقی جیسی سنی حکومتیں بھی یہاں قائم ہوئیں پھر بھی غالب اکثریت سنیوں کی ہی باقی رہی۔

15.7 ایران میں صفوی حکومت کا آغاز اور شیعہ مذہب کی اشاعت

1501 میں ایران کے اندر شاہ اسماعیل صفوی کی حکومت کا آغاز ہوا۔ شاہ اسماعیل کے بزرگوں میں شیخ صفی الدین اردبیلی جو صفوی سلسلہ صوفیہ کے بانی تھے، وہ سنی تھے۔ ان کے پوتے شیخ علی نے شیعہ مسلک اختیار کیا۔ بعد میں وہ لوگ تصوف کے سلسلے میں رہے اور ساتھ ہی سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ انھوں نے اپنے خاص مریدوں کی ایک باضابطہ جماعت بھی بنائی تھی جو قزلباش کہلاتی تھی۔ ان کا ایک خاص لباس تھا اور یہ لوگ باضابطہ فوجی تربیت سے گزرتے تھے اس طرح قزلباش کو رضاکار فوج کہا جا سکتا ہے۔ قزلباش کا مطلب ہوتا ہے لال ٹوپی، چونکہ یہ لوگ لال رنگ کی ٹوپی پہنتے تھے جس میں 12 اماموں کے نام پر 12 کنگرے بھی ہوتے تھے اس لیے ان کو قزلباش کہا جاتا تھا۔

دیکھا جائے تو صفوی سلسلے کی فوجی طاقت ابتدا میں ان کے ہی دم سے تھی اور قزلباش نے ہی ایک طرح سے صفوی حکومت کے

قیام میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ شاہ اسماعیل اگرچہ ایک بادشاہ تھے لیکن اپنے مزاج اور رویوں کے اندر وہ ایک صوفی ہی تھے، انھوں نے اپنی مذہبی حیثیت کو ہمیشہ اپنی سیاسی حیثیت کے اوپر رکھا۔ خود بھی مذہب پر سختی سے عمل پیرا رہے اور جس مذہب کو حق جانا اس کی اشاعت میں بھی بڑی جدوجہد کی۔ وہ خود بھی 12 اماموں سے بے انتہا عقیدت رکھتے تھے اور یہی طریقہ انھوں نے ملک کے اندر بھی جاری رکھا انھوں نے ایران کا سرکاری مذہب شیعہ مذہب کو بنا دیا۔ مساجد کے اندر مکمل طور پر 12 اماموں کی منقبت شروع ہوئی، اذان میں شیعہ طریقہ اختیار کیا گیا، صرف شیعہ مسلمان ہی امام و موذن مقرر کیے جانے لگے، سکوں کے اوپر کلمہ طیبہ کے ساتھ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا نام بھی شامل کیا جانے لگا۔ اس طرح ایران کے اندر شیعہ مذہب کا غلبہ ہو گیا۔

شاہ اسماعیل نے شیعہ مذہب کو سرکاری مذہب کیوں بنایا جب کہ ان سے قبل بھی ایران میں دو شیعہ حکومتیں قائم ہو چکی تھیں اور انھوں نے اہل سنت کو شیعہ مذہب اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ اس کے سلسلے میں مورخین نے دو توجیہ کی ہیں ایک یہ کہ وہ ایران کو باقی اردگرد کی ریاستوں کے مقابلے میں ایک منفرد شناخت دینا چاہتے تھے، چونکہ باقی تمام ریاستیں اس وقت سنی تھیں اس لیے انھوں نے اپنی ریاست کو شیعہ رنگ دیا تاکہ وہ اردگرد کی ریاستوں سے منفرد رہے۔ دوسری وجہ یہ لکھی ہے کہ ان کے پیروکار زیادہ تر غالی شیعہ تھے اس لیے ان کو پوری طرح اپنے ماتحت رکھنے کے لیے انھوں نے شیعہ مذہب کو سرکاری مذہب بنایا۔ (کیمبرج ہسٹری اف اسلام)

مورخین کی یہ توجیہات سیاسی طور پر ہو سکتا ہے کہ درست ہوں تاہم ایک پہلو یہ بھی ہے کہ شاہ اسماعیل کی نظر میں شیعہ اثنا عشری مسلک ہی حق تھا، اس لیے اس پر خود بھی عمل پیرا تھے اور انھوں نے اپنی ریاست کا سرکاری مذہب بھی اثنا عشری شیعہ مسلک کو ہی بنایا۔ شاہ اسماعیل کو شیعہ مسلک کو سرکاری مذہب بنا کر بلاشبہ کئی سیاسی فائدے بھی حاصل ہوئے یعنی اس طرح شاہ اسماعیل مذہبی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے حاکم بن گئے۔ یعنی دین کے امام اور دنیا کے بادشاہ۔ انھوں نے اپنی حیثیت نائب امام زمان کی مقرر کی اس طرح ان کو مذہبی طور پر ایک مقدس مقام حاصل ہو گیا، جس کے ذریعے ان کی حکومت کو استحکام ملا۔

شاہ اسماعیل کی دینی حیثیت کی وجہ سے ان کے مریدین اور جاںنثاروں میں غیر معمولی عقیدت کا جذبہ پیدا ہوا اور انھوں نے تن من دھن نثار کر کے شاہ اسماعیل کی پیروی کی۔ ان کے ذہنوں میں یہ بات جم گئی کہ چونکہ شاہ اسماعیل امام زمان کے نائب ہیں اور مذہبی پیشوا ہیں، اس لیے ان کو جنگ میں شکست نہیں ہو سکتی۔ یہ جو بھی جنگ کریں گے اس میں ہر حال میں کامیاب ہوں گے، اس عقیدے نے قزلباش کے حوصلے بلند کر دیے اور جنگ چلدران سے قبل یہی جذبہ ہر جنگ میں ان کی کامیابی کی ضمانت بن گیا۔

شاہ اسماعیل نے ایران کے اندر شیعہ مسلک کی اشاعت کے لیے اور اس کو پھیلانے کے لیے اس کی نشر و اشاعت کے لیے کئی طریقے اختیار کیے ان میں سے حسب ذیل طریقے اہم ہیں:

15.8 شیعہ قاضیوں کا تقرر

شاہ اسماعیل خود بھی ایران سے نہیں تھے اور اس زمانے میں ایران کے اندر شیعہ علماء بھی زیادہ نہیں تھے۔ شیعہ مسلک کو سرکاری

درجہ دینے کے بعد اس کی ضرورت تھی کہ شیعہ قاضیوں کا تقرر کیا جائے اور دینی رہنمائی کے لیے شیعہ علماء بھی بڑی تعداد میں ایران کے اندر بلائے جائیں۔ اس لیے شاہ اسماعیل نے مختلف علاقوں سے علماء کو بلا کر قاضی کے عہدے دیے اور تعلیم و تدریس کا سلسلہ بھی جاری کیا۔اس سلسلے میں بڑی تعداد میں بلاد و امصار سے لوگ ایران آئے تھے،ان میں درج ذیل نام بہت مشہور ہیں شیخ علی بن عبد العلی القرکی العاملی، شیخ حسین بن عبد الصمد العاملی اور ان کے بیٹے محمد جو بہاؤ الدین عاملی کے نام سے مشہور ہوئے اور شیخ نعمت اللہ الجزائری وغیرہ۔شاہ اسماعیل کے عہد میں بہت سے دینی مناسب بھی وجود میں آئے جیسے صدر،عالم، شیخ الاسلام وغیرہ۔

شاہ اسماعیل نے ایک نہج یہ قائم کیا کہ دینی و دنیاوی دونوں طرح کی سیادت اپنے ہاتھ میں رکھی اس کی وجہ سے سماجی سطح پر ایسی کئی کوششیں ہوئیں کہ مذہبی قیادت علماء کے ہاتھ میں رہے لیکن وہ زیادہ کامیاب نہیں ہوئے اور آخر تک دین و سیاست میں بادشاہ کی رائے ہی باوزن رہی۔ کم از کم صفوی عہد میں یہی صورت حال رہی۔

15.9 موذنین اور خطباء کا تقرر

شاہ اسماعیل نے موذنین اور خطیبوں کا تقرر کر کے سماجی اور عوامی سطح پر شیعہ مسلک کی ترویج و اشاعت کی۔ موذنین اور خطباء سرکاری عہدے دار ہوتے تھے،اس لیے وہ وہی اذان دیتے تھے جو شیعہ مسلک کی ہے اور امام اسی طریقے کے مطابق نماز پڑھاتے تھے اور خطبے میں 12 اماموں کا ذکر کیا کرتے تھے۔ اس طرح پورے ملک میں ایسا ماحول ہو گیا کہ ہر جگہ وہی اذان ہوتی اور وہی نماز ہوتی اس لیے لوگ اسی میں شامل ہونے لگے اور اس طرح عوام کے اندر شیعہ مذہب پھیل گیا۔

15.10 قزلباش کا کردار

شیعہ مسلک کو عوامی مقبولیت دینے میں سب سے اہم کردار قزلباش کا ہے۔ شاہ اسماعیل کی اصل طاقت بھی یہی تھے اور ان کی تنظیم و تربیت اثنا عشری روایت کے مطابق ہوتی تھی۔ وہ ایک طرح سے اس مسلک کی دعوت کے بھی ذمہ دار تھے۔ وہ گروہ کی شکل میں نکلتے اور عوامی مقامات پر تبرا کرتے ہوئے گزرتے اگر کوئی ان کی مخالفت کرتا تو اس کا مقابلہ کرتے اسی طرح وہ لوگوں کو دعوت بھی دیتے کہ وہ اثنا عشری مذہب اختیار کریں۔ ان کوششوں اور ان کے جلوسوں کی وجہ سے بھی ایران کے اندر شیعہ اثنا عشری مذہب کی نشر و اشاعت میں بڑا اضافہ ہوا۔

شاہ اسماعیل کی ان تمام کوششوں سے ایران کا غالب مذہب شیعہ اثنا عشری ہو گیا۔ بہت سے مورخین نے لکھا ہے کہ شاہ اسماعیل نے مذکورہ بالا طریقوں کے علاوہ اس کام کے لیے طاقت کا بھی استعمال کیا اور اس کی وجہ سے سنی علماء کی ایک بڑی تعداد یا تو ایران سے ہجرت کر کے دوسرے علاقوں میں چلی گئی یا پھر قتل کر دی گئی۔

شاہ اسماعیل کے بعد طہماسپ کے دور میں مسلکی روایت بدستور وہی رہی جو شاہ اسماعیل نے شروع کی تھی۔ شاہ طہماسپ بھی اپنے آپ کو صوفی درویش اور بادشاہ کا مجموعہ سمجھتے تھے۔ ان کے دور میں بعض لوگ شاہ اسماعیل کو مہدی ماننے لگے تھے، تو انھوں نے اس کی سختی

سے تردید کی۔ وہ امام مہدی کے ظہور کا عقیدہ رکھتے تھے اور اس کے لیے تیاری بھی کر رہے تھے۔ انھوں نے علماء کو مذہبی معاملات میں ایک حد تک آزادی بھی دی اور ساتھ ہی ہمسایہ ریاستوں سے دوستانہ تعلقات قائم بھی کیے۔ خلافت عثمانیہ کے ساتھ بہتر تعلقات بنانے کے لیے انھوں نے اہم اقدامات بھی کیے۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ انھوں نے صحابہ پر اعلانیہ تبرا کی ممانعت کر دی اور ترکی کی سنی خلافت کے ساتھ تعلقات استوار کیے بلکہ تحفے میں کئی مطلا اور مذہب قرآن کریم کے نسخے ترکی بھیجے۔

صفوی عہد کے پورے دورانیہ میں مذہبی معاملات ایک جیسے ہی رہے ان میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی، البتہ کچھ ضمنی تبدیلیاں ہوتی رہیں ان میں دو تبدیلیاں اہم ہیں:

15.11 قزلباش کی طاقت

شاہ اسماعیل کے عہد میں قزلباش سب سے طاقتور جماعت تھی اور مذہبی امور پوری طرح ان کے احکام کے مطابق ہی انجام دیے جاتے تھے، لیکن شاہ اسماعیل کے بعد بتدریج قزلباش کی طاقت کم ہوتی گئی اور شاہ عباس کے زمانے تک ان کا دائرہ عمل کافی حد تک محدود ہو چکا تھا۔ قزلباش کی طاقت کو کم کرنے کا عمل دراصل شاہ طہماسپ نے شروع کیا تھا اور اس کا اتنا اثر ہوا کہ بعض قزلباش ایران چھوڑ کر ترکی چلے گئے اور پھر وہیں بود و باش اختیار کر لی۔

15.12 صحابہ کرام پر تبرا کی رسم

شاہ عباس کے زمانے میں خاص طور پر قزلباش صحابہ کرام پر تبرا کیا کرتے تھے اس رسم پر عثمانی حکومت کو اعتراض تھا اور ظاہر ہے ایران کے سنی علماء بھی اس کو ناپسند کرتے تھے، شاہ اسماعیل کے بعد اس میں بھی تبدیلی ہوتی رہی پہلے شاہ طہماسپ نے اس کو روکا پھر دوبارہ آغاز ہو گیا اس کے بعد شاہ عباس نے اس کو بڑی حد تک بند کرا دیا۔

15.13 ایران کے دیگر مذاہب

ایران کے اندر اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب بھی موجود تھے۔ خاص طور پر عیسائی اور مجوسی مذہب کے پیروکار بڑی تعداد میں تھے اور یہودی بھی تھے۔ ان مذاہب کے ساتھ صفوی دور کے حکمرانوں نے روایتی اسلامی رواداری کا مظاہرہ کیا۔ ان کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی پوری آزادی تھی۔ اس زمانے میں آرمینیا بھی ایران کا حصہ تھا۔ اس میں اکثریت عیسائیوں کی تھی اور بڑی تعداد میں چرچ بھی تھے۔ بعض صفوی حکمرانوں کے بارے میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ وہ اظہار یکجہتی کے لیے ان چرچوں میں بھی جایا کرتے تھے۔

15.3 خلاصہ

صفوی عہد میں ایران کی تہذیب و تمدن میں بڑا اضافہ ہوا اور ایران کو ایک مخصوص تمدنی شناخت ملی۔ اس کے علاوہ اسی دور میں ایران کے اندر اثنا عشری شیعہ مذہب کو اکثریت حاصل ہوئی۔ اس طرح سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایران کے تہذیب و تمدن اور ایران کے

مذہب پر صفوی عہد کے غیر معمولی اثرات ہیں۔ تمدنی طور پر دیکھا جائے تو صفوی عہد کی بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے ترکمانی قبائل، ایران اور ارد گرد کی بہت سی مختلف قوموں کو اور مختلف زبانیں بولنے والے لوگوں کو ایک ساتھ جمع کر دیا اور سب کو ایک ایسی لڑی میں پرو دیا کہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ایک قوم بن کر رہے۔ ان میں رنگ و نسل وزبانوں کی بنیاد پر یہ احساس نہیں تھا کہ کوئی ایک دوسرے کے تابع ہے۔ حکومت قائم ہونے کے بعد صفوی بادشاہوں نے نظام اس طرح سے بنایا کہ طرح طرح کے عہدے مختلف لوگوں کو دیے گئے، جیسے وکیل کا عہدہ، امیر الامراءپپ کا عہدہ، قورچی باشی کا عہدہ، وزیر کا عہدہ، صدر کا عہدہ، یہ سارے عہدے ایسے تھے جو مختلف لوگوں کو دیے جاتے تھے جس کی وجہ سے ہر طبقہ اپنے آپ کو حکومت سے وابستہ محسوس کرتا تھا۔ حکومت کی حفاظت کی ذمہ داری قزلباش لوگوں کی تھی۔

صفوی عہد میں بہت سی تمدنی چیزوں میں بھی بڑا اضافہ ہوا جیسے قالین سازی میں بہت اضافہ ہوا، بڑے بڑے کارخانے قالین بنانے کے لیے بنائے گئے، برتن سازی میں بہت اضافہ ہوا، مٹی، چینی اور دھاتوں کے بلکہ سونے چاندی تک کے برتن بنائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ شیشہ گری، لکڑی کا کام، سنگ تراشی، سکہ سازی اور بہت ساری چیزوں میں اضافہ ہوا۔ صفوی عہد میں علم و ادب میں بھی بڑا اضافہ ہوا بہت ساری کتابیں اس زمانے میں لکھی گئیں، کئی بڑے علماء جیسے ملا صدرا، میر باقر مجلسی، میر باقر داماد، خواند میر، حسن بیگ شاملو اور بہت سارے لوگ یہاں پیدا ہوئے اور مذہبی اعتبار سے دیکھا جائے تو شیعہ اثنا عشری مذہب اسی دور میں ایران کے اندر اکثریت میں آیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شاہ اسماعیل نے شیعہ مذہب کو ایران کا سرکاری مذہب بنا دیا تھا اور اس کی اشاعت کے لیے اور بھی طریقہ اختیار کیے جیسے شیعہ قاضیوں کا تقرر کیا، موذن اور خطیب شیعہ مقرر کیے، قزلباش نے بھی دعوتی کام کیے، اس طرح ایران میں شیعہ مذہب کی اکثریت ہو گئی۔ تاہم دوسرے مذاہب بھی وہاں باقی رہے اہل سنت کا بھی ایک طبقہ رہا اور مجوسی اور یہودی اور دوسرے مذاہب ماننے والے بھی رہے ان کے ساتھ کوئی بھید بھاؤ نہیں کیا گیا۔

15.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- ایران کے تمدنی حالات سے واقف ہوئے۔
- ایران میں نظم حکومت اور سماج کی تشکیل سے واقف ہوئے۔
- ایران کے صفوی عہد کے تمدن سے واقف ہوئے۔
- ایران میں مختلف تمدنی فنون جیسے قالین بافی، برتن سازی وغیرہ سے واقف ہوئے۔
- ایران کے اندر مذہبی حالت اور شیعہ مذہب کے فروغ سے واقف ہوئے۔
- صفوی عہد میں ایران کی علمی و ادبی سرگرمیوں سے واقف ہوئے۔

15.5 نمونہ امتحانی سوالات

15.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. صفوی عہد میں بادشاہ کے بعد سب سے بڑا عہدہ کیا تھا؟

(a). وکیل (b). امیر الامرا (c). وزیر (d). قورچی باشی

2. صفوی عہد میں کون سا عہد عام طور پر قزلباش کو نہیں دیا جاتا تھا؟

(a). قورچی باشی (b). صدر الصدور (c). وکیل (d). وزیر

3. قزلباش کتنے قبائل پر مشتمل تھے؟

4.(a) 8.(b) 6.(c) 7.(d)

4. صدر الصدور کا عہدہ صفوی عہد میں کس نوعیت کا تھا؟

(a). سیاسی (b). مذہبی (c). فوجی (d). فنی

5. کس جگہ کے بنے ہوئے قالین سرکاری تحفے میں دیے جاتے تھے؟

(a). کاشان (b). اصفہان (c). اردبیل (d). قزوین

6. صفوی عہد میں ایران کے اندر برتنوں کو رنگنے کے لیے کن رنگوں کا اضافہ کیا؟

(a). کالے اور لال (b). پیلے اور سفید (c). نیلے اور سفید (d). کاہی اور نیلے

7. ملا صدرا کس شہر میں پیدا ہوئے؟

(a). قزوین (b). شیراز (c). تبریز (d). اصفہان

8. ایران آنے سے پہلے غیاث الدین بن ہمام الدین خواند میر کس کے دربار سے وابستہ تھے؟

(a). سامانی دربار (b). سلجوقی دربار (c). تیموری دربار (d). ازبک دربار

9. میر باقر داماد کس فلسفے کے شارح مانے جاتے ہیں؟

(a). فلسفہ اشراق (b). فلسفہ یونان (c). فلسفہ ہندستان (d). فلسفہ ایران

10. احسن التواریخ کے مصنف کون تھے؟

(a). حسن بیگ راملو (b). میر باقر داماد (c). علی الکرکی (d). منشی سکندر

15.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. صفوی دور میں ترک قبائل کی اہمیت بتائیے۔
2. ملا صدرا کا تعارف کرائیے۔
3. صفوی عہد میں برتن سازی میں کیا ترقی ہوئی بیان کیجیے۔
4. صفوی عہد میں عورتوں کی حیثیت پر نوٹ لکھیے۔
5. صفوی عہد میں ایرانی معاشرے کی اہم خصوصیات بتائیے۔

15.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. ایران کے اندر شیعہ اثنا عشری مذہب کا فروغ کیسے ہوا۔
2. ایران کے اندر علم و ادب کی ترقی پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. صفوی عہد میں ایران کی قالین سازی کے بارے میں تفصیل سے لکھیے۔

15.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. ڈاکٹر رضازادہ شفق: تاریخ ادبیات ایران اردو ترجمہ سید مبارز الدین رفعت
2. ثروت صولت: ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ
3. دائرۃ المعارف الاسلامیہ
4. محمد امین سلطان القرائی: معرفی نسخہ خطی کلیات شاہ اسماعیل صفوی
5. The New Cambridge History of Islam vol.3

اکائی 16: صفوی حکومت میں فنون لطیفہ اور فن تعمیر

اکائی کے اجزا:

16.0 تمہید

16.1 مقاصد

16.2 فنون لطیفہ

16.3 شعر وشاعری

16.3.1 شاہ محمد اسماعیل صفوی

16.3.2 صفوی عہد کے دیگر شعراء

16.4 خطاطی

16.5 مصوری

16.6 موسیقی

16.7 فن تعمیر

16.7.1 دیگر حکمران

16.8 خلاصہ

16.9 اکتسابی نتائج

16.10 نمونہ امتحانی سوالات

16.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

16.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

16.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

16.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

16.0 تمہید

ایران کے اندر صفوی حکومت کے قیام کے بعد مختلف میدانوں اور تعلیم و تدریس اور تہذیبی علوم فنوں میں بہت ترقی ہوئی۔ فنون لطیفہ میں بہت ترقی ہوئی، شاعری کے اعتبار سے بھی کئی نمایاں شخصیات اس دور کے اندر ایران میں پیدا ہوئیں۔ جیسے عرفی شیرازی اور صائب تبریزی وغیرہ۔ دیگر فنون میں بھی اس زمانے میں بہت ترقی ہوئی جیسے خطاطی میں بہت نمایاں اضافے ہوئے۔ مصوری اور موسیقی میں بھی ترقی ہوئی، اسی طرح فن تعمیر میں بھی اضافہ ہوا اس دور کے فن تعمیر کے نمونے ابھی تک موجود ہیں۔ صفوی عہد ہر اعتبار سے ایران کی تعمیر و ترقی کا عہد ہے۔

16.1 مقاصد

اس یونٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد طلبہ اس قابل ہو جائیں گے کہ وہ ایران کے اندر فنون لطیفہ کی ترقی سے واقف ہو سکیں۔ صفوی عہد کے شاعروں کے بارے میں ان کو معلوم ہو گا۔ صفوی عہد کے دیگر فنون اور ان کی ترقیوں سے واقف ہوں گے جیسے خطاطی، مصوری، موسیقی اور فن تعمیر وغیرہ۔ اسی کے ساتھ ان فنون میں لکھی جانے والی کتابوں اور ان فنون کے نمونوں سے واقفیت حاصل کر لیں گے۔

16.2 فنون لطیفہ

ایران کی سرزمین بڑی مردم خیز سرزمین ہے۔ خاص طور پر اسلام کے آنے کے بعد تو یہاں کے لوگوں کی صلاحیت کو بے پناہ ترقی ملی۔ مختلف علوم و فنون اور علم و ادب کے اندر ایران میں غیر معمولی ترقی ہوئی۔ اس سرزمین سے بڑے بڑے دانشور، عالم، محدث، مورخ، طبیب، لغت شناش اور شاعر و ادیب اور مختلف علوم و فنون کے ماہر پیدا ہوئے۔ عربی زبان میں بھی انھوں نے اہم علمی کارنامے انجام دیے اور فارسی زبان و ادب کو تو بام عروج تک پہنچایا۔ آج کی کوئی بھی علمی و ادبی تاریخ ایران کے دانشوروں اور شاعروں کے بغیر نامکمل ہے۔

ایران میں علم و ادب کی یہ ترقی صفوی عہد کے آغاز تک تو اپنے بام عروج پر رہی، جب ایران میں صفوی حکومت قائم ہوئی تو اگرچہ اس حکومت نے ایران کو یکجہتی عطا کی اور ایران کی انفرادی شناخت کو استحکام بخشا، تاہم صفوی حکومت کے قیام کے بعد شاہ اسماعیل صفوی کی کوشش تھی کہ لوگ علم و ادب کے تمام میدانوں میں سب سے زیادہ ائمہ معصومین کے بارے میں لکھیں یا شیعہ مذہب کے حوالے سے دوسری مذہبی تحریر لکھیں۔ اگر شاعر ہوں تو ائمہ معصومین کی منقبت کریں، اگر ادیب ہوں تو انہی پر کتاب لکھیں۔ اس کی وجہ سے ایران کے اندر شاعری اور نثر نگاری میں بھی شیعہ مذہبی نقطہ نظر اور اخلاقیات کی پابندی کا رجحان زیادہ بڑھ گیا۔

صفوی عہد میں ان پابندیوں کی وجہ سے علم و ادب کے قافلے کو پہلی جیسی ترقی تو نہیں رہی تاہم اس کے باوجود کئی اہم اور پائیدار

اہمیت کے حامل لوگ پیدا ہوئے، کئی بڑے شاعر پیدا ہوئے، کئی بڑے فلسفی، عالم دین اور الہیات کے ماہر پیدا ہوئے، اگرچہ ان کی تعداد کم ہے لیکن صفوی عہد ان کے وجود سے بالکل خالی نہیں ہے۔

شعر وشاعری کے علاوہ دیگر فنون لطیفہ جیسے مصوری، موسیقی، نقاشی وغیرہ میں بھی یہاں ترقی ہوئی۔ ذیل کے صفحات میں صفوی عہد کی انہی خدمات کا تعارف کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

16.3 شعر وشاعری

شعر وشاعری کے حوالے سے ایران کے اندر پہلے جیسے لوگ تو پیدا نہیں ہوئے، لیکن پھر بھی کئی اہم اور پائیدار اہمیت کے شاعر پیدا ہوئے ان میں سے کچھ مشہور شعراء کا تعارف ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

16.3.1 شاہ محمد اسماعیل صفوی

شاہ محمد اسماعیل صفوی جو صفوی سلطنت کے بانی تھے۔ وہ خود بھی بڑے عالم وفاضل تھے اور اچھے شاعر تھے۔ ان کی مادری زبان آذری تھی یعنی آذربائیجان کی زبان تھی، ساتھ ہی وہ فارسی زبان کے بھی بڑے عالم تھے۔ وہ دونوں زبانوں میں شعر کہا کرتے تھے۔ ان کی شاعری کا بڑا ذخیرہ آذری زبان میں ہے اور فارسی میں بھی ان کے کافی اشعار ملتے ہیں۔ شاہ اسماعیل کا تخلص خطائی تھا۔ شاہ اسماعیل کے اشعار میں معنی آفرینی، تخیل، عشق ومحبت اور مذہبی جذبات کا ایک اچھا نمونہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ترکی زبان میں ان کے اشعار بہت اعلی درجے کے ہیں، ان کے ترجمے مختلف زبانوں میں دستیاب ہیں۔ نمونے کے لیے ذیل ان کے کچھ فارسی اشعار درج کیے جاتے ہیں:

خورشید من کجائی، تا گیرمت در آغوش

کز یاد من نرفته است، آن موی و آن بناگوش

دشمن ز پیش تیغم روبه صفت گریزد

کی در مصاف ضیغم عرض هنر کند موش

بر من خطا گرفتی، گفتی: تو یی خطایی

آری منم خطایی، توئی خطاپوش

فرمان پذیر دیروز فرمانرواست امروز

شاهم به دیگران لیک، پیش تو حلقه در گوش

شاہ اسماعیل کے علاوہ دیگر کئی بادشاہوں نے بھی شاعری کی، لیکن ان کے کلام میں وہ نزاکت خیال اور تخیل نہیں ہے، جو شاہ اسماعیل کے کلام کا خاصہ ہے۔ بادشاہوں کی شاعری کے علاوہ ان کے درباروں سے بہت سے شعراء بھی وابستہ رہے۔ اس دور کے دیگر شعراء

حسب ذیل ہیں:

1. محتشم کاشانی

محتشم کاشانی صفوی عہد کے بڑے شاعروں میں ہیں۔ بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر تھے۔ عاشقانہ مضامین کو نہایت خوبصورتی سے الفاظ کا جامہ پہناتے تھے۔ یہ شاہ طہماسپ کے زمانے میں درباری شاعر تھے۔ انھوں نے زیادہ تر شاعری تو اپنے مخصوص رنگ میں کی ہے، لیکن بعد میں دربار کی ضروریات کو دیکھتے ہوئے انھوں نے مرثیہ گوئی اور منقبت کے میدان میں کلام کہنا شروع کیا اور ایک مرثیہ گو کی حیثیت سے بھی وہ ایک مشہور شاعر بنے۔ ان کے چند اشعار یہ ہیں:

دلے دارم که در تنگی درو جز غم نمی گنجد

غمے دارم ز دل تنگی که در عالم نمی گنجد

خورشید آسمان و زمین نور مشرقین

پرورده کنار رسول خدا حسین

2. عرفی شیرازی

عرفی شیرازی صفوی عہد کے بڑے شاعر تھے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ صفوی عہد کے سب سے بڑے شاعر عرفی تھے۔ قصیدہ گوئی میں ان کو اعلی مرتبہ حاصل ہے۔ صفوی عہد میں دربار کی بندشیں ان کے ذوق شعری کے لیے رکاوٹیں بن رہی تھیں، اس لیے وہ ایران چھوڑ کر ہندوستان آگئے اور اکبر کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ اکبر بادشاہ کے دربار میں ان کو بڑا مقام حاصل ہوا، لیکن ان کو مہلت عمر کم ملی تھی صرف 36 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ عرفی کے چند اشعار یہ ہیں:

جهان بگشتم و دردا که هیچ شهر و دیار

نیافتم که فروشند بخت در بازار

عرفی تو می اندیش ز غوغائے رقیباں

آوازِ سگاں کم نه کند رزقِ گدا را

3. صائب تبریزی

صائب تبریزی کے والد تبریز کے رہنے والے تھے۔ تلاش معاش میں اصفہان آئے اور یہیں ملازمت اختیار کی۔ صائب کی ولادت اصفہان میں ہوئی۔ صائب نے اصفہان میں تعلیم حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے حج کیا اور اس کے بعد قسمت آزمانے کے لیے ہندوستان کا رخ کیا۔ پہلے کچھ دن کابل میں رہے، پھر ہندوستان آ کر شاہ جہاں کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں ان کو بڑی قدر و منزلت ملی۔ دربار میں بڑا مقام ملا، لیکن صائب کو وطن کی یاد ہندوستان میں چین سے نہیں رہنے دیتی تھی۔ انھوں نے کچھ ایسے اشعار کہے ہیں

جن میں اپنے وطن خاص طور سے اصفہان کی جدائی کا دکھ بیان کیا ہے۔ اس درمیان میں ان کی شاعری کی شہرت اصفہان تک پہنچ چکی تھی ۔ چھے سال ہندوستان میں رہنے کے بعد ان کے والد نے ان کو اصفہان واپس بلالیا چونکہ وہ اصفہان میں پہلے سے مشہور تھے اس لیے شاہ عباس دوم نے ان کو اپنے دربار میں بلایا اور دربار کا ملک الشعرا مقرر کر دیا۔

صائب نے بقیہ عمر اصفہان میں گزاری۔ وہ اعلی درجے کے شاعر تھے۔ انھوں نے غزل کے علاوہ قصائد میں بھی بڑا نام پیدا کیا۔ نازک خیالی، معنی آفرینی، منظر کشی، ان کے کلام کی نمایاں خوبیاں ہیں ان کے کلام میں حکمت وفلسفہ کی تابناکی بھی نظر آتی ہے۔ ان کے چند منتخب اشعار یہ ہیں:

مخور صائب فریب فضل از عمامه زاہد

که در گنبد به بی مغزی صدا بسیار می پیچد

باد بهار مرهم دل های خسته است

گل مومیایی پر و بال شکسته است

ما نقش دلپذیر ورق های ساده ایم

چون داغ لاله از جگر درد زاده ایم

16.3.2 صفوی عہد کے دیگر شعراء

مذکورہ بالا شاعروں کے علاوہ صفوی دربار میں اور بھی کئی اہم شاعر موجود تھے۔ جیسے ایک شاعر بابا فغانی تھے جو صفوی عہد کے عظیم شاعر تھے، انھوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی مدح میں قصیدہ لکھا جو بہت مشہور ہے، اسی طرح علامہ عبد الرحمن جامی کے پوتے ہاتفی خرجردی بھی اپنے دور کے بڑے شاعر تھے انھوں نے خمسہ نظامی کے جواب میں خمسہ لکھا تھا اور شاہ نامہ بھی لکھا تھا۔ اسی طرح ہلالی چغتائی بھی اس دور کے ایک معروف شاعر تھے، وحشی بافقی کا شمار بھی صفوی عہد کے نامور شعراء میں ہوتا ہے، فرہاد و شیری کے نام سے انھوں نے ایک مثنوی لکھی تھی جو ان کی وفات کی وجہ سے ادھوری رہ گئی۔ اس دور کے ایک شاعر زلالی خوانساری بھی تھے جن کو شاہ عباس کے عہد میں ملک الشعرا کا خطاب ملا تھا۔ اسی طرح امیدی تہرانی بھی اس دور کے ایک بڑے شاعر تھے۔

شعر و شاعری کے اعتبار سے صفوی عہد ایسا زیادہ زرخیز تو نہیں رہا جیسا اس سے پہلے تھا جب حافظ شیرازی، عمر خیام، شیخ سعدی اور فردوسی جیسے پائیدار شہرت کے حامل شعراء پیدا ہوتے تھے، اب وہاں زیادہ تر مرثیہ گو اور منقبت کہنے والے شاعر پیدا ہونے لگے وہ بلند خیالی جو شاعری کا خاصہ مانی جاتی ہے وہ صفوی عہد میں کم ہو گئی۔

16.4 خطاطی

خطاطی اسلامی فنون میں بہت اہم فن ہے۔ چونکہ اسلام میں مصوری یعنی جانداروں کی تصویر بنانا جائز نہیں ہے، اس لیے لوگوں کی

مصوری کی صلاحیت کا اظہار بھی زیادہ تر خطاطی میں ہوا۔ خطاطی بہت بڑا فن ہے۔ خاص طور پر عربی و فارسی خطاطی پوری دنیا میں بے مثال ہے۔ اس فن کے کئی پہلو ہیں۔ فن کے اعتبار سے بھی اور تاریخی ارتقاء کے اعتبار سے بھی۔ تاریخی طور پر بھی صفوی عہد میں اس فن میں بہت ترقی ہوئی۔ بہت سے خطاطوں کو صفوی بادشاہوں نے اپنے دربار میں رکھا۔ شاہ اسماعیل اور شاہ طہماسپ کے عہد میں محمود نیشاپوری صفوی دربار کے خطاط تھے، انھوں نے خمسہ نظامی کی کتابت کی تھی جو اس وقت برٹش میوزیم کے اندر محفوظ ہے۔

صفوی عہد کے ایک مشہور خطاط میر عماد حسنی قزوینی تھے۔ میر عماد خط نستعلیق کے موجد تھے۔ یہی خط بعد میں ہندوستان اور مشرقی اسلامی دنیا کا سب سے مقبول خط بن گیا۔ خطاطی کے فن میں میر عماد کو اساطیری حیثیت حاصل ہے۔ خطاطی میں ان کی فنی مہارت آج بھی مسلم ہے، بلکہ خود ان کے دور میں بھی وہ اتنے مقبول تھے کہ ان کے فن کتابت پر شعراء نے اشعار کہے اور ان کو خراج عقیدت پیش کیا۔ میر عماد کے لکھے ہوئے قطعات اس فن کے اعلیٰ نمونے مانے جاتے ہیں۔ میر عماد کے لکھے ہوئے کئی نمونے اور وصلیاں دستیاب ہیں۔ انھوں نے شاہ عباس کے دربار میں ایک درخواست دی تھی، وہ درخواست بھی محفوظ ہے، ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا سورہ فاتحہ کا ایک نسخہ بھی محفوظ ہے، خطاطی میں میر عماد کا یہ مقام ہے کہ لوگ آج بھی اپنے خط کے، خاص طور سے نستعلیق کے لیے نمونہ میر عماد کی تحریر ہی کو سمجھتے ہیں۔

صفوی عہد کے ایک بڑے خطاط سلطان محمد نور تھے انھوں نے بھی خمسہ نظامی کا ایک نسخہ لکھا تھا۔ ان کے علاوہ میر علی ہروی بھی اس دور کے ایک معروف خطاط تھے۔ اسی طرح مرزا اسد اللہ شیر ازی بھی صفوی عہد کے ایک عظیم خطاط تھے جو بعد میں قاچاری عہد تک زندہ رہے۔

آقا عبد الرشید دیلمی بھی صفوی عہد کے ہی ایک خطاط تھے، جو ہجرت کر کے ہندوستان آ گئے اور پھر یہاں خطاطی میں ان کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔

صفوی عہد میں خطاطی کے اندر کئی اہم اضافے ہوئے جیسے خط نستعلیق، جو بعد میں فارسی اور اردو کے لیے سب سے زیادہ استعمال ہونے والا خط بن گیا اس کی ایجاد اسی دور میں ہوئی۔ خط نستعلیق کے علاوہ خود کتابت کو مزین کرنے اور اس کو دیدہ زیب بنانے کے لیے بھی اس دور میں کئی اہم اضافے ہوئے۔ جیسے کتابت شدہ اشعار کو خاص طور سے قطعات کو اور وصلیوں کو مزین کرنے اور کتابت شدہ صفحات کے گرد حاشیے بنانے میں اس دور میں بڑا اضافہ ہوا۔ وصلیوں میں نہایت خوبصورت بیل بوٹے بنائے گئے، سنہری روشنائی اور سونے کے پانی سے اشعار بھی لکھے گئے اور ان پر گل بوٹے بھی بنائے گئے۔ ان کے علاوہ روایتی انداز کی تزئین کاری بھی ان کے اندر ہوتی رہی ان کے بہت سے نمونے دنیا کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

16.5 مصوری

اسلامی روایات میں جب مصوری کا نام آتا ہے تو ایران کا تصور ضرور ذہن میں ابھرتا ہے اس لیے کہ اسلامی دور کی مصوری کے فروغ میں سب سے زیادہ کام ہندوستان اور ایران میں ہی ہوا۔ ایران کے مشہور مصور بہزاد تو فن مصوری کے لیے اساطیری کردار کا درجہ

رکھتے ہیں۔ اگر کسی کی مصوری کو تشبیہ دینی ہو تو بہزاد کے ساتھ ہی تشبیہ دی جاتی ہے۔ بہزاد کا تعلق اصلاً تیموری حکمران سلطان حسین مرزا سے تھا۔ تیموری سلطنت کے زوال کے بعد شاہ اسماعیل صفوی نے بہزاد کو تبریز بلالیا اور اپنے دربار میں ملازم رکھ لیا۔

ایران میں مصوری کو بہت فروغ ہوا، انسانوں اور جانداروں کی تصویریں بھی اس دور میں بنائی گئیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو صفوی عہد کی مصوری ایران کی قدیم مصوری کی روایت کا تسلسل ہے، خاص طور سے تیموری عہد کی مصوری کا تسلسل ہے صفوی عہد میں لال رنگ کی مخصوص ساخت کی ٹوپی پہنی جاتی تھی، اس لیے صفوی عہد کی تصاویر میں ان کا بھی اثر ہے جس کی وجہ سے صفوی عہد کی مصوری اور دوسرے ادوار کی مصوری کو بآسانی ممتاز کیا جاسکتا ہے۔

صفوی عہد کی مصوری میں خاص بات یہ بھی ہوتی تھی کہ اس میں رنگ آمیزی اور تصنع حد اعتدال سے بڑھ گیا تھا۔ شاہ اسماعیل کے دور کے نمونوں میں جیسے شاہنامہ کا نسخہ اور خمسہ نظامی کا نسخہ جو برطانیہ اور امریکہ کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں ان میں اس کے نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔

بہزاد کی وفات کے بعد صفوی دربار میں نظام الدین سلطان محمد اور جلال الدین میرک جیسے عظیم مصور وابستہ ہوئے۔ انھوں نے فن مصوری کو مزید ترقی دی، خاص طور پر کتابوں کی آرائش اور زیبائش، صفحات کے چاروں طرف گل بوٹے لگانا اور حسب موقع کتاب کے اندر تصاویر بنانا وغیرہ کے اعتبار سے اس دور میں کافی ترقی ہوئی۔

تبریز کے بعد صفوی حکومت کا دارالحکومت قزوین بنا۔ قزوین کے اندر فن مصوری میں ترقی کے ساتھ کچھ انفرادیت بھی پیدا ہوئی۔ قزوین میں جو تصاویر بنائی گئیں ان میں خطوط کی موٹائی کم ہوتی تھی جس کی وجہ سے تصویروں کی جاذبیت میں اضافہ ہو گیا اور انسانوں کی تصاویر میں گردن کی لمبائی کچھ زیادہ کر دی گئی جس سے تصاویر کے حسن میں اضافہ ہوا اور چہرے کے خطوط میں گولائی کا اضافہ کیا۔ عام طور پر چہرے گول بنائے گئے۔ قزوین کا یہ مخصوص اسلوب سلطان محمد کے بیٹے نے شروع کیا اسی لیے اس کو محمدی اسلوب کہا جانے لگا۔ اس اسلوب کا نمایاں اظہار علامہ جامی کی کتاب ہفت اورنگ اور نظامی کے خمسہ کی کتابت میں نمایاں نظر آتا ہے۔

صفوی حکمراں اگرچہ مسلک کے اعتبار سے شیعہ تھے، لیکن وہ صوفی روایت سے حکومت میں آئے تھے اور انھوں نے اپنی صوفی شناخت کو ہمیشہ باقی رکھا۔ چوں کہ اسلام میں جانداروں کی تصویر بنانا منع ہے اس لیے بعض صفوی حکمراں جانداروں کی تصویر کے بارے میں دوسری رائے رکھتے تھے اور مصوری کے بارے میں مذہبی مباحث عام طور پر دربار میں بھی آتے رہتے تھے اور انہی مباحث کے زیر اثر بعض اوقات صفوی حکمرانوں نے جانداروں کی تصویر بنانے کی مخالفت بھی کی۔ جس کا اثر پوری مصوری پر پڑا اس کے باوجود مصوری کو اس دور میں بڑا فروغ حاصل ہوا۔

درباری سرپرستی کے علاوہ قزوین میں ہی یہ فن شاہی دربار کی چار دیواری سے نکل کر عوام تک پہنچ گیا۔ لوگ پیشہ ور مصوروں سے اپنی تصویریں بنوانے لگے، اسی کے ساتھ بہت سے مصوروں نے تصاویر کے البم یا مرقع بھی تیار کیے جو اس وقت بازار کی ضرورت بن گئے تھے اور ان کی وجہ سے مصوری کا چلن عوام تک پھیل گیا۔

صفوی عہد کی مصوری کا نقطہ عروج اصفہانی اسلوب ہے۔ یہ اسلوب شاہ عباس اعظم کے زمانے میں رائج ہوا۔ اس اسلوب کے بانی آقا رضا مصور ہروی مانے جاتے ہیں۔ یہ شاہ عباس کے دربار سے وابستہ تھے۔ ان کے اسلوب میں نسبتاً سادگی کو اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے اندر رنگ عام طور پر ہلکے استعمال کیے جاتے ہیں اور انسانوں کی تصویر میں جسمانی ساخت کو نمایاں کرنے کے بجائے لباس اور جسمانیت میں تناسب پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

آقا رضا کے دور میں ایک اور مصور رضائے عباسی بھی ہوئے ہیں۔ وہ بھی اپنے دور کے بہت مشہور مصور تھے۔ انھوں نے آقا رضا کے اسلوب کو مزید ترقی دی۔ انھوں نے رنگوں کے امتزاج میں بھی تبدیلی پیدا کی اور عام طور پر ہلکے رنگ استعمال کیے۔ ان کی متعدد تصاویر دنیا کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

شاہ عباس اعظم کے زمانے میں افضل الحسینی قاسم علی اور محمد یوسف نام کے باکمال مصور بھی اس دربار سے وابستہ رہے۔ انھوں نے بھی اصفہانی اسلوب کو مزید ترقی دی اور اس میں اضافے کیے۔

صفوی عہد کی مصوری کے حوالے سے آخری بات یہ ہے کہ اس عہد میں خاص طور پر عباس اعظم کے دور میں اور بعد کے ادوار میں یورپی مصوری کا اثر بھی اصفہانی اسلوب پر پڑا۔ مشرق کی مصوری کی روایت میں یوروپ کا اثر اسی دور میں شروع ہوا۔ اس کی دو وجہ ہوئی ایک تو یہ کہ شاہ عباس نے یورپ خاص طور پر برطانیہ کی حکومت کے ساتھ معاہدہ کر لیا تھا اور یورپ کے لوگوں کا وہاں آنا جانا بڑھ گیا تھا، لیکن اس کی جو اصل بنیادی وجہ ہے وہ یہ ہے کہ شاہ عباس اعظم کے دربار کے ایک مصور محمد زماں اٹلی گئے تھے اور انھوں نے اٹلی میں جا کر فن مصوری کی تکمیل کی اس کے بعد وہ ایران آئے اور شاہی دربار سے منسلک ہو گئے۔ ان کے کاموں میں ایرانی مصوری اور یورپ میں مصوری کا امتزاج نظر آتا ہے۔

16.6 موسیقی

حکومت اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہر حکومت موسیقی کی سرپرستی کرتی رہی ہے۔ ایران کے اندر، دیگر علاقوں کی طرح، موسیقی کی قدیم روایت تھی۔ اسلام سے قبل بھی وہاں موسیقی تھی اور اسلام کی آمد کے بعد کچھ اصلاح اور تبدیلیوں کے ساتھ موسیقی کی روایت کو جاری رکھا گیا اور مختلف حکومتوں نے ان کو پروان چڑھایا۔

تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ صفوی عہد سے قبل ایرانی موسیقی کا ارتقائی دور تھا اور صفوی عہد میں ایرانی موسیقی کا احیاء ایک طرح سے مکمل ہو گیا۔ اس دور میں متعدد آلات موسیقی جیسے عود، کمانچہ وغیرہ کا استعمال بکثرت ہوتا تھا، ان کے علاوہ بانسری ،نقارہ، قرنا، دہل اور ناقوس بھی اس دور میں استعمال ہوتے تھے۔ ایران کے روایتی آلات موسیقی کے علاوہ دو ہندوستانی موسیقی کے آلات بھی وہاں استعمال ہوتے تھے یعنی سازندہ اور منڈل جس کو ایران میں دنبال کہا جاتا تھا۔

موسیقی سے وابستہ ایک فن رقص بھی ہے، صفوی عہد میں موسیقی کے ساتھ کبھی کبھی رقص بھی ہوتا تھا اور عام طور لڑکے رقص

کیا کرتے تھے کبھی کبھی ان لڑکوں کو لڑکیوں کا لباس پہنا کر رقص کرایا جاتا تھا۔اس کے علاوہ صوفیہ کرام کے یہاں محفل سماع میں وجد کی کیفیت بھی ایک عام بات رہی ہے، لوگ اس کو بھی رقص کی ایک قسم کہہ دیتے ہیں حالاں کہ وہ ایک مدہوشی کے عالم میں سرزد ہونے والی حرکات ہیں تاہم ان میں بھی ایک طرح کا تناسب پایا جاتا ہے جو اس کو رقص کے قریب کر دیتا ہے۔

صفوی عہد میں موسیقی پر بہت سی کتابیں بھی لکھی گئی جیسے محمد بن جلال رضوی اور عبدالجلیل بن عبدالرحمن نے موسیقی پر کئی کتابیں لکھیں۔اس دور میں لکھی گئیں موسیقی کی چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

تعلیم النغمات، رسالہ فی علوم موسیقی، رسالہ در علم موسیقی، درالنقی فی فن موسیقی۔وغیرہ

16.7 فن تعمیر

ایران میں فن تعمیر تو پہلے سے ہی نمایاں رہا ہے۔ اسلام سے پہلے کے فن تعمیر کے بھی نمونے یہاں مل جاتے ہیں اور اسلام کے آنے کے بعد ایران کے مختلف بادشاہوں نے مساجد، مقابر، مدارس، محلات اور قلعے تعمیر کیے تھے۔ ان میں سے کچھ ابھی تک موجود ہیں، زیادہ تر ختم ہو گئے۔صفوی عہد میں بھی فن تعمیر نے بہت ترقی کی۔صفوی عہد کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس دور کی تعمیرات کا ایک بڑا حصہ ابھی تک محفوظ ہے، جس کی مدد سے اس دور کے تعمیراتی ذوق اور فن تعمیر کو بہتر طریقے پر سمجھا جا سکتا ہے۔ذیل میں فن تعمیر کے اعتبار سے مختلف بادشاہوں کی باقیات کا تعارف کرایا گیا ہے۔

1. شاہ محمد اسماعیل

شاہ محمد اسماعیل صفوی نے تبریز کو اپنا دارالحکومت بنایا تھا اور اس کو ہر طرح سے بہت ترقی دی تھی اس میں قلعہ، محل، مساجد، اور مدارس تعمیر کروائے، لیکن بعد میں ان کو تبریز چھوڑنا پڑا اور ایران کا اگلا دارالحکومت قزوین بنا، اس لیے تبریز کی زیادہ عمارتیں اور قدیم تعمیرات ختم ہو گئیں۔اس وقت شاہ اسماعیل کے عہد کی دو عمارتیں زیادہ میں مشہور ہیں۔

ساوہ کی جامع مسجد

ساوہ کی جامع مسجد اس دور کی ایک بہترین یادگار ہے اس کو یزد کے معمار سعد بن محمد نے تعمیر کیا تھا۔اس عمارت کی سب سے نمایاں خوبی اس کے اندر بنے ہوئے نقش و نگار اور ان نقش و نگار کے اندر رنگوں کا امتزاج ہے، جیسے گلابی رنگ کے مقابلے میں سفید رنگ کے حاشیے اور اس میں کالے رنگ کی بارڈر، سفید رنگ کے مقابلے میں ہلکا نیلا اور کہیں بالکل سیاہ۔ان رنگوں کے منفرد امتزاج کے علاوہ اس عمارت کا گنبد خوبصورت ہے اور گنبد اور دیواروں کے درمیان جو تناسب ہے وہ بھی بے مثال ہے۔

ہارون الراویہ

یہ عمارت اصفہان میں ہے اس کو حسین نام کے ایک معمار نے بنایا تھا اس معمار کا نام اس کے کتبہ میں لکھا ہوا ہے۔ اصل عمارت کا بیشتر حصہ منہدم ہو گیا ہے۔جو حصہ بچا ہے اس سے اس عمارت کی خوبصورتی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ عمارت چینی کی پچی کاری کے اعتبار سے بے

مثال ہے اس میں نقش و نگار بیل بوٹے اور پھول پتیاں نہایت چابک دستی سے بنائی گئی ہیں۔

2. شاہ طہماسپ

شاہ طہماسپ کا زمانہ اگرچہ طویل عرصے کو محیط ہے، انھوں نے تقریباً 52 سال حکومت کی، لیکن ان کے دور میں حالات زیادہ تر خراب رہے اور ایران اندرونی خطرات اور بیرونی حملوں سے جوجھتا رہا۔ اس لیے اس دور میں تعمیراتی کام زیادہ نہیں ہوا۔ البتہ انھوں نے اپنے دارالحکومت قزوین کے اندر کچھ عمارتیں تعمیر کروائیں تھیں۔ جیسے قزوین کے اندر ان کا محل اپنے دور کی بے مثال عمارت تھی، اس عمارت پر چینی سے پچی کاری کی گئی تھی، اس عمارت کا بیشتر حصہ تو منہدم ہو گیا ہے، لیکن جو بچا ہے اس سے اس کی خوبصورتی اور شان و شوکت کا اندازہ ہوتا ہے۔

شاہ طہماسپ نے اور جگہ تو تعمیرات میں زیادہ دل چسپی نہیں لی، لیکن اپنے آبائی مرکز یعنی اردبیل کے اندر بہت تعمیرات کروائیں۔ جیسے انھوں نے اردبیل میں اپنی پشتینی خانقاہ کو دوبارہ تعمیر کروایا۔ اس کے علاوہ وہاں محلات اور مساجد بھی تعمیر کرائیں۔ شاہ طہماسپ نے یہاں کی عمارتوں کو بنانے میں بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ یہ عمارتیں اتنی خوبصورت انداز میں بنائی گئیں کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھی۔

3. شاہ عباس اعظم

شاہ عباس صفوی عہد کے عظیم ترین حکمرانوں میں سے ہیں۔ انھوں نے اپنی جنگ قابلیت میں اپنے جد اعلی شاہ اسماعیل کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ شاہ عباس نے ایران میں بہت سے غیر معمولی ترقیاتی کام انجام دیے۔ انھوں نے تعمیرات میں بھی غیر معمولی اضافے کیے۔ ان کے دور میں ایران کا اسلامی فن تعمیر اپنے بام عروج کو پہنچا۔ خاص طور پر تعمیرات میں تزئین کاری بے مثال انداز میں کی گئی۔ مکانات کے نقشے بھی بڑی خوبصورتی سے بنائے گئے اور ان پر بیل بوٹے اور چینی کی پچی کاری سے ان کے حسن کو دوبالا کیا گیا۔ خوب صورت گنبد اور بلند و بالا منقش میناروں سے مساجد کو سجایا گیا۔

شاہ عباس اعظم کا دور فتوحات کا دور ہے۔ اس دور میں صفوی عہد کی طاقت اپنے بام عروج پر پہنچ گئی تھی۔ خوشحالی اور فراوانی کا دور تھا۔ اس لیے اس دور میں تعمیراتی کام بھی بہت کرائے گئے۔ اصفہان کو تو شاہ عباس نے نہایت خوبصورت شہر میں تبدیل کر دیا تھا۔ اصفہان میں انھوں نے خوبصورت محلات تعمیر کروائے، خوبصورت مساجد بنائیں، پل بنوائے، سرائے بنوائیں اور باغوں اور پارکوں سے پورے شہر کو مزین کر دیا۔ شاہ عباس کے زمانے میں اصفہان کے اندر 148 مساجد 48 مدرسے 182 سرائے اور 273 حمام تھے۔ اس دور میں اصفہان دنیا کے انتہائی خوبصورت شہروں میں سے ایک بن گیا تھا۔

شاہ عباس کے دو محل یعنی چہل ستون اور قصر علی قپو ہیں جو اپنی خوبصورتی اور مضبوطی میں بے مثال ہیں۔ یہ دونوں محل ابھی تک موجود ہیں۔ اسی طرح مسجد شاہ اور مسجد علی وردی خاں اس دور کی نہایت خوبصورت مساجد ہیں، جن کی دیواریں، گنبد، دیواروں اور گنبد پر بنے ہوئے گل بوٹے اور پچی کاری بے مثال ہے۔ اصفہان کی نہر زندہ رود پر بنایا ہوا پل بھی اس دور کے فن تعمیر کا ایک اہم نمونہ ہے۔ امام علی

رضا کی درگاہ بھی اس دور کی اہم ترین عمارتوں میں سے ہے، جو اپنی خوبصورتی، تقدس، بلند و بالا گنبد، خوبصورت مینار، صحن کے سامنے چوک اور عالی شان دروازوں کے اعتبار سے بے مثال ہے۔

شاہ عباس کے دور میں اصفہان کے اندر کارواں سرائے بھی بڑی تعداد میں تعمیر کی گئیں تھی جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اصفہان کے روابط دنیا کے دیگر ممالک سے کتنے وسیع تھے اور کتنے قافلے وہاں آیا کرتے تھے۔ اسی طرح اس دور میں بہت سے مقبرے بھی تعمیر ہوئے جیسے خواجہ ربیع کا مقبرہ، نیشاپور کا مقبرہ قدم گاہ۔ اسی طرح مقبرہ ابو شجاع محمد وغیرہ۔ یہ تمام تعمیرات فن تعمیر کے اعلی نمونے ہیں جو ابھی تک موجود ہیں۔

16.7.1 دیگر حکمران

شاہ عباس کے بعد صفوی عہد کا زوال شروع ہو گیا۔ تاہم یہ زوال سیاسی تھا۔ اندرونی طور پر یہ ریاست اس وقت بھی بہت خوشحال تھی۔ فن تعمیر کے اعتبار سے بھی اس میں کوئی زوال نہیں ہوا تھا۔ بعد کے دور کی کئی اہم عمارتوں میں اصفہان کا 'مدرسہ مادر شاہ' ہے، جس میں نہایت خوبصورت مسجد، مدرسہ اور کارواں سرائے بھی تعمیر ہوئی۔ اسی طرح شیراز میں کریم خان زندانی نے بھی خوبصورت عمارتیں بنوائی جو اپنے عہد کی شاہکار تعمیرات ہیں۔

فن تعمیر کے لحاظ سے دیکھا جائے تو صفوی عہد ایرانی فن تعمیر کا نقطہ عروج ہے۔ اس دور میں نہایت خوبصورت، عالی شان، پائیدار، مستحکم اور فن تعمیر کے اعتبار سے بے مثال عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ جن کے اندر مختلف نقش و نگار، رنگوں کا امتزاج اور خطوط کے تناسبات کی وجہ سے استحکام اور خوبصورتی ملی۔

16.8 خلاصہ

صفوی عہد میں فنون لطیفہ اور فن تعمیر میں بہت اضافہ ہوا۔ شاعری کے اعتبار سے دیکھا جائے تو کئی بڑے شاعر پیدا ہوئے، جنہوں نے شاعری کی مختلف اصناف میں کلام کہا، قصیدہ گوئی بھی کی، لیکن جو سب سے زیادہ اضافہ ہوا وہ مرثیہ گوئی اور منقبت کے اندر رہوا۔ اس دور کے مشہور شاعروں میں عرفی شیرازی، صائب تبریزی اور محتشم کاشانی ہیں۔ اس کے علاوہ فن خطاطی میں بھی اس زمانے میں بہت اضافہ ہوا شاہ اسماعیل اور شاہ طہماسپ کے زمانے میں محمود نیشاپوری بڑے باکمال خطاط تھے، ان کی لکھی ہوئی کتابیں مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ شاہ عباس کے زمانے میں میر عماد حسنی قزوینی بڑے باکمال خطاط تھے انھوں نے ایک مستقل خط ایجاد کیا جو خط نستعلیق کہلاتا ہے اور اس زمانے میں خطوط کے تحریروں کو مزین کرنے اور دیدہ زیب بنانے میں بھی کئی اضافے ہوئے۔ فن موسیقی میں بھی اس دور میں کافی اضافہ ہوا اور اس فن میں کئی کتابیں لکھی گئیں۔ اسی طرح فن مصوری میں بھی بڑے بڑے اضافے ہوئے۔ بہزاد جو بہت زبردست مصور مانے جاتے ہیں وہ شاہ اسماعیل کے دربار سے وابستہ رہے اور اس کے بعد پھر لگاتار مصوری میں اضافہ ہوتا رہا، قزوین میں تبریز میں اور اصفہان میں بلکہ اصفہان کے اندر تو مصوری کا ایک مستقل اسکول ایجاد ہوا۔ فن تعمیر میں بھی اس دور میں بہت اضافے ہوئے۔ شاہ اسماعیل اور شاہ طہماسپ

کی بنائی ہوئی عمارتیں ابھی تک موجود ہیں، لیکن سب سے زیادہ اضافہ فن تعمیر میں شاہ عباس اعظم کے زمانے میں ہوا اور انھوں نے اصفہان کو فن تعمیر کے اعتبار سے نہایت خوبصورت اور بے مثال شہر بنا دیا۔

16.9 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- صفوی عہد میں فنون لطیفہ میں نمایاں ترقی ہوئی۔
- خطاطی، موسیقی، مصوری جیسے فنون میں بہت ترقی ہوئی۔
- فن تعمیر میں بھی اس دور میں بہت ترقی ہوئی۔
- اس دور میں کئی نئے شہر تعمیر ہوئے اور کئی شہروں میں غیر معمولی ترقی ہوئی۔
- فن تعمیر کے اعتبار سے اصفہان اس دور کا شاہکار رہے۔

16.10 نمونہ امتحانی سوالات

16.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. شاہ اسماعیل صفوی کی مادری زبان کیا تھی؟

(a). عربی (b). فارسی (c). پشتو (d). آذری

2. شاہ اسماعیل کے دربار میں سب سے مشہور مصور کون تھے؟

(a). بہزاد (b). بقراط (c). سلطان محمد (d). احمد بن صالح

3. صائب تبریزی کو کس بادشاہ نے ملک الشعرا کا خطاب دیا؟

(a). شاہ منصور (b). شاہ عباس اول (c). شاہ عباس دوم (d). طہماسپ

4. شاہ اسماعیل اور شاہ طہماسپ کے دربار میں خطاط کون تھے؟

(a). محمود نیشاپوری (b). حاکم نیشاپوری (c). آقا عبد الرشید (d). سلطان محمد

5. میر عماد کو کس خط کا موجد مانا جاتا ہے؟

(a). خط نسخ (b). خط نستعلیق (c). خط تعلیق (d). خط کوفی

6. ایران میں کون سا ہندستانی آلہ موسیقی استعمال ہوتا تھا؟

(a). قرنا (b). نقارہ (c). دنبال (d). ناقوس

7. مصوری کے اصفہانی اسلوب کے بانی کون تھے؟

(a). آقا رضا (b). رضائے عباسی (c). محمود نیشاپوری (d). صائب تبریزی

8. سعد بن محمد کس دور کے معمار تھے؟

(a). شاہ عباس دوم (b). شاہ طہماسپ دوم (c). شاہ اسماعیل اول (d). شاہ اسماعیل دوم

9. زندہ رود پر کس بادشاہ نے پل بنوایا؟

(a). شاہ عباس اول (b). شاہ عباس دوم (c). شاہ طہماسپ (d). محمد خدابندہ

10. شاہ عباس کے دور میں اصفہان میں کتنے مدرسے تھے۔

17.(a) 73.(b) 48.(c) 148.(d)

16.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. صائب تبریزی کی شاعری پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. فن خطاطی میں میر عماد کی اہمیت بیان کیجیے۔
3. صفوی عہد میں موسیقی پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. فن تعمیر کے اعتبار سے اصفہان کی اہمیت بیان کیجیے۔

16.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. صفوی عہد میں فن شاعری کے ارتقاء پر کلام کیجیے۔
2. صفوی عہد میں مصوری کے ارتقا کو بیان کیجیے۔
3. صفوی عہد میں فن تعمیر میں کیا اضافہ ہوا تفصیل سے لکھیے۔

16.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. ڈاکٹر رضازادہ شفق: تاریخ ادبیات ایران اردو ترجمہ سید مبارز الدین رفعت
2. ثروت صولت: ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ
3. دائرۃ المعارف الاسلامیہ
4. محمد امین سلطان القرائی: معرفی نسخہ خطی کلیات شاہ اسماعیل صفوی
5. The New Cambridge History of Islam vol.3

ایم۔اے، اسلامک اسٹڈیز

نواں پرچہ (عہد عثمانی اور چھوٹی خاندانی حکومتیں)

جملہ نمبرات:70 **وقت:3 گھنٹے**

ہدایات:

1. حصہ اول میں 10 لازمی سوال ہیں جو کہ معروضی سوالات / خالی جگہ کو پر کرنا / مختصر جوابات والے سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے ایک نمبر مختص ہے۔ 10x1=10

i. کس وزیر کی اصلاحات عثمانی حکومت کے استحکام میں نہایت معاون اور مفید ثابت ہوئیں؟

(a). علاء الدین خان (b). احمد توفیق پاشا (c). حاجی پاشا (d). نظام الدین احمد پاشا

ii. قسطنطنیہ کو کس نے فتح کیا؟

(a). محمد ثانی (b). بایزید یلدرم (c). اور خان (d). عثمان خان

iii. یورپ والے سلیمان اعظم کو کس لقب سے یاد کرتے تھے؟

(a). ذی شان (b). محمد فاتح (c). اور خان (d). سب غلط

iv. ادارہ حکومت کا سب سے بڑا عہدے دار کون تھا۔

(a). سلطان (b). وزیر (c). فوج (d). سب غلط

v. عثمانی سلطنت میں چھوٹی جاگیروں کو کیا کہا جاتا تھا؟

(a). تیمار (b). زعامت (c). مشارکت (d). سب صحیح

vi. تاریخ آل عثمان کے مصنف کا نام بتایئے۔

(a). شمس الدین احمد بن سلیمان پاشا (b). ملا خسرو (c). علامہ فناری (d). ابو سعود آفندی

vii. شہزادے مسجد کلیہ کا معمار کون تھا۔

(a). معمار کمال الدین (b). معمار سنان (c). معمار حسن (d). معمار وِداد ٹیک

viii. سلطان عبد المجید نے دوسرے اہم دستور کا اعلان کب کیا گیا؟

(a).1856ء (b).1839ء (c).1924ء (d). سب غلط

ix. صفوی حکومت کا آخری دارالحکومت کیا تھا؟

(a). قزوین (b). اصفہان (c). تبریز (d). قندھار

x. سعد بن محمد کس دور کے معمار تھے؟

(a). شاہ عباس دوم (b). شاہ طہماسپ دوم (c). شاہ اسماعیل اول (d). شاہ اسماعیل دوم

(ب) حصہ دوم آٹھ سوالات پر مشتمل ہے اور پانچ سوالات کے جوابات دینے ہیں ہر سوال کا جواب تقریباً دو سو لفظوں پر مشتمل ہو گا۔ ہر سوال کے لیے 6 نمبر مختص ہیں۔ 6x1=6

2. بانی سلطنت امیر عثمان خاں کا جائزہ لیجیے۔
3. قسطنطنیہ کی تاریخ پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. جنگ چالدران پر گفتگو کیجیے۔
5. سلطان کی مجلس دیوان سے علیحدگی عثمانی سلطنت کے لیے کتنی مضر ثابت ہوئی۔ بیان کیجیے۔
6. عثمانی فن تعمیر میں بُرصہ طرز کی مسجدوں کی فنی خصوصیات کا جائزہ لیجیے۔
7. صلح آماسیہ کس کے درمیان ہوئی اور اس کا کیا فائدہ ہوا۔
8. غزنوی دور میں فارسی ادب کی ترقی وارتقاء میں شاہنامہ فردوسی کا کردار بیان کیجیے۔
9. صفوی عہد میں عورتوں کی حیثیت پر نوٹ لکھیے۔

(ج) حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں۔ ان میں سے طالب علم کو کوئی تین سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً 500 لفظوں پر مشتمل ہو گا۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبر مختص ہیں۔

10. عثمانی ترکوں کے تاریخی پس منظر کو بیان کیجیے۔
11. عثمانی سلطان سلیمان اعظم کے ویانا کا محاصرہ کا جائزہ لیجیے۔
12. عثمانی نظام حکومت میں فوج کی اہمیت کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
13. نظام الملک حسن طوسی کی شخصیت اور اس کے کارناموں پر روشنی ڈالیے۔
14. صفوی عہد میں فن تعمیر میں کیا اضافہ ہوا تفصیل سے لکھیے۔